ڈر ڈائجسٹ کا مقبول ترین سلسلہ اضافہ کے ساتھ

آتشی مخلوق



ایم ایس قادری

ڈر ڈائجسٹ کا مقبول ترین سلسلہ اضافہ کیساتھ

آتشی مخلوق

مصنف

ایم ایس قادری



کلیکشن بکس شاہ فیصل کالونی کراچی

ناول ملکیت و بشکریہ

محمد سعید چوہدری

ناول

سکین

بائے

محمد سجاد بھٹی

0
3
0
4
5
5
0
3
0
8
6

خصوصی تعاون: جاسوسی نشست ایڈمن

محفل احباب:

عزیز ترین قارئین ولائبریرین حضرات.... السلام علیکم۔

تقریباً سولہ برس بعد آپ سے براہ راست مخاطب ہونے کا شرف حاصل ہوا ہے۔
میرے سولہ برس کا ماضی، کیسے اور کن حالات میں گزرا، یہ بذات خود ایک سسپنس فل کہانی ہے۔
جسے اگر میں نے یا آپ نے کریدنے کی کوشش کی تو شاید میں کرب واذیت کے بھور سے نہ نکل پاؤں
اس لئے اس مصرعہ پر بات ختم کئے دیتا ہوں۔

یادِ ماضی عذاب ہے یارب چھین لے مجھ سے حافظہ میرا۔ اللہ کے احسانات و کرم ہیں کہ
ماہنامہ ڈرڈائجسٹ کے توسط جنات پر مشتمل آتشی مخلوق لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔
مجموعی طور پر آتشی مخلوق کو سات ماہانہ اقساط میں مکمل ہونا تھا لیکن شومئی قسمت کہ ساتویں قسط ضائع
ہو گئی اور مہارت سے آتشی مخلوق کو چھ قسطوں میں ختم کرنا پڑا۔

پھر بھی مہارت چوٹ کھا گئی۔ ماہنامہ ڈرڈائجسٹ کے دفتر پر ٹیلیفون کالز کا تانتا بندھ گیا۔
صرف ایک سوال پوچھا جانے لگا کہ "ناگن بہن کا کیا ہوا۔"

میرے قابل قدر ساتھی، جن کی تصنیف شکنجہ نے ایک دھوم سی مچائی ہوئی ہے۔ آپ سمجھ
گئے ہوں گے۔ میں آج کے مقبول مصنف جناب شہاب شیخ کا ذکر کرنے لگا ہوں۔ فون کالز اور خطوط
کے ڈھیر دیکھ کر دل برداشتہ ہو گئے۔

اور جب مجھے ان کے چڑچڑے پن کا علم ہوا تو میں نے جھٹ سے ساتویں قسط کا مسودہ ان کو
تھما دیا۔ اس طرح آتشی مخلوق نے کتابی صورت اختیار کر لی۔

آتشی مخلوق کو کتابی صورت میں شائع کرنے کا ایک اور مقصد بھی ہے۔ وہ یہ کہ جو قارئین
کرام ماہنامہ ڈرڈائجسٹ کے مطالعے سے محروم رہے ہیں، ان کی تشنگی بھی دور کر دی جائے۔

پڑھیئے اور دور حاضرہ کے مقبول ترین ماہنامہ ڈرڈائجسٹ سے تعارف حاصل کریں جو اپنے
خریداروں کو خالصتاً طبعزاد، سچی اور تخلیقی خوفناک کہانیوں سے تسکین پہنچا رہا ہے۔

آتشی مخلوق کیسی لگی، اپنی آراء سے نوازنا نہ بھولئے گا۔

والسلام

آپ کا اپنا: ایم ایس قادری
قادری منزل، یعقوب شیر اروڈ گلی نمبر 6
کھڈہ کراچی۔ رابطہ نمبر: 7513117

نام کتاب .... آتشی مخلوق

مصنف .... ایم ایس قادری

کتابت .... اسٹوڈنٹس لیزر کمپوزنگ گلشنِ اقبال کراچی

بارِ اوّل .... ستمبر ۲۰۰۰ء

ناشر .... مسلم اعظمی

پرنٹر .... نیو عماد پرنٹنگ پریس ناظم آباد کراچی

قیمت .... 160/- روپے

اسٹاکسٹ : رشید نیوز ایجنسی شاپ نمبر۔29 اخبار مارکیٹ
فریئر مارکیٹ فون : 7760892

عزیز قارئین ' جیسا کہ آتشی مخلوق کے محرکین اور زمیداران کے نام لیوا آج بھی موجود ہیں اور سماج میں ایک مقام رکھتے ہیں لہٰذا میں نے صرف کرداروں کے نام بدل دیئے ہیں۔

اس حقیقت سے آپ انکار نہیں کرسکتے کہ بعض لوگ روزمرہ کے معمولات کو ڈائری کرنے کے جنون میں مبتلا ہوتے ہیں۔ لہٰذا علامہ مرحوم نے مجھے چند ڈائریاں دی تھیں جو سن 1916ء سے سن 1950ء تک کے عرصے پر محیط ہیں۔ ان ہی یادداشتوں کو ترتیب دے کر "آتشی مخلوق' کا عنوان منتخب کیا ہے۔ (ایم۔ ایس قادری) میرا نام وصی الدین ہے میرے اباجی کا نام رفیع الدین اور دادا ابو کا نام عماد الدین تھا۔ ہمارا تعلق چغتائی فیملی سے ہے۔ ہم اس گاؤں میں رہتے تھے جہاں جاگیردار چوہدری نظام کی رہائش تھی۔ چوہدری چونکہ جاگیردار تھے اس لئے ان کی قلعہ نما حویلی عظمت رفتہ کی ایک مثال تھی۔ دوسرے نمبر پر ہماری حویلی تھی تاہم ان ہر دو حویلیوں میں چند نمایاں اور متضاد روایات تھیں۔ مثلاً چوہدری نظام کی حویلی صرف انگریزوں کی آماجگاہ بنی رہتی جبکہ ہماری حویلی غرباء' شرفاء اور غیور لوگوں کی آماجگاہ تھی۔

چوہدری نظام اور اس کے چاروں بیٹے مذہبی روایات واطوار سے کوسوں دور تھے جب کہ ہمارے یہاں مذہب اسلام کا نور سا بکھرا رہتا تھا۔ میرے دادا مال و دولت' جاہ و حشمت کے لحاظ سے گوکہ چوہدری نظام کے ہم پلہ نہ تھے اس کے باوجود ان کی ٹکر کے ضرور تھے۔

چکوال' لاہور اور کراچی میں ہماری شوگر ملیں تھیں۔ امپورٹ اور ایکسپورٹ کا کاروبار تھا غرضیکہ اللہ کا دیا ہوا ہمارے پاس سب کچھ تھا۔

میں اپنے گاؤں (جو چودہ سیدن شاہ اور ڈھوک ٹالیاں کے درمیان ہے گاؤں کا نام جان بوجھ کر مخفی رکھا جارہا ہے۔ مصنف) سے بذریعہ جیپ چکوال کے ایک مڈل اسکول جاتا تھا۔ چوہدری نظام کے بیٹے بھی اسی مڈل اسکول میں پڑھتے تھے اور ہفتے میں دو تین بار ہی گاؤں جاتے ورنہ چکوال ہی میں اپنے ذاتی بنگلے میں رہتے تھے۔

گوکہ ہم ایک ہی کلاس میں پڑھتے تھے' دادا جان کی وجہ سے ہمارے درمیان ربط گفتگو

بھی تھا مگر میں ہمیشہ چوہدری کے بیٹوں سے دور رہنے کی کوشش کرتا تھا۔ اس دوری کی یوں تو کئی وجوہات تھیں، جن میں چند وجوہات قابل ذکر ہیں۔

پہلی یہ کہ چوہدری کے چاروں بیٹے خودسری کی وجہ سے اساتذہ کرام سے ہتک آمیز برتاؤ کرتے تھے اور جیسا کہ ہمارا اسکول ایجوکیشن تھا، چکوال کے بہت سے شرفاء اور سرمایہ داروں کی لڑکیاں بھی پڑھتی تھیں، چوہدری کے بیٹے ان میں سے حسین و جمیل لڑکیوں کے لیے وبال جان بنے ہوئے تھے۔ ان کے پیرنٹس بھی چوہدری نظام کے اثر و رسوخ کی وجہ سے لب کشائی کرنے سے گھبراتے تھے۔ میں پورے اسکول میں واحد لڑکا تھا جو چوہدری نظام کے بیٹوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر انہیں اوچھی اور قابل حقارت حرکتوں سے باز رکھنے کی کوشش کرتا رہتا تھا۔ ہمارے درمیان بعض مرتبہ ہاتھاپائی کی نوبت بھی آجاتی تھی مگر اساتذہ کرام کی مداخلت کی وجہ سے ہمارے درمیان باقاعدہ لڑائی نہ ہو سکی تھی۔ میں روزانہ ہی اباجی سے شکایات کرتا رہتا مگر اباجی مجھے بڑے ہی پیار سے نصیحتیں کرتے اور چوہدری نظام کے بیٹوں سے دور رہنے کی تلقین کرتے رہتے تھے۔ انہوں نے میرے دادا جان سے کبھی کوئی تذکرہ نہیں کیا اور مجھے بھی تذکرے کی سختی سے ممانعت کر دی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ میرے دادا جان جب چوہدری نظام کی ڈیوڑھی سے لوٹتے، حد درجہ پریشان رہتے۔ ہمارے بے حد اصرار کے باوجود کچھ بھی نہ بتلاتے۔ ان کی وجہ سے بھی ہم الجھن کا شکار رہتے۔

میرے والد صاحب کو سب سے زیادہ پریشانی میری وجہ سے تھی وہ چاہتے تھے کہ میں چوہدری کے بیٹوں سے الگ تھلگ رہ کر تعلیم حاصل کروں۔ چونکہ وہ اکثر کاروباری معاملات کی وجہ سے کراچی بھی جایا کرتے تھے اس لئے ان کی کوششیں بار آور ثابت ہوئیں اور مجھے کراچی کے سندھ مدرستہ الاسلام میں نہ صرف داخلہ مل گیا بلکہ ہاسٹل میں رہائش بھی مل گئی۔

میری والدہ اور چاروں بہنیں میری جدائی کے تصور ہی سے آبدیدہ ہو جایا کرتی تھیں۔ بالخصوص میری دو چھوٹی بہنیں تو مجھ سے لپٹ کر بلک بلک کر رو پڑتیں البتہ

میرے دادا بہت خوش تھے اور جب میں بہوں' ماں باپ اور دادا کو چھوڑ کر ہاسٹل پہنچا تو ہفتہ عشرہ تک میں خود بھی مجھاسار ہنے لگا تھا مگر شفیق اساتذہ اور ہم کلاس ساتھیوں کے پر خلوص تعاون نے مجھے ہر غم سے آزاد کر دیا۔

سولہ برس کی عمر میں یعنی 1932ء میں نمایاں پوزیشن سے میٹرک پاس کر لیا۔ اس دوران میرا میرے عزیزوں سے بذریعہ خط و کتابت رابطہ قائم تھا۔ میرے بابا سے تو ہر ماہ میری ملاقات بھی ہوتی رہی۔

اتفاق سے ایک روز میں نے کمشنر آف کراچی کی جانب سے اخبارات کو دیا گیا ایک اشتہار پڑھ لیا اور اباجی کی اجازت لئے بغیر ملازمت کی درخواست جمع کروادی۔

انٹرویو ہوا اور میں کراچی کے کمشنر سر جان ٹیلر کا پی اے منتخب کر لیا گیا۔

یہاں میں تھوڑی سی لفاظی کرنے لگا ہوں' حالانکہ جو کچھ میں کہنے لگا ہوں' وہ ایک اٹل حقیقت ہے۔

میں نے جب انٹر پاس کیا تو میری عمر اٹھارہ برس تھی۔ دو سال تک میری پوسٹ عارضی رہی تھی۔ میرا قد اس وقت چھ فٹ دو انچ تھا۔ میں سرخ و سفید اور بہت ہی پر کشش شخصیت کا مالک تھا۔ جسم کسرتی' ٹھوس اور سخت تھا' بالخصوص جنس مخالف کے لئے میری شخصیت میں بے پناہ کشش تھی۔

سر جان ٹیلر جیسا کہ لاولاد تھے اس لئے انہوں نے مجھے اپنا بیٹا بنا لیا۔ ان کی بیگم لیڈی کیتھرائن نے مجھے حقیقی ماں کی محبت دی تھی۔ دونوں میاں بیوی میرا بہت خیال رکھتے تھے۔ میں ان ہی کے ساتھ سولجر بازار کے ایک بنگلے میں رہتا تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ میرے اباجی نے بھی میری ملازمت پر کوئی اعتراض نہیں کیا تھا بلکہ وہ جب بھی کراچی آتے تو میرے پاس ہی ٹھہرا کرتے تھے انہیں بھی سر جان ٹیلر اور لیڈی کیتھرائن سے ایک خاص عقیدت ہو گئی تھی۔

انٹر میں نمایاں کامیابی حاصل کر لینے کے بعد جب میری ملازمت کو استحکام ملنے والا تھا' سر جان ٹیلر کا ریٹائرمنٹ ہو گیا اور وہ مجھے اپنے ساتھ برطانیہ لے جانے پر بضد ہو گئے

اور جب میرے بابا کی آمد پر سر جان ٹیلر نے اپنی خواہش کا اظہار کیا تو میرے بابا خوشی سے اچھل پڑے اور اجازت دے دی۔ میں نے لاکھ چاہا کہ برطانیہ جانے سے پہلے اپنے پیاروں سے ایک ملاقات کر لوں مگر میرے بابا بڑی مہارت سے میری خواہش کو ٹال دیتے تھے۔

کاش مجھے اسی وقت پتہ چل جاتا کہ ابا جی مجھے گاؤں جانے سے کیوں روکتے رہے تھے۔ بہر حال میں سر جان ٹیلر کے ہمراہ برطانیہ چلا گیا میں نے وہاں پہنچ کر انجینئرنگ ڈگری کیسے حاصل کی، فوجی تربیت میں کیا کیا کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ یہ ایک طویل داستان ہے۔ اسے بیان کر کے میں آپ کا وقت ضائع نہیں کرونگا۔ تاہم کچھ نہ کچھ ذکر کرونگا۔

سن **1939**ء سے سن **1945**ء تک لڑی جانے والی جنگ عظیم دوم کے انگارے اس وقت دب گئے جب **23** مئی **1945**ء میں ہٹلر کے جانشین امیر البحر کارل ڈونیٹز نے جنرل یودل اور ڈاکٹر البرٹ اسپیئر سے جرمن قوم کی بقاء کے لئے باہم مشورے سے خود کو برطانوی فوج کے سپرد کر دیا۔ اس طرح گرفتاری پیش کرنے کی سینکڑوں وجوہات میں سے دو اہم ترین وجوہات یہ تھیں کہ ہٹلر خود کشی کر چکا تھا۔ اس لئے کہ **25** اپریل **1945**ء کو اتحادی فوجوں کا دباؤ میلان پر شدت اختیار کر چکا تھا۔

دوسری اور اہم وجہ یہ تھی کہ موسلیو اپنی داشتہ کلا پیٹا خی سمیت لفٹینٹ کرنل والیریو کے چنگل میں پھنس چکا تھا اور والیریو نے انہیں جھیل کومو کے قصبے جیولانوڈی میزیجر کے قریب ایک سنسان مقام پر لے جا کر پانچ گولیاں مار کر قتل کر دیا تھا اور پھر ان دونوں کی لاشیں پیازلوریٹو جو میلان میں تھا بھیج دی تھیں تاکہ عبرت کا نشان بن جائیں۔

یہ حوالے میں نے اس لئے دیئے ہیں کہ آتشی مخلوق پڑھنے والے یہ نہ سمجھیں کہ میں دروغ گوئی سے کام لے رہا ہوں۔ میں نے ہیروشیما اور ناگاساکی کو صفحہ ہستی سے مٹتے دیکھا ہے فوجوں کے کیمپوں میں ۳۵ لاکھ یہودیوں کو راکھ بنتے دیکھا ہے کیونکہ میں امریکن بند یافتہ ہوں اور جنگ عظیم دوم کا زندہ جاوید کردار ہوں۔

میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ آگ و بارود کے پہاڑوں کے درمیان میں اس لئے زندہ رہا کہ میرے گرد آتشی مخلوق کا احاطہ تھا۔ ویسے بھی دوسری عالمگیر جنگ یورپ ہی کے محاذوں پر لڑی گئی تھی۔

میرے محسن سر جان ٹیلر اور لیڈی کیتھرائن وفات پا چکے تھے اور مرنے سے پہلے انہوں نے مجھے اپنے قابل اعتماد اور قریبی عزیز ہیڈل اسمتھ کے سپرد کر دیا تھا۔

ہیڈل اسمتھ امریکی فوج میں جنرل کے عہدے پر فائز تھے' میرے اتالیق بھی تھے اور مجھے مہم جو فطرت کے باعث ہر محاذ پر اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ ان ہی کے مشورے پر میں نے اپنے شہر اپنے گاؤں جانے کا ارادہ ملتوی کیا تھا۔ شاید اس لئے کہ اس وقت پورا یورپ جنگ کی ہولناکیوں کی لپیٹ میں تھا۔ امریکہ' روس' برطانیہ اور فرانس وغیرہ کی فوجیں جرمن نازی فوجوں کے گرد تباہ کن حصار ڈالنے میں مصروف تھیں۔ اس کے باوجود جنرل ہیڈل نے مجھ پر خصوصی توجہ مرکوز رکھی تھی ویسے بھی میں ایک مکمل فوجی تھا اور اعزازی میجر کے عہدے پر فائز تھا۔

ان حالات میں تقریباً چھ برس سے میرے عزیزوں سے میرا رابطہ ٹوٹا ہوا تھا۔ نہ تو انہیں میں اپنے حالات سے آگاہ کر سکا اور نہ ہی ان کے حالات سے آگاہی حاصل کر سکا تھا۔ البتہ جنرل صاحب کے توسط سے مجھے معلوم ہوتا رہا کہ جنوبی ایشیاء میں تحریک آزادی زور پکڑتی جا رہی ہے۔

آپ لوگ بخوبی جانتے ہیں کہ برصغیر میں دو ہی بڑی قومیں تھیں۔ ان میں سے ایک ہندو قوم مہاتما گاندھی کی قیادت میں' تو دوسری جانب مسلم لیگ کے جھنڈے تلے مسلمان قائداعظم محمد علی جناح کی ولولہ انگیز قیادت میں ایک الگ اور خالصتاً اسلامی ریاست کے لئے متحرک ہو چکے تھے۔

بہر حال امریکہ کے بتیسویں صدر فرینکلن ڈیلانو روز ویلٹ لٹل وہائٹ ہاؤس میں جو جارجیا کے پائن مونٹین کے اوپر واقع تھا' 12 اپریل 1945ء کو دماغ کی رگ پھٹ جانے سے انتقال کر گئے تھے۔

یوں تو امریکی صدر روزویلٹ کی موت نے پورے یورپ پر سکتہ طاری کر دیا تھا' مگر میری نظروں میں جنرل ہیڈل اسمتھ بہت زیادہ اہمیت اختیار کئے ہوئے تھے۔ انہیں امریکی صدر کی موت کا اس قدر صدمہ تھا کہ نازی جرمنی کی ذلت آمیز شکست بھی ان کی مسکراہٹیں لوٹا نہ سکیں۔ پھر' چند ماہ بعد یعنی 26 دسمبر 1945ء کرسمس تہوار کے دوسرے دن جنرل ہیڈل کی طرف سے مجھے اپنے وطن جانے کی اجازت مل گئی۔

میرے ساتھ سامان کی کوئی لمبی چوڑی فہرست نہ تھی۔ ایک بستر بند دو بڑے سوٹ کیس اور ایک بڑا سا ہینڈ بیگ شامل تھا۔ میرے پاس ڈالرز کی صورت میں نقد رقم اس قدر تھی کہ میں تین چار فیکٹریاں لگا سکتا تھا۔ نقد رقم سے کئی گنا رقم کراچی' لاہور اور راولپنڈی کے یورپین بینکوں میں جمع تھی۔

قیمتی جواہرات سے مزین زیورات کے چند سیٹ بھی تھے جو میں نے اپنی چاروں بہوں کے لئے مخصوص کر رکھے تھے۔ کچھ سونا تھا' پاؤنڈز اور مقامی کرنسی نوٹوں کی گڈیاں بھی تھیں اور یہ سب کچھ مجھے جنرل ہیڈل ہی نے دیا تھا۔

زیورات اور سونا ہم نے ہٹلر کی ترتیب دی ہوئی دوزخوں سے بطور مال غنیمت حاصل کیا تھا۔ ان دوزخوں میں برجن لیسن' لیلن میڈانک گستاپو اور نارڈ ہازن وغیرہ کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ میرا حصہ جنرل صاحب نے پوری ایمانداری سے میرے سپرد کر دیا تھا۔ انہوں نے اپنی طرف سے بھی میری بہوں کے لئے چند زیورات دیئے تھے۔

میرے محسن مرحوم سر جان ٹیلر کی تمام منقولہ اور غیر منقولہ جائیداد جو انہوں نے اپنی زندگی ہی میں میرے نام کر دی تھی' ان کی وفات کے بعد اور دوسری عالمگیر جنگ شروع ہونے سے پہلے ہی میں نے اپنے ابا کے نام کراچی شہر کے یورپی بینک میں منتقل کروا دی تھی۔ اس کے تمام تحریری اور مصدقہ ثبوت میرے پاس محفوظ تھے۔

اس کے علاوہ میرے پاس امریکی اور برطانوی حکومتوں کے دیئے ہوئے وسیع اختیارات کے شناختی کارڈ اور دستاویزات بھی موجود تھے۔

آمدم بمقصد۔ 27 جنوری 1946ء کی ایک ٹھٹھرتی شب بذریعہ ملٹری طیارہ میں

مار ہیپور ایئر پورٹ پہنچ گیا۔

گو کہ میں عمدہ اور گرم کپڑے کے تھری پیس سوٹ میں ملبوس تھا اوپر سے گرم اوور کوٹ پہنے تھا' سر پر سمور کی ٹوپی اور ہاتھوں پر گرم چرمی دستانے پہنے تھا اس کے باوجود جب میں بلا روک ٹوک ٹرالی دھکیلتے ہوئے جونہی ایئر پورٹ کی عمارت سے باہر نکلا' میرے دانت بجنے شروع ہو گئے۔ گو کہ ہواؤں میں تیزی نہ تھی اس کے باوجود ٹھنڈک میرے پورے وجود میں کچوکے سے لگانے لگی تھی۔

چونکہ ماری پور ایئر پورٹ لب ساحل تھا اس لئے اور اس لئے بھی کہ پورا ماحول کہر کے دبیز پردوں میں ڈھکا ہوا تھا' چند فٹ فاصلے کی چیزیں بھی دکھائی نہیں دیتی تھیں۔ ایئر پورٹ کی روشنیاں بھی کہر کے بادلوں میں روپوش ہو چکی تھی۔

ابھی میں کچھ سوچنے بھی نہیں پایا تھا کہ میری سماعت سے کسی کار کے انجن کی مدھم سی آواز ٹکرائی اور دیکھتے ہی دھند کے دبیز پردوں کو چیرتی ہوئی روشنی میرے قریب پہنچ گئی۔ میں اس وقت چونکا جب ڈرائیور کی کھر کھراتی مگر مودبانہ آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

"گڈ نائٹ سر۔ آپ جلدی سے کار میں بیٹھ جائیں میں آپ کا سامان ڈگی میں رکھے دیتا ہوں......"

میرے جواب کا انتظار کئے بغیر ڈرائیور کار سے نکل کر میرے سامنے کی طرف بڑھ گیا جب کہ میں جلدی سے ہپناٹزم کے معمول کی طرح شیورلیٹ کار کا پشتی دروازہ کھول کر پشتی سیٹ پر ہی بیٹھ گیا تھا۔

ذرا سی دیر میں کار اسٹارٹ ہوئی اور لمبا سا راؤنڈ لے کر مین روڈ پر تیرتی چلی گئی۔ میں نے دائیں بائیں کے شیشوں سے باہر کا منظر دیکھنے کی کوشش کی مگر شیشے دھند آلود تھے ان پر شبنم دھاریں بن کر بہہ رہی تھی۔ ایسے میں بیرونی مناظر دکھائی نہیں دیئے تھے۔

سکون کا سانس لے کر میں نرم و گرم پشتگاہ سے ٹک گیا۔ حقیقتاً مجھے کار میں بہت ہی سکون محسوس ہو رہا تھا۔ سردی کا احساس تک مٹ کر رہ گیا تھا۔

حالانکہ میں نے برسہابرس یورپ کے ٹھٹھرتے ہوئے برفانی شب و روز گزارے تھے مگر کراچی کی سردی نہ جانے کیوں میرے لئے کپ کپی کا باعث بن گئی تھی۔

اچانک ایک خیال بجلی کے کوندے کی طرح میرے ذہن کو جھنجھوڑتا ہوا گزر گیا۔

سب سے پہلا سوال جو میرے ذہن پر ابھر اوہ یہ تھا کہ ڈرائیور کون ہے۔ اسے کیونکر معلوم ہوا کہ میں ماریپور ایئرپورٹ پر پہنچ چکا ہوں۔ پھر یہ کہ ڈرائیور نے مجھ ہی سے رابطہ کیوں کیا۔ میرے ساتھ چند دوسرے پسنجر بھی تو ایئرپورٹ پر اترے تھے ان میں عورتیں بھی تھیں اور بچے بھی۔

"چغتائی صاحب۔" اچانک ڈرائیور نے مجھے مخاطب کیا اور میرے ذہن پر بڑی زور کا چھناکہ ہوا۔

"آں............" میں چونکا۔

"آپ پریشانی محسوس کر رہے ہوں گے۔ بہتر ہے کہ میں آپ کی الجھن رفع کر دوں۔"

میرا نام دیجور ہے۔ مجھے دو گھنٹے پہلے ہی جنرل میڈل اسمتھ کا میسج مل چکا تھا۔ مجھے افسوس ہے کہ کسی وجہ سے میں تھوڑا سا لیٹ ہو گیا ورنہ آپ کو سامان کی ٹرالی دھکیلنے کی زحمت بھی نہ اٹھانی پڑتی۔

یہ دیکھئے آپ کی فوٹو، جس سے میں نے آپ کو پہچانا۔ کہتے ہوئے ڈرائیور نے کارڈ سائز کی میری اپنی بلیک اینڈ وائٹ فوٹو اپنی جیب سے نکال کر میری طرف بڑھا دی۔

بے ساختہ میرے لبوں سے سکون کی سانس نکل گئی فوٹو میری ہی تھی اور سر تا پا میجر کی وردی میں ملبوس تھا۔ میری تمام الجھنیں دو ہو گئیں۔

"شکریہ دیجور۔ کیا آپ بتلا سکیں گے کہ اس وقت ہماری کار کہاں سے گزر رہی ہے اور آپ مجھے کہاں اسٹے کروانا چاہتے ہیں....

"یس میجر سر۔ اس وقت ہماری کار ماہی گیروں کی قدیم بستی کھڈہ کے سرے سے گزر رہی ہے۔ یہ وہ بستی ہے جو ملکہ وکٹوریہ نے مائی کلاچی کے نام گفٹ کر دی تھی۔

(مائی کلاچی ہی کے نام سے یہ شہر کلاچی کہلایا جو آگے چل کر کراچی بن گیا۔)

اب ہم لکھار ادر کو عبور کر رہے ہیں اور ہمارا یہ مختصر سفر جمشید روڈ پر آپ کے خاص بنگلے پر ختم ہو گا

''شکریہ ڈیجور'' خالی الذہن سے جواب دے کر میں نے آنکھیں موندلیں اور ماضی کی یادوں کو سمیٹنے لگا۔

دراصل جمشید روڈ والا بنگلہ مرحوم سر جان ٹیلر کی ذاتی ملکیت تھا۔ جہاں ریٹائرمنٹ کے بعد سرکاری بنگلہ خالی کر کے ہم شفٹ ہوئے تھے اور اب یہ بنگلہ میرا ذاتی تھا۔

☆☆☆

مضافات کی نسبت جمشید روڈ پر شدید کہر نہ تھی تاہم اسٹریٹ روشنیاں او نگھتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ ہر طرف ایک ہو کا عالم سا چھایا ہوا تھا۔ ہر بنگلے پر اندھیرا اور سناٹا مسلط تھا۔ ویسے بھی شب کا ایک بج چکا تھا اور یہ کہ سن 1945ء سے 1955ء تک کراچی شہر کی آبادی بہت ہی مختصر تھی۔

بہر حال میرے بنگلے کا پورچ روشن تھا اور دو جوان العمر ملازم اور جوان العمر دو لڑکیاں پورچ کے سائبان تلے میری منتظر تھیں۔

جیسے ہی شیورلیٹ پورچ تلے پہنچ کر رکی' ڈیجور بڑی تیزی سے ڈرائیونگ ڈور کھول کر اترا اور میری جانب کا دروازہ کھولتے ہوئے گویا ہوا۔

''میجر سر! آپ مس صاعرہ کی رہنمائی میں اپنے کمرے تک جائیں میں آپ کا سامان آپ کے کمرے تک پہنچا رہا ہوں......'' ڈیجور کے الفاظ ختم ہوتے ہی ایک ملازمہ لکھنوی انداز میں میرے سامنے آداب بجا لائی۔

''آیئے سر......

صاعرہ جب بولی تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے مطرب نے نہایت ہی خوشکن نغمہ چھیڑ دیا ہو۔ گو کہ وہ زیادہ حسین نہ تھی مگر اس کے نقوش اور جسمانی نشیب و فراز ایسے ہی تھے کہ میں نے جھرجھری سی لیتے ہوئے اپنی نظریں پھیر لیں۔

وہ پنک کلر کا ریشمی لباس پہنے تھی۔ سر کے لمبے اور سیاہ بالوں کو اس نے قبائلی پٹھان عورتوں کی طرح کئی لڑیوں میں گوندھا ہوا تھا۔ جو کچھ بھی تھا میں صابرہ کی رہنمائی میں اپنے کمرے تک پہنچ گیا۔ کمرہ صاف ستھرا اور سجا سجایا تھا۔

کمرے میں پہنچ کر میں نے اپنی ٹوپی' دستانے اور کوٹ وغیرہ اتار لئے۔ اس لئے کہ کمرے میں ہیٹر آن تھا۔ کھڑکیوں اور دروازوں پر دیدہ زیب پردے آویزاں تھے البتہ تین روشندان کھلے ہوئے تھے۔

''سر۔ آپ کافی پینا پسند فرمائینگے یا ڈنر......'' وہ بولی۔ ''شکریہ صابرہ' ڈنر میں نے طیارے میں لے لیا تھا البتہ کافی پلوادو تو مہربانی ہوگی............''

''کیسی مہربانی سر۔ آپ ہمارے آقا ہیں۔ آپ کے حکم کی بجا آوری ہمارا نصب العین ہے......'' وہ مسکراتے ہوئے بولی اور چلی گئی۔

ذرا سی دیر میں میرا سامان پہنچ گیا۔

''کافی پی کر آپ آرام کریں سر تاکہ آپ کی تھکان......'' دیجور یہیں تک کہنے پایا تھا کہ میں نے اس کا جملہ اچک لیا۔

''پہلے مجھے یہ بتلاؤ کہ میری غیر موجودگی میں میرے ابا یہاں کتنی بار آئے تھے............''

''صرف دو مرتبہ سر............'' دیجور نے خادمانہ انداز میں جواب دیا۔ ''ہوں۔ آخری بار وہ کب آئے تھے............''

''دو برس قبل سر اور آپ کے لیے سیل پیک لفافہ دے گئے تھے......

''سیل پیک............'' میں بری طرح چونکا۔

''کہاں ہے وہ لفافہ......'' میں اٹھ کھڑا ہوا۔ تاہم صابرہ کو کافی لاتے دیکھ کر میں دوبارہ بیٹھ گیا۔

''اسٹڈی روم کی الماری میں محفوظ ہے سر۔ بہتر یہی ہے کہ آپ آرام کریں' صبح کو [illegible] لیجیے گا۔''

"اچھا......" میں گرما گرم کافی کا سپ لیتے ہوئے تھکے تھکے لہجے میں بولا۔ "تم کہتے ہو تو میں صبر کئے لیتا ہوں۔ ویسے تم میری اندرونی کیفیات سے ناواقف ہو۔ تم نہیں جانتے کہ میرے دل و دماغ پر میرے پیاروں کے کیسے کس قدر طوفان گڈمڈ ہو رہے ہیں۔

"مجھے احساس ہے سر۔ تاہم میں یہی کہوں گا کہ یکسوئی حاصل کرنے کے لئے آپ کا سو جانا ہی بہتر ہے......"

دیجور ہی کا مشورہ مجھے مناسب لگا' لہٰذا کافی پی لینے کے بعد میں نے پیالی صابرہ کے سپرد کر دی پھر' جب دیجور اور صابرہ' چلے گئے تو میں اپنے سوٹ کیس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

پانچ منٹ میں میں نے سلیپنگ سوٹ پہنا' دروازے کو لاک کیا اور مین لائٹ آف کر کے زیرو وولٹ کی نیلگوں روشنی آن کر دی اور بستر پر دراز ہو گیا۔

تنہائی اور یکسوئی حاصل ہوتے ہی میرے ذہن پر میرا ماضی سینما اسکرین کی طرح روشن ہو گیا۔ میری بڑی اور چھوٹی بہنوں کے مسکراتے ہوئے سراپے میرے لہو میں سرور ساطاری کرنے لگے۔ میرے دادا ابو اور والدہ ماجدہ کی شفقتیں' دعائیں اور برتاؤ مجھے گدگدانے سے لگے۔

اچانک ایک خیال کے ذہن میں گونجتے ہی میری پیشانی شکن آلود ہو گئی۔ معاً مجھے خیال ہوا کہ ایئرپورٹ پر سردی کی وجہ سے میرے دانت بج رہے تھے' میرا جسم بید مجنوں کی طرح کپکپا رہا تھا مگر دیجور باوجود عام سے شلوار سوٹ میں ملبوس تھا۔ اسے ٹھنڈک کا احساس تک نہ ہوا تھا۔

دوم یہ کہ بیرونی مناظر دیکھنے کے لئے' جب میں نے دائیں بائیں نظریں ڈالیں تو ڈور گلاسز پر دھند چھائی ہوئی تھی صرف ڈور گلاسز ہی پر کیا منحصر تھا۔ کار کا ونڈ شیلڈ بھی اس قدر دھندلایا ہوا تھا جیسے اس پر دودھیائی پردہ ڈال دیا گیا ہو۔

تو...... تو یہ سب کچھ کیا تھا؟ دیجور اس قدر اعتماد سے کار ڈرائیو کر رہا تھا جیسے اسے سب کچھ نظر آ رہا ہو۔

اف میرے خدا! کہیں میں کسی چکر میں تو نہیں پھنس گیا؟ میری یہ سوچ اس قدر برمحل ثابت ہوئی کہ نیند مجھ سے کوسوں دور چلی گئی۔ ابھی میں اسی الجھن میں مبتلا تھا کہ ایک اور عبرت انگیز تصور میرے ذہن میں ابھر آیا۔ وہ یہ کہ ڈیجور اور جنرل ہیڈل میں کیا تعلق ہے؟ جنرل ہیڈل کے تو فرشتوں کو بھی علم نہیں تھا کہ کراچی میں میرا بنگلہ بھی ہے۔ بالغرض اگر اسے کسی طرح سے علم ہو بھی گیا تھا تو اس نے ڈیجور سے کس طرح رابطہ قائم کیا؟ مجھے ایسے رابطے سے مطلع کیوں نہیں کیا؟

''اوہ..... اوہ.........'' ایک تیسرے تصور کے ذہن میں ابھرتے ہی میں بے چینی سے اٹھ بیٹھا اور وہ تصور یہ تھا کہ بنگلے کے ملازمین بھی سادہ سے لباس پہنے ہوئے تھے' انہیں بھی تو سردی نہیں لگ رہی تھی۔



ان متواتر خیالات نے مجھے اس قدر بے چین کر دیا کہ میں مسہری سے اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ میں جوں جوں سوچتا رہا' میرا ذہن الجھتا چلا گیا۔ میری سمجھ ہی میں نہیں آرہا تھا کہ میں اپنے سوالات یا الجھاووں کا کیا نتیجہ اخذ کروں۔

کافی دیر تک ٹہلتے رہنے کے بعد میں تھک ہار کر مسہری پر بیٹھ گیا۔ حسب معمول میں نے دس بار درود شریف پڑھا' آیت الکرسی پڑھی اور خود پر دم پھونک کر چت لیٹ گیا۔ میں نے سب کچھ اللہ کے سپرد کر دیا۔ مجھے یقین تھا کہ میرا رب میرے لئے بہتر کرے گا۔

میں لیٹا رہا اور نیند کی دیوی آہستہ آہستہ مجھ پر غالب ہوتی گئی اور پھر میں سو گیا۔

میں نے بہت ہی دلچسپ خواب دیکھا۔ میری امی مجھے اپنے سینے سے چمٹائے فرط مسرت سے روتی رہیں۔ آپا سلیمہ اور چھوٹی آپا نسیمہ مجھے اپنے سامنے پا کر شادی مرگ میں مبتلا تھیں اور میری دونوں چھوٹی بہنیں فوزیہ اور فرحین میری گود میں سر رکھے بہت ہی خوش نظر آرہی تھیں۔

ہو سکتا میرا یہ خواب طویل ہو جاتا کہ اچانک میرے تحت الشعور کے گوشے روشن

ہو گئے۔ مجھے یوں لگا جیسے کوئی میری خوابگاہ کا دروازہ پیٹ رہا ہو۔ اسی دھب دھب کی آوازوں نے میرے تحت الشعور پر جمپ لیا اور شعور پر جا پہنچیں۔

میں نے آنکھیں کھول دیں۔ پوری طرح بیدار ہونے کے بعد صاف محسوس ہوا کہ واقعی میری خوابگاہ کا دروازہ تھپتھپایا جارہا ہے۔

میں نے سلیپر پہنا اور دروازے پر پہنچ کر پردہ ہٹایا پھر ایک جھٹکے سے دروازہ کھول دیا۔ راہداری روشن تھی مگر دائیں بائیں کوئی بھی ذی روح نہیں تھا۔ میں نے صرف ایک تبدیلی محسوس کی تھی' وہ یہ کہ دروازہ کھولتے ہی ٹھنڈی ہوا کا ایک شدید جھونکا میرے وجود سے ٹکرا کر میرے رگ وپے میں جھرجھری سی پیدا کرتے ہوئے معدوم ہو گیا تھا۔

میری پیشانی شکن آلود ہو گئی۔ میں نے سوچا جب دروازے پر کوئی نہیں ہے تو پھر دروازہ کس نے پیٹا۔ دھب دھب کی آواز میرا واہمہ بھی نہیں ہو سکتی۔

اونہہ۔ سر جھٹک کر میں نے دروازہ بند کر دیا اور پردہ برابر کر کے دوبارہ مسہری پر دراز ہو کر کمبل اوڑھ لیا اور سونے کی بہت کوشش کی مگر نیند مجھ سے کوسوں دور جا چکی تھی۔

میں سو جانے کی کوشش کرتا رہا اور پہلو پر پہلو بدلتا رہا۔ ہر کوشش کے باوجود دروازہ پیٹنے کی آواز کو ذہن سے نہ جھٹک سکا۔

اپنا خیال بانٹنے کے لئے میں نے دوبارہ دیجور کے متعلق سوچنا شروع کر دیا۔ اب تک میرے سامنے پانچ ملازمین آ چکے تھے۔ جن میں تین مرد اور دو نوجوان و نوخیز لڑکیاں تھیں۔

کیا بنگلے میں یہی ملازم تھے یا ان کے علاوہ دیگر ملازمین بھی ہیں؟ اور یہ کہ ان ملازمین کو ملازمت کس نے اور کیوں دی؟

اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ ملازمین کی تعیناتی میرے ابا کی مرضی سے عمل میں ہے' تو ان کو کیسے علم ہوا کہ یہ بنگلہ مستقل طور پر میرے نام الاٹ ہو چکا ہے۔

"اوہ......" معاً میرے ذہن میں ایک نیا خیال ابھرا وہ یہ کہ ہماری کراچی والی چغتائی

شوگر مل کے منیجر دیالداس کو تو سب کچھ علم تھا۔ میں نے اسے بذریعہ ٹیلیگرام مطلع کیا تھا کہ میرے بنگلے پر حسبِ ضرورت ملازمین تعینات کر دیئے جائیں تاکہ ہریالی قائم رہے اور بنگلے کی دیکھ بھال مؤثر طور پر ہوتی رہے۔

میرے اس خیال نے مجھے اس قدر تقویت بخشی کہ میرے ذہن سے غبار دھل گیا۔

"میاؤں ...... "کسی بلی یا بلے کی اچانک ابھرنے والی آواز سن کر میں غیر ارادی طور پر کمبل جھٹک کر اٹھ بیٹھا۔

"میاؤں ...... "آواز ایک بار پھر ابھری اور نہ جانے کیوں میرا دل اچھل کر میرے حلق میں آ اٹکا۔

میں نے متوحش نظروں سے خوابگاہ کا جائزہ لیا۔ سناٹا' سکوت اور زیرو وولٹ کی مدھم روشنی کے علاوہ کچھ بھی سجھائی نہیں دیا۔ میں فوراً ہی اٹھا کمرے کی مین لائٹ آن کی اور سب سے پہلے مسہری کے نیچے کا جائزہ لے لیا۔ پانچ منٹ کے اندر میں نے اٹیچ باتھ روم اور الماری وغیرہ کا جائزہ لے لیا مگر مجھے کہیں بھی کوئی بلی یا بلا نظر نہ آیا۔

میں بزدل یا ڈرپوک نہیں ہوں۔ دورانِ جنگ نازی جرمنی کے کیمپوں میں میں نے ہزاروں انسانی پنجر دیکھے تھے۔ ناگاساکی اور ہیروشیما پر ایٹم بم گرائے جانے کے بعد میں نے بذریعہ دوربین ہزاروں عورتوں' مردوں اور بچوں کو دیکھا تھا جن کے جسموں سے کھال لٹکتی اور جھڑ جاتی گوشت سیال بن کر پگھل جاتا۔ یوں لگتا جیسے لاکھوں مہیب صورت بدروحوں کو دیکھ رہا ہوں۔ محض اسی وجہ سے مجھے جنرل ہیڈل اور امریکی حکومت سے نفرت اور مظلوم جاپانیوں سے بے پناہ محبت ہو گئی تھی۔

ہاں تو دوستو میں آنِ واحد میں اپنے اوسان پر قابو پا چکا تھا۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ خوابگاہ میں کوئی بلی یا بلا نہیں ہے تو میں مطمئن ہو گیا۔ رسٹ واچ میں وقت دیکھا تو سحر کے پانچ بج چلے تھے۔

میں ایک بار پھر مسہری پر لیٹ گیا اور بلی کی آواز میں الجھتا رہا۔ اس آواز کو بھی میں واہمہ سمجھنے کو تیار نہ تھا۔ آہستہ آہستہ میری آنکھیں بوجھل ہوتی گئیں اور ذہن پر غنودگی چھانے

ئی۔ پھاتی گئی چھاتی گئی اور پھر میں ہر طرف سے بے خبر ہو گیا۔

٭٭٭

میری آنکھیں کھلیں تو صبح کے ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔ ہو سکتا ہے میں بے خبر سوتا رہتا مگر مجھے یاد ہے' خوب طرح سے یاد ہے کہ میری ملازمہ صابرہ نے مجھے جھنجھوڑ کر بیدار کیا تھا۔

پھر دو تین جماہیاں لینے کے بعد جب میں پوری طرح چاک و چوبند ہو گیا تو سب سے پہلے میری نظریں خواب گاہ کی حالت پر پڑیں۔

خواب گاہ کی ہر چیز پر گرد کی کاغذی تہیں جمی ہوئی تھیں۔ کھڑکیوں اور دروازوں کے پردے اس قدر میلے اور بوسیدہ تھے جیسے برسوں سے بدلے نہ گئے ہوں اور تو اور میرے بیڈ پر بھی گرد جمی ہوئی تھی۔ میرا اسلیپنگ لباس گرد آلود ہو چکا تھا۔ گرد آلود قالین پر جا جا میرے اپنے سلیپر کے نشانات تھے۔ کمرے کے چاروں کونے فرش سے چھت تک مکڑی کے جالوں سے اٹے ہوئے تھے۔

''اف میرے معبود .....'' بے ساختہ میرے لبوں سے آواز نکلی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ چند لمحوں کے لئے گویا میرے دل کی دھڑکنیں رک گئیں تھیں لیکن' چونکہ میری قوت ارادی چٹان کی طرح سخت تھی اس لئے میں فوری طور پر اپنی حالت پر قابو پا گیا اور پیش آئندہ حالات سے نمٹنے کے لئے مستعد ہو گیا میں نے تکیے کے نیچے سے اپنا امریکن ہٹیس بور کا ریوالور اٹھا لیا جو اپنی جگہ موجود تھا میرا تمام سامان بھی گرد آلود قالین پر بالکل اسی طرح رکھا تھا جس طرح رات میں ڈرائیور دیجور نے رکھا تھا۔ جو کچھ بھی تھا' میرے لئے طلسم ہوشربا سے کم نہ تھا۔

میں نے ریوالور کو مضبوطی سے تھاما اور زیرو واٹ روشنی کا بٹن آف کر کے گدلا اور بوسیدہ پردہ ہٹایا' دروازہ کھولا اور برآمدے میں نکل گیا۔

برآمدے میں سورج کی چمک کی وجہ سے اچھی خاصی روشنی تھی دائیں بائیں کا پورا فرش گرد کی موٹی تہوں سے اٹا ہوا تھا۔ سناٹے کا یہ عالم تھا کہ میرے اپنے تنفس کی آواز

مجھے صاف سنائی دے رہی تھی۔ تاہم دیجوریا کسی ملازم یا ملازمہ کا دور تک پتہ نہ تھا۔

فی الحال میں خالی الذہنی سے جائزہ لے رہا تھا یا پھر یوں سمجھئے کہ موجودہ حالات نے میرے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں دبا کر رکھ دی تھی ویسے بھی پورے بنگلے کا گہرا جائزہ لینے کے بعد ہی میں آئندہ کا لائحہ عمل مرتب کرنا چاہتا تھا۔ اس سے پہلے میں اسٹڈی روم سے باباجی کا سیل پیک لفافہ دیکھ لینا چاہتا تھا۔

اسٹڈی روم تک پہنچنے میں مجھے زیادہ محنت نہ کرنی پڑی تھی' دائیں جانب کے دو کمرے چھوڑ کر تیسرا اسٹڈی روم تھا۔

اسٹڈی روم کے دروازے پر پہنچ کر مجھے احساس ہوا کہ برسوں سے دروازہ کھولا نہیں گیا اور جب میں نے دروازہ کھولا تو مکڑی کے جالے' کاکروچ اور دیگر کیڑے مکوڑے ہی نظر آئے۔ میں نے ادھر ادھر تلاش کے بعد ایک تنکوں والا جھاڑو حاصل کر لیا اور جھاڑو ہی سے جالے وغیرہ ہٹا کر تینوں کھڑکیاں کھول دیں۔

کھڑکیاں کھولنے سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ کمرہ دن کی طرح روشن ہو گیا اور سیلن و کاکروچوں کی مخصوص بو تیزی سے گھٹنا شروع ہو گئی۔

حالانکہ کھڑکیاں کھلنے سے اسٹڈی روم ضرورت سے زیادہ ہی ٹھنڈا ہو گیا تھا مگر مجھے ٹھنڈک کا احساس تک نہیں ہوا۔ میرے دل و دماغ پر ایک ہی دھن سوار تھی کہ اباجی کا دیا ہوا لفافہ حاصل کروں۔ پھر تھوڑی سی جدوجہد سے شیلف سے لفافہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ لفافہ بڑا اور وزنی تھا اور لفافے پر میرا ہی نام لکھا تھا۔ تاریخ اٹھائیس نومبر اور سن انیس سو تینتالیس درج تھی۔

لفافہ ملتے ہی میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں مجھے سردی کے احساس نے اپنی گرفت میں لے لیا۔ میری سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں لوٹ آئیں اور مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ میری پس پشت کوئی غیر مرئی قوت کار فرما ہے۔ یہ تصور اس لئے بھی پختگی پا رہا تھا کہ گزشتہ شب سے تا حال پیش آنے والے تمام واقعات مجھے خواب کی طرح محسوس ہوئے تھے۔

لفافہ حاصل کر لینے کے بعد میں نے پانچ دیگر کمرے بھی دیکھ لئے۔ ہر ایک کمرے کی حالت یکساں تھی اور جب میں پورچ میں پہنچا تو پائیں باغ میں چند بڑے درختوں کے علاوہ ہر چیز پر ویرانی' خزاں اور اداسی چھائی ہوئی نظر آئی۔ وہ شیورلیٹ کار بھی کہیں نظر نہ آئی جس کے ذریعے میں ایئر پورٹ سے یہاں تک پہنچا تھا۔ نہ جانے یہ کیا اسرار تھا' نہ ہی ملازموں کا کوئی نشان تھا۔

ہر مقام کا طائرانہ جائزہ لے کر میں بوجھل بوجھل قدموں سے اپنے ویران اور گرد آلود بیڈ روم میں پہنچ گیا۔ میرا اندازہ تھا کہ لفافے میں ابوجی کی ڈائری ہوگی۔ وہی ہوا بھی۔ جب میں نے لفافہ چاک کیا تو اس میں چرمی جلد کی موٹی سی کاپی یا نوٹ بک برآمد ہوئی اس کے ساتھ ہی ایک فولڈ کیا ہوا پیپر تھا۔

میری سانس تیز تیز چلنے لگی' دل کی دھڑکنیں تیز تر ہو گئیں اور ذہن میں سینکڑوں خدشات جنم لینے لگے۔ صبر کا دامن میرے ہاتھوں سے چھوٹ گیا میں نے دھڑکتے دل سے پرچہ کھولا اور پڑھنا شروع کر دیا۔

میرے بیٹے وصی الدین

اللہ تم پر اپنی برکتیں اور رحمتیں نازل فرمائے۔ تمہیں حیات خضری عطا فرمائے آمین۔
میرے بیٹے۔ مجھے یقین ہے کہ تم ضرور واپس آؤ گے۔ میں نے اور تمہارے دادا نے سیدن شاہ بابا کے مزار پر عاجزی و انکساری سے التجائیں کی تھیں' اللہ کے نام پر تمہارے صدقے میں جانور ذبح کیے تھے۔ سیدن شاہ بابا کو ضامن میں ٹھہرایا تھا۔ اسی ضمانت کی روشنی سے اللہ کی پاک ذات سے مجھے توقع ہے کہ تم صحیح سلامت لوٹو گے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ جب تم میرا یہ خط پڑھ رہے ہو گے تب میں اس دنیا میں شاید نہ ہوں۔ میرے بیٹے' جاگیر دار چوہدری نظام دقیانوس بادشاہ اور ہلاکو خان سے کہیں بڑھ کر ظالم و سفاک ہے۔ مکار و منافق ہے۔ اس نے تمہارے دادا کو شاید مروا دیا ہے۔ تمہیں اپنے سے جدا کرنے کی اصل وجہ بھی یہ تھی کہ تم ظالم نظام کی دسترس سے محفوظ رہو۔

یہ اور اس قسم کی کئی اندوہناک حقیقتیں میری یاد داشت بک سے حاصل ہو جائیں

گی۔ میرے بچے گرمی خون سے بے خود ہو کر کوئی ایسا قدم نہ اٹھانا جو خود تمہارے لئے مقام افسوس بن جائے۔ ہو سکتا ہے فرعون نظام کے لئے تم ہی موسیٰ بن جاؤ۔

تیرا اپر دم خدا

خط صرف خط پڑھنے سے مجھ پر سکتہ سا طاری ہو گیا۔ نظام جاگیر دار کے ہاتھوں میرے دادا کے قتل کی اطلاع نے میرے رگ و پے میں سنسناہٹ سی دوڑا کر رکھ دی۔ چند لمحوں کے لئے تو میں بے جان ہو گیا اور خط ہاتھ میں پکڑے بیڈ روم کی خلاؤں میں گھورتا رہ گیا۔

چند لمحوں بعد جب میرے اوسان حال ہوئے تو میں اٹھ کھڑا ہوا۔ یادداشت بک مسہری پر ہی رکھی اور باتھ روم کی طرف بڑھ گیا مگر باتھ روم کے نلکوں میں پانی نہ پا کر لوٹ آیا۔

سات بڑے ویران کمروں کے بنگلے میں ہوا کے بگولے کی طرح چکرا تا رہا تھا۔ بالآخر حتمی فیصلے پر پہنچ کر میں نے سلیپنگ لباس اتار کر اپنا گرم تھری پیس سوٹ پہن لیا کمرہ بند کر کے چل دیا۔

مجھے تلاش تھی کسی حمام کی جہاں میں شیو بنا تا اور نہا کر چاک و چوبند ہو جانا چاہتا تھا بنگلے کے مین گیٹ سے نکلنے تک میرے دل و دماغ پر صرف میرے پیاروں کا تصور چھایا رہا۔

چونکہ دن کے بارہ بج چکے تھے اس لئے دھوپ نے پورے ماحول پر قبضہ جمایا ہوا تھا۔ دائیں بائیں اور سامنے کے تمام بنگلوں میں زندگی کے آثار صاف محسوس ہوئے۔ کشادہ صاف ستھری گلی میں دیگر بنگلوں کے ملازمین کی اکا دکا آمد و رفت جاری تھی اور جب گلی سے نکل کر میں مین روڈ پر پہنچا تو سامنے ہی سڑک پار ایرانین ریسٹورنٹ کی بڑی اور لمبی چوڑی نیم پلیٹ نظر آئی اور کارنر فینسی ہیئر کٹنگ سیلون کا بورڈ نظر آیا۔

میں شاید پہلے ہی بتلا چکا ہوں کہ کراچی شہر وسیع و عریض اور بہت ہی صاف ستھرا ہونے کے باوجود بہت ہی مختصر آبادی کا شہر تھا۔ نہ تو بے تحاشہ ٹریفک تھا اور نہ ہی

انسانوں کا جم غفیر تھا۔ نہ تو فیکٹریاں تھیں اور نہ ہی ماحولیاتی آلودگی تھی۔

غرضیکہ نصف گھنٹے میں فینسی ہیئر کٹنگ سیلون سے فارغ ہو گیا اس کے بعد ایرانیان ریسٹورنٹ میں ناشتہ لیا اور وہیں سے میں نے چغتائی شوگر ملز کو فون کیا۔ سلسلہ فوراً ہی مل گیا۔

"یس۔ نظام شوگر مل........

جواب ہی ایسا تھا کہ میرا ذہن بھک سے اڑ گیا۔ ایک لمحہ کے دسویں حصے میں کئی خیالات میرے دماغ میں گڈ مڈ ہو گئے۔

"ہوں...... میرا نام وصی الدین ہے۔ کیا آپ بتلا سکتے ہیں کہ نظام شوگر مل نام کب سے ہوا......" میں اپنی ذہنی حالت پر قابو پاتے ہوئے بولا۔

"تین برس سے زائدہ عرصہ ہوا۔ آپ کیوں پوچھ رہے ہیں، کون ہیں آپ......

دوسری طرف سے بولنے والے کی آواز میں گھبراہٹ کو محسوس کر لینے کے باوجود میں نے کوئی توجہ نہ دی۔ میرے لئے یہ دوسری اطلاع بھی بم کے دھماکے سے کم نہ تھی۔

"میں ٹیکس اینڈ ایکسائز کا ڈائریکٹر ہوں۔ اس لئے پوچھ رہا ہوں کہ مجھے مسٹر دیالداس کی تلاش ہے۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ ان سے کہاں ملاقات ہو سکتی ہے؟" فوری طور پر میرے لبوں سے یہی غیر ارادی الفاظ نکلے یا پھر یوں سمجھئے کہ میرا فوجی ذہن جاگ اٹھا تھا۔

"گگ...... گڈ مارننگ سر۔ وہ.......... وہ دیالداس صاحب کو مرے ہوئے تقریباً دو برس ہو چکے ہیں۔ چوہدری نظام نے شوگر مل خریدنے کے چند روز بعد ہی انہیں ملازمت سے ہٹا دیا تھا......"

"اوہ۔ اور...... چغتائی شوگر مل کے ڈائریکٹر مسٹر مصور منہاس کا کیا ہوا......"

"......وہ تو خود ہی مستعفی ہو گئے تھے۔ انہیں امریکن ایمبیسی میں بہت ہی ذمہ دارانہ پوسٹ مل گئی تھی......"

مزید کچھ سنے بغیر میں نے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا اور ڈائریکٹری میں امریکن ایمبیسی کے نمبر تلاش کرنے لگا۔ میں نے کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے ادھیڑ عمر سرخ و سفید اور کلین شیو

ایرانی کو بہت ہی مرعوب پایا۔

جلد ہی مجھے نمبر مل گئے اور میں نے رسیور اٹھا کر نمبر ملا دیئے‘ پھر یہ میری خوش نصیبی تھی کہ دوسری جانب سے بولنے والا خود مصور تھا۔ میں اس کی آواز کو پہچان چکا تھا۔

’’السلام علیکم سر......... فرمایئے.........‘‘

’’اوئے مصور۔ کیسے ہو تم! میں وصی ہوں بھئی.........‘‘ فرط مسرت سے میری آواز رندھ سی گئی۔ مصور میرے لڑکپن کا دوست تھا۔ چکوال شہر میں رہتا تھا اور میرے ساتھ ہی پڑھا بھی تھا اسے میری ہی خواہش پر شوگر مل کا ڈائریکٹر بنایا گیا تھا۔ مصور سے بات ہوتے ہی میں اس کے سلام کا جواب دینا بھی بھول گیا۔

’’وصی۔ کک‘ کون وصی.........‘‘ حیرت میں ڈوبی ہوئی آواز تھی۔

’’یار بہت ہی گھامڑ ہو۔ بھول گئے مجھے۔ ارے بھئی میں وصی الدین چغتائی ہوں.........‘‘

’’کیا.........‘‘ حیرت و مسرت سے بھرپور آواز سن کر میری مسرت بھی بڑھ گئی۔

’’تم......... تم کب آئے وصی‘ کہاں سے بول رہے ہو......‘‘ مصور کے لہجے میں بے پناہ مسرت تھی۔

’’گزشتہ شب پہنچا ہوں اور جمشید روڈ سے بول رہا ہوں۔ سناؤ بھائی میری امی اور ابا کیسے ہیں۔ میری بہنوں کا کیا حال ہے۔‘‘

’’سب کچھ بتلادوں گا۔ فی الحال تو کوئی وکٹوریہ پکڑو اور جس حال میں بھی ہو‘ مع سازو سامان کے علوی چیمبر صدر پہنچو۔ سیکنڈ فلور پر فلیٹ نمبر بیس میرا ہے۔ میں تمہاری بھابھی کو مطلع کئے دیتا ہوں۔ ہو سکتا ہے تمہارے پہنچنے سے پہلے ہی میں بھی پہنچ جاؤں......‘‘

’’یار مصور پہلے میرے پیاروں کے متعلق بتلاؤ......‘‘

’’پاگل ہوئے ہو۔ گھر پہنچو پھر تفصیل سے بتلاؤنگا......‘‘

’’سنو تو مصور۔ اتنا اور بتلادو کہ علوی چیمبر صدر میں کس طرف واقع ہے۔..

’’ریگل سینما کے سامنے روڈ پار کیفے ٹیریا ہے۔ مگر تم کیفے ٹیریا سے پہلے ہی دوسرا

سگنل پار کرنے سے پہلے اتر جانا .... "دوسری طرف سے سلسلہ منقطع ہو گیا اور میں نے بھی ریسیور رکھ دیا۔

☆☆☆☆

چونکہ میں نے ناشتہ بہت دیر میں لیا تھا اس لئے مصور کے بے حد اصرار کے باوجود لنچ نہ لے سکا۔ مصور اور اس کی بیوی صائمہ کھانے میں مصروف تھے اور میں ڈائننگ ٹیبل کی ایک خالی کرسی پر بیٹھا ہوا اپنے پیاروں کے متعلق سوچ رہا تھا۔

میں دو بجے علوی چیمبر پہنچ گیا تھا۔ مصور فٹ پاتھ پر ہی میرے انتظار میں کھڑا تھا۔ ہم دونوں دوستوں کا ملاپ اس قدر رقت انگیز تھا کہ فٹ پاتھ پر گزرنے والے لوگ بھی رک جاتے تھے۔ مجھے عجیب سی الجھن بھی ہو رہی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ مصور جلد ہی کھانے سے فارغ ہو جائے اور مجھے میرے پیاروں کے متعلق بتلائے نصف گھنٹے کے اُکتا دینے والے انتظار کے بعد کہیں جا کر مصور فارغ ہوا۔ ہم دونوں ڈرائنگ روم میں جا بیٹھے۔

"سب سے پہلے تو مجھے یہ بتلاؤ کہ میرے ابو کیسے ہیں۔ میری امی اور چاروں بہنوں کا کیا حال ہے...... "میں نے مسرت و بے چینی کی ملی جلی کیفیت میں پوچھا........

'......بتلادوں گا یار اتنی جلدی بھی کیا ہے...... "مصور سگریٹ سلگاتے ہوئے بولا۔

"پلیز مصور' خدارا میرے ضبط کا مزید امتحان نہ لو۔ تم نہیں جان سکتے کہ اس وقت میری کیا کیفیات ہیں...... "میں گھگھیایا۔

مصور نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ عجیب سی نظروں سے چند لمحے مجھے گھورتے رہنے کے بعد بولا۔

"میرے دوست' تم ایک فوجی ہو اور جنگ عظیم کا ایک زندہ جاوید کردار ہو۔ یقیناً فولادی اعصاب کے مالک ہو گے......"

"وہ......وہ تو میں ہوں ہی پر تم۔ تم کہنا کیا چاہتے ہو......

"جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں' اسے سننے کے لئے تمہیں بہت ہی ضبط سے کام لینا پڑے گا......"

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ عجیب سی کھوئی نظروں سے مصور کو دیکھتا رہا۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو چلی تھیں۔ میرے ذہن پر مصور کے الفاظ ہتھوڑے کی ضرب بن کر برسنے لگے تھے۔

''میں تمہیں اندھیرے میں نہیں رکھنا چاہتا'' چند لمحوں کی خاموشی کے بعد مصور نے کہنا شروع کیا وہ کافی سنجیدہ تھا۔

''سب سے پہلے میں تمہیں یہ بتلا دوں کہ تم...... تم اس دنیا میں اب بالکل تنہا ہو۔ نہ تو تمہارے دادا زندہ ہیں اور نہ ہی ماں باپ......''

''کیا......'' میں چیخ پڑا۔ میرے سر میں اس شدت سے چکر آیا کہ میری گردن ڈھلک گئی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے رگ و پے سے تمام لہو نچوڑ لیا گیا ہو۔

''حوصلہ پکڑو وصی الدین۔ اگر تم نے حوصلہ ہار دیا تو...... تو تمہارے بابا کی آخری خواہش کبھی پوری نہ ہو سکے گی......''

مصور کی آواز مجھے کوسوں دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔ میری آنکھوں کے گرد اندھیرے سے چھائے ہوئے تھے۔ ان اندھیروں میں میری ماں کا شفیق و مسکراتا ہوا چہرہ، میرے ابا جی کا مہربان اور سدا بہار سراپا مجھے صاف نظر آنے لگا تھا اور میری تمام حیات و جذبات سمٹ سمٹ کر میری آنکھوں کی طرف بڑھنے لگے تھے۔

''ان کے آخری الفاظ مجھے آج بھی یاد ہیں۔ وصی، وہ کہتے تھے کہ تمہارے دادا مرحوم نے ایک ایک کر کے تینوں شوگر ملیں چوہدری نظام کے ہاتھوں فروخت کر دی تھیں۔ وصی الدین، سن رہے ہو، میں کیا کہہ رہا ہوں......''

میری چونکہ گھگھی بندھ چکی تھی۔ میری آنکھوں سے آنسوؤں کا نہ رکنے والا سیلاب سا جاری تھا اس لئے میں منہ سے تو کچھ نہ بول سکا البتہ اقرار میں گردن ہلا دی تھی۔

''لیکن تمہارے والد صاحب محض اس وجہ سے غیر یقینی کیفیت میں مبتلا تھے کہ اگر شوگر ملیں فروخت کر دی گئی تھیں تو آخر کیوں اور یہ کہ وہ رقم کہاں ہے؟

میرے دوست وصی الدین۔ حالانکہ اخبارات میں یہ خبر تمہارے ابا کی فوٹو سمیت

شائع ہوئی تھی کہ رفیع الدین چغتائی نے معاشی حالات سے تنگ آکر خودکشی کرلی ہے' مگر مقتول دیالداس کا خیال تھا کہ انہوں نے خودکشی نہیں کی بلکہ انہیں قتل کیا گیا ہے' مگر یہ ثابت کون کرتا کہ انہیں قتل کیا گیا ہے۔"

"کیوں......" میں اپنی ہچکیوں کو روکتے ہوئے بولا۔

مصور کی معلومات نے میرا دوران خون تیز کر دیا تھا۔ میری کھوپڑی میں گویا لاوا سا پکنے لگا تھا۔

"کیا پولیس نے تحقیقات نہیں کی! پوسٹ مارٹم نہیں ہوا تھا......"

"سب کچھ ہوا تھا۔ میرے بھائی۔ پولیس نے تحقیقات بھی کی تھی اور پوسٹ مارٹم بھی ہوا تھا مگر قتل ثابت نہ ہو سکا۔ جانتے ہو کیوں"؟

میں نے پھر انکار میں گردن ہلا دی۔ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ میرے اعصاب میں ایک تناؤ سا بڑھ رہا تھا۔

"محض اس لئے کہ چوہدری نظام کا بڑا بیٹا چوہدری امام دین چکوال کا کمشنر ہے' اس سے چھوٹا چوہدری عبدالسلام سپرنٹنڈنٹ آف پولیس ہے' چوہدری بہرام ڈائریکٹر آف ریونیو ہے اور سب سے چھوٹا بیٹا چوہدری ارسلان ہے۔ عزتوں کا دشمن' ڈاکو' زانی اور شرابی۔ نہ جانے اس نے کتنے شریف خاندانوں کو زندہ درگور کر دیا ہے۔

دن رات چوہدری نظام کی حویلی میں انگریز افسران کی دعوتیں ہوتی رہتی ہیں انگریزوں کو خوش رکھنے کے لئے شراب پانی کی طرح استعمال کروایا جاتا۔ شریف خاندانوں کی بہو بیٹیاں اغوا کر کے انگریزوں کو پیش کر دی جاتی ہیں۔ جو عورتیں یا لڑکیاں بہت ہی غیور اور بے باک ہوتی ہیں انہیں غائب کر دیا جاتا ہے پتہ نہیں انہیں قتل کر دیا جاتا ہے یا ملک بدر کر دیا جاتا ہے......"

"کیا دیالداس کو بھی قتل کیا گیا تھا۔" میں نے رومال سے آنسو پونچھتے ہوئے پوچھا۔ میرے لبوں سے بدقت تمام الفاظ نکل رہے تھے۔

"ہاں' وہ اپنے ہی گھر میں مارا گیا۔ اسے بالکل کسی جانور کی طرح ذبح کر دیا گیا تھا۔

چونکہ اس کے عزیز و اقربا لکھنو گئے ہوئے تھے اس لئے قاتل کو تلاش ہی نہیں کیا گیا بلکہ اس قتل کو بھی خودکشی کا رنگ دے کر فائل بند کر دیا گیا......"

"مگر...... مگر کیوں" دیالداس کو کیوں قتل کیا گیا......؟

"میرے خیال سے صرف اسی وجہ سے کہ وہ چوہدری نظام اور اس کی حرکتوں کے بارے میں بہت کچھ جانتا تھا۔ اس نے ایک بار مجھ سے کہا بھی تھا کہ چغتائی فیملی چوہدری نظام کے ہاتھوں برباد ہو جائے گی۔ وہ کہتا تھا کہ اس کے پاس کچھ ایسے دستاویزی ثبوت ہیں جو چوہدری نظام اور اس کے چاروں بیٹوں کو مجرم ثابت کر سکتے ہیں......"

"کک۔ کیا دیالداس کی فیملی کا کوئی فرد یہاں کراچی میں موجود نہیں ہے؟"

"اس کی پوری فیملی موجود ہے میرے دوست......"

"کیا تم مجھے ان کا ایڈریس دے سکتے ہو......"

"سیدھا سا ایڈریس ہے۔ یہاں سے ٹرام میں بیٹھ جاؤ اور بولٹن مارکیٹ ٹرام اڈے پر اتر جاؤ۔ بولٹن مارکیٹ کی پشت پر پہاڑی پتھروں کی بنی ہوئی تین منزلہ بلڈنگ ہے۔ یہ بلڈنگ مقتول دیالداس کی ذاتی ملکیت ہے۔ اس کا بیٹا گوپال بولٹن مارکیٹ ہی میں فروٹ کا کاروبار کرتا ہے۔ مگر...... مجھے بتاؤ تم کرنا کیا چاہتے ہو......"

"ہو سکتا ہے مجھے وہاں سے کچھ ثبوت مل جائیں............" میں بڑی حد تک اپنی حالت پر قابو پا چکا تھا۔

"بیکار ہے میرے دوست تم انکل مرحوم کی یادداشت بک کا مطالعہ کرو ہو سکتا ہے تمہیں اس بک سے کچھ حاصل ہو جائے......"

"مم میری بہنیں اور میری ماں......" سوال کے ساتھ ہی میرے دل کی دھڑکنیں ایک بار پھر تیز ہو گئیں۔

"پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ تمہاری امی بھی زندہ نہیں ہیں۔ وہ شوہر کی موت کا سن کر ہی داعی اجل کو لبیک کہہ گئی تھیں۔ البتہ تمہاری دو چھوٹی بہنیں فوزیہ اور فرحین تمہارے خالو کے پاس بھلا کریالہ گاؤں میں ہیں......"

تک نہ ہوا تھا شاید اس لئے کہ میری رگوں میں خون کے بجائے لاوا دوڑ رہا تھا۔

یہ لفاظی نہیں بلکہ حقیقت ہے کہ میں ایسا خونخوار بھیڑیا بن چکا تھا جس کی پیاس چوہدری نظام' اس کے بیٹوں اور انہیں تحفظ فراہم کرنے والی شخصیات کے خون ہی سے بجھ سکتی تھی۔

''میرے دوست' میرے بھائی۔ مجھے ساتھ نہ لے جانے کی قسم دے کر تم نے میرے ساتھ زبردست زیادتی کی ہے......'' مصور مجھ سے بغلگیر ہوتے ہوئے بولا جب کہ وکٹوریہ کا کوچوان میرا سامان گاڑی میں رکھنے میں مصروف تھا۔

''کم از کم اسٹیشن تک جانے کی اجازت تو دیتے۔ بہر حال جاؤ' تمہیں اللہ کے سپرد کیا۔ اپنا خیال رکھنا اور ویسے ہی کرنا جیسے میں نے سمجھایا ہے......''

مصور کی نہ صرف آنکھیں بھر آئی تھیں بلکہ آواز بھی روہانسی تھی۔

''صاحب......'' کوچوان نے مجھے مخاطب کیا۔

''آپ میرے ساتھ بیٹھیں گے یا......''

''میں تمہارے ساتھ ہی بیٹھوں گا......'' کہتے ہوئے میں ایک بار پھر مصور سے بغلگیر ہوا اور رخصتی مصافحہ کر کے اچک کر کوچوان کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

پھر' جیسے ہی کوچوان نے لگام کھینچی گھوڑا اژدہے کی طرح پھنکارتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ اب ماحول پر اگر کوئی آواز بھاری پڑ رہی تھی تو وہ صرف اور صرف گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز تھی۔

پیراڈائز سینما کو عبور کر کے جیسے ہی ہماری گاڑی ریفیر سینما کے قریب ہونی شروع ہوئی' کوچوان نے مجھے مخاطب کیا۔

''چغتائی صاحب' اگر آپ کو سردی لگ رہی ہو تو......؟

''نہیں بھئی' میں تو خود کو جرمن نازیوں کی بھٹی میں محسوس کر رہا ہوں۔

کیا نام ہے تمہارا......'' میں اس کا جملہ اچکتے ہوئے بولا۔

''افراہیم نام ہے خادم کا۔ ایک بات پوچھوں صاحب......''

''تم۔ تم کچھ چھپا رہے ہو مصور۔ بے دھڑک ہو کر بتاؤ کہ میری دونوں بڑی بہنیں کہاں ہیں...... ''میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

''وہ..... وہ آپا سلیمہ اور آپا نسیمہ۔ کی ادھڑی...... ادھڑی ہوئی مم...... مادر زاد برہنہ لاشیں کھیکھ...... کھیتوں سے ملی تھیں......''

ایک بار پھر میرا ذہن تاریک ہو گیا۔ میرے وجود کا تمام خون سمٹ کر میری آنکھوں میں آ جما اور میرا دل...... یوں لگا جیسے میرے سینے کی ہڈیاں توڑ کر ابل پڑے گا۔

☆☆☆

اپنے پیاروں کے غم میں روتے روتے میری آنکھیں سوج گئیں۔ اگر مصور اور اس کی بیگم نہ ہوتے تو شاید میں پاگل ہو جاتا۔ وہی مجھے تسلیاں دیتے رہے اور میرے حوصلے بڑھاتے رہے تھے۔ مصور رات کے نو بجے تک مجھے گھماتا رہا۔ ایمپریس مارکیٹ 'فریئر ہال' ریس کورس اور کلفٹن جیسے پر فضا مقامات کی سیر بھی میرے دل کا بوجھ ہلکا نہ کر سکی۔ رات ہی میں نے کینٹ اسٹیشن پر اپنے لئے جہلم تک کی سیٹ بمع برتھ بک کروالی تھی صبح سات بجے خیبر میل سے مجھے روانہ ہونا تھا۔

رات بھر میں سو نہ سکا ابو اور امی کی موت میری دونوں بڑی بہنوں کا بہیمانہ قتل میرے خریف ضبط کو پارہ پارہ کر چکا تھا۔ میں نے ایک خوفناک فیصلہ کر لیا تھا مگر 'اس فیصلے پر عمل کرنے سے پہلے مجھے اپنی دونوں چھوٹی بہنوں کو سینے سے لگا کر خوب پیار دینا تھا۔ !نہیں یقین دلانا تھا کہ میں ہی ان کا باپ ہوں اور ماں بھی۔

صبح چھ بجے مصور ایمپریس مارکیٹ کے تانگہ اسٹینڈ سے ایک وکٹوریہ گاڑی پکڑ لایا تھا۔

کہر بدستور پورے ماحول پر چھائی ہوئی تھی۔ گو کہ صبح کے چھ بج رہے تھے مگر لگتا یوں تھا کہ نصف شب کا وقت ہو۔ اگر مرغان سحر اور مسجدوں سے آذانوں کی آوازیں نہ ابھر رہی ہوتیں تو صبح کا یقین ہی نہ ہوتا۔

کوچوان ایک دراز قد اور قوی ہیکل جوان تھا۔ ٹھنڈک سے بچنے کے لئے اس نے سیاہ رنگ کی بڑی اونی چادر اپنے جسم کے گرد لپیٹی ہوئی تھی۔ مجھے شدید سردی کا احساس

"پوچھو افراہیم بابصد سو باتیں پوچھو ....."

"شکریہ صاحب۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ ماحول پر ظلمت کا اندھیرا چھایا ہوا ہے۔ کہر کے گہرے بادلوں نے سونے پر سہاگے کا کام کر دیا ہے۔ اس کے باوجود آپ کا چہرہ آگ کی طرح دہک رہا ہے اور آنکھوں سے شعلے سے نکلتے ہوئے محسوس کر رہا ہوں۔ کیا آپ کسی خاص صدمے سے دوچار ہیں

"بہت اچھا کیا مجھ سے ایسا سوال کر کے.........." میں نے ماحول پر اچٹتی سی نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ اب ہماری گاڑی جی جی ہاؤس کو عبور کر کے پیلس سینما والے روڈ پر مڑ گئی تھی۔

"میں چاہتا ہوں کہ میرے جذبات شعلہ جوالا بنے رہیں۔ افراہیم' میں جنگ عظیم کا ایک ایسا اجڑا ہوا خانماں برباد سپاہی ہوں جس کے پاس دنیا کی ہر نعمت ہونے کے باوجود کچھ بھی نہیں ہے......"

"حوصلہ نہ ہاریں صاحب' اللہ آپ کے ساتھ ہے۔ آپ اپنے مقصد میں ضرور کامیاب ہوں گے......"

باتیں ہوتی رہیں اور فاصلہ گھٹتا رہا۔ ہماری وکٹوریہ اب فریئر ہال کے پشتی سنسان اور آسیبی ماحول سے گزر کر کینٹ اسٹیشن روڈ پر بڑھ رہی تھی۔ "شکریہ افراہیم۔ میں تمہیں یاد رکھوں گا......"

مختصر سا جواب دے کر میں آپا سلیمہ اور آپا نسیمہ کے بہیمانہ قتل میں الجھ گیا اس طرح کینٹ اسٹیشن پہنچنے تک ہمارے درمیان اور کوئی بات نہیں ہوئی۔

وکٹوریہ کے رکتے ہی ایک بھاری بھر کم سرخ وسفید قلی بڑی تیزی سے اتر کر گاڑی کی طرف بڑھا۔

"یہ لو افراہیم......" میں نے اوور کوٹ کی جیب سے پانچ کا نوٹ کھینچ کر کوچوان کو دیتے ہوئے کہا۔

اس دور میں پانچ روپے بڑی اہمیت رکھتے تھے۔ ایک سرکاری ملازم کی ماہانہ تنخواہ بارہ

روپے ہوا کرتی تھی۔

"چغتائی صاحب اس رقم کی جائے آپ اپنا جوتا کھینچ کر میرے منہ پر مار دیتے تو بہتر تھا........" افراہیم غالباً ناراض ہو گیا۔

"کیوں میرے دوست۔ اگر یہ کم ہیں تو اور لے لو......"

"خدارا خاموش ہو جائیے صاحب۔ دوست بھی کہتے ہیں اور...... جائیے صاحب اللہ آپ کو خوشیاں نصیب کرے۔ شرجیل........" مجھے جواب دے کر افراہیم اچانک قلی سے مخاطب ہوا۔

"چغتائی صاحب ہمارے دوست اور خاص مہمان ہیں۔ انہیں کمپارٹمنٹ میں کوئی تکلیف نہ ہونے پائے......" جملے کے اختتام تک افراہیم وکٹوریہ سے اتر پڑا تھا اور اپنائیت کے بھرپور انداز میں مجھ سے بغلگیر ہو گیا۔

پھر پلیٹ فارم نمبر دو پر خیبر میل کے فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ میں پہنچنے تک پونے سات بج چکے تھے۔ گو کہ سورج طلوع نہیں ہوا تھا' تاہم اندھیرا ابھی نہ تھا۔ کہر بھی بڑی حد تک چھٹ چکی تھی لیکن ٹھنڈک کا یہ عالم تھا کہ ہر پسنجر تھر تھر کانپ رہا تھا۔ خوانچے والے بھی انگیٹھیوں سے گرمائش حاصل کر رہے تھے۔

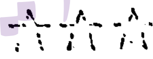
"ہاں بھئی۔ کیا تم بھی محنتانہ لینے سے انکار کرو گے......" میں برتھ پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

کمپارٹمنٹ میں کل چار برتھ تھے۔ کھلا اور آرام دہ۔ ایک پر تو میرا قبضہ تھا جب کہ تینوں برتھ ہنوز خالی تھے۔

کس بات کا محنتانہ صاحب۔ کیا آپ نے افراہیم کے الفاظ نہیں سنے تھے کہ آپ ہمارے دوست اور خاص مہمان ہیں......" قلی نے خادمانہ انداز میں جواب دیا اور پھر انجن کی پہلی سیٹی کے ابھرنے تک اس نے کچھ ایسی باتیں کیں کہ میں اپنا غم بھول کر ہنسنے پر مجبور ہو گیا۔ پھر' دوسری اور تیز سیٹی کی آواز کے ساتھ ہی قلی رخصت ہو گیا۔ ٹھیک اسی لمحے خیبر میل کا انجن قدیم زمانے کے ڈائنوسور جانور کی طرح چنگھاڑا۔

"میرا نام شرجیل ہے چغتائی صاحب یاد رکھیے گا۔ اللہ نگہبان"

قلی کے آخری الفاظ ختم ہو گئے اور پلیٹ فارم پیچھے ہٹتا چلا گیا۔ ذرا سی دیر میں پلیٹ فارم پیچھے رہ گیا۔ جیسا کہ خیبر میل کی رفتار ہر گزرتے لمحے کے ساتھ بڑھتی جا رہی تھی اس لئے برف سے کہیں بڑھ کر سرد ہوا ناقابل برداشت ہونے لگی۔ اس کے علاوہ فولادی پٹڑیوں اور پہیوں کی رگڑ سے اٹھنے والی آوازیں بھی دماغ کی چولیں ہلائے دے رہی تھیں لہٰذا میں نے روشن کوریڈور پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالی اور کمپارٹمنٹ کا دروازہ بند کر کے جیسے ہی گھوما، میرا ذہن بھک سے اڑ کر رہ گیا۔



وجہ بھی معقول تھی میری برتھ سیٹ کی سامنے والی سیٹ پر سیاہ وریشمی کپڑے کے ایرانی ٹائپ برقعے میں لپٹی ہوئی کوئی عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ اپنی سیٹ پر بالکل تنہا تھی البتہ اس کے برابر والی سیٹ پر ایک باریش نورانی صورت بزرگ بیٹھے تھے۔ وہ سر تا پا سبز لباس پہنے ہوئے تھے۔ ان کی آنکھیں بند تھیں مگر ان کے ہونٹ مسلسل حرکت کر رہے تھے جیسے وہ کسی ورد میں مصروف ہوں۔

ان کے سامنے والی برتھ سیٹ پر ایک جوان العمر تیکھے نقوش رکھنے والا خوب صورت سا جوان بیٹھا تھا۔ عمر کے لحاظ سے وہ مجھ سے چار پانچ برس ہی بڑا تھا۔

"السلام علیکم ساتھیو..........." آن واحد میں اپنی ذہنی کیفیت پر قابو پاتے ہوئے میں نے سلام کیا۔

"وعلیکم السلام........." بزرگ اور اس شخص نے بیک زبان جواب دیا۔ ہو سکتا ہے سیاہ برقعے والی خاتون نے بھی جواب دیا ہو مگر اس کی آواز میں نے نہیں سنی۔

"آجاؤ بیٹے بیٹھ جاؤ۔ کیا تمہیں بہت سردی لگ رہی ہے....." بزرگ نے نہایت شفیقانہ لہجے میں کہا۔

"جی جی......جی ہاں بابا..........." مختصر سا جواب دے کر میں اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ میں نے اپنا سر سیٹ کی پشتگاہ سے ٹکا دیا اور آنکھیں موند لیں۔ اس بات کا احساس

ہوتے ہی کہ کمپارٹمنٹ میں' میں تنہا نہیں ہوں' مجھے قدرے سکون ملا۔ سکون حاصل ہوتے ہی سب سے پہلے جو احساس میرے ذہن میں پیدا ہوا وہ یہ تھا کہ یہ برقع پوش خاتون' یہ بزرگ اور یہ نوجوان کون ہیں۔ کمپارٹمنٹ میں کب اور کہاں سے داخل ہوئے جب کہ میں واحد داخلی وخارجی دروازے پر کھڑا ہوا تھا۔

ابھی میں اس قدر ہی سوچنے پایا تھا کہ اچانک ایک نیا خیال مجھے جھنجھوڑنے لگا وہ یہ کہ نوجوان نے مجھے میری کاسٹ سے مخاطب کیا تھا۔ صرف یہی نہیں بلکہ نوجوان نے قلی سے بھی اس طرح باتیں کی تھیں جیسے ان میں بہت پرانی شناسائی ہو۔ پھر یہ کہ قلی نے بھی تو مجھے میری کاسٹ سے مخاطب کیا تھا۔ ان کے نام بھی تو عجیب تھے افراہیم اور شرجیل۔

"کیا سوچ رہے ہو بیٹے........." بزرگ کی آواز نے میری سوچ میں دراڑیں ڈال دیں۔ میں نے آنکھیں کھول دیں اور زیر لب مسکرا دیا۔

اس وقت تک خیبر میل رفتار پکڑ چکی تھی۔ گو کہ کمپارٹمنٹ ساؤنڈ پروف تھا اس کے باوجود پٹریوں اور پہیوں کے ٹکر کی آوازیں میرے ذہن پر ہتھوڑے سے برسا رہی تھیں اور کمپارٹمنٹ کی اونگھتی ہوئی روشنی مجھے نروس کئے دے رہی تھی۔ ہلکورے مجھے الگ پریشان کئے ہوئے تھے۔

"کک...... کچھ نہیں باباجی' کچھ بھی تو نہیں......" میری زبان لڑکھڑا گئی۔

"ایک بات بتاؤ بیٹے۔ کیا تم عماد الدین چغتائی کے پوتے اور رفیع الدین چغتائی کے بیٹے وصی الدین ہو......؟" بزرگ نے پوچھا۔

اور میرے ذہن پر بیک وقت ہزاروں ناقوس بجنے لگے۔ میری آنکھوں کے گرد ہزاروں رنگین ستارے سے لہرانے لگے تھے۔ داداجی اور اباجی کا نام سنتے ہی میری تمام حسیات میری آنکھوں میں سمٹ آئیں۔ میں نے اقرار میں گردن ہلادی۔

"تم سوچ رہے ہوگے کہ میں نے تمہیں کیسے پہچانا تو اس کی وجہ تمہارا حسن' قد کاٹھ اور شکل وصورت ہے۔ تم عماد الدین مرحوم کے بالکل ہم شکل ہو۔ میں چودہ سیدن شاہ کا رہنے والا ہوں اور بابا سیدن شاہ کی درگاہ کا سجادہ نشین ہوں۔

تمہارے دادا اور والد صاحب مرحوم اکثر درگاہ پر سلامی بھرتے تھے' اللہ کے نام پر حلال جانور تمہارے لئے صدقہ کرتے' غرباء اور مساکین کی خفیہ طور پر مدد کرتے اور زائرین کے کھانے پینے اور رہائش کا انتظار کرتے تھے ان کے لبوں پر صرف ایک التجا ہوتی کہ تم شادو سلامت رہو........

دوران گفتگو میری آنکھیں ساون بھادو کی طرح چھلکنے لگی تھیں۔ میری سانس گویا ٹوٹنے لگی تھی۔

''رولو۔ جس قدر رونا ہے رولو میرے بیٹے اس لئے کہ تمہیں بہت ہی صبر آزما حالات سے گزرنا ہے۔ تمہارا مقابلہ تین طرح کے دشمنوں سے ہونا ہے۔ اول چوہدری نظام اور اس کے بیٹے' دوم انگریز اور سوئم بدی کی قوتیں۔

سنو بیٹے۔ الحمد اللہ کہ ہم مسلمان ہیں۔ ہمارا مذہب ہمیں حکم دیتا ہے کہ اگر کر سکتے ہو تو دشمن کو معاف کردو اور اگر معاف نہیں کر سکتے تو آنکھ کے بدلے آنکھ اور جان کے بدلے جان......''

''بابا......'' میں اپنی کنپٹیاں اپنی ہی ہتھیلیوں سے دبا کر تقریباً چیخ پڑا۔

''مم...... میں کسی کو معاف نہیں کروں گا بابا بلکہ تمام دشمنوں کو خس و خاشاک کی طرح بہالے جاؤں گا.....

''اللہ تمہاری مدد کرے گا بیٹے.....

یہ تھے بابا کے آخری الفاظ۔ چونکہ میں رومال سے اپنے آنسو خشک کر رہا تھا اس لئے بابا کی طرف توجہ نہ دے سکا تھا اور جب میں نے سر اٹھایا تو بابا اپنی سیٹ سے اور جوان العمر شخص اپنی سیٹ سے حرف غلط کی طرح غائب تھے۔

☆☆☆

برقعہ پوش خاتون گٹھڑی بنی بدستور میرے سامنے والی سیٹ پر بیٹھی تھی۔ میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے کمپارٹمنٹ کا جائزہ لے رہا تھا۔ میرا دل ہندروالے کی ڈگڈی کی طرح دھک دھک کر رہا تھا اور میرا پورا وجود شاخ بریدہ کی طرح کانپ رہا تھا۔

"کافی پئیں گے آپ........." ایک مترنم اور کانوں میں رس گھولتی آواز سن کر حیرت انگیز طور پر میرے رگ و پے میں کیف و سرور کی لہریں سی دوڑ گئیں۔

وہ۔ وہی برقعہ پوش خاتون تھی۔ اس نے نقاب الٹ دیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں بھاپ اڑاتی کافی کی پیالی تھی۔

میری آنکھیں اس کے ضیاء پاش حسن سے پتھرا کر رہ گئیں۔ بلا شبہ وہ مصور قدرت کا شاہکار تھی۔ اگر میں شاعر ہوتا تو اس کے حسن' اس کے ہونٹوں اور اس کی آنکھوں کی تعریف میں کئی دیوان لکھ دیتا۔ بلا مبالغہ یوں جیسے گہری سیاہ بدلیوں سے چاند نکل آیا ہو۔

وہ مسکرا رہی تھی بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ وہ میرے خرمن حیات پر برقیں سی گرا رہی تھی۔ یاقوت کی طرح اس کے سرخ لب مجھے میرے دل میں چبھتے ہوئے محسوس ہوئے۔ میں مبہوت سا ہو گیا۔

حالانکہ یورپ میں میں نے ایک سے بڑھ کر ایک چہرہ دیکھا تھا مگر میرے سامنے بیٹھی ہوئی خاتون ان سب پر سبقت رکھتی تھی۔

"کہاں کھو گئے آپ' کافی لیجئے میرے ہاتھ تھک گئے ہیں........" اس کے لبوں سے سرور آور آواز نکلی۔ وہ بدستور مسکرا رہی تھی۔

"اف' فوہ....." میرے لبوں سے جھلسا دینے والی سانس نکلی اور میں نے کپکپاتے ہاتھ سے پیالی پکڑ لی۔ اس طرح کہ میرا ہاتھ اس کی مخروطی انگلیوں سے ٹکرا گیا۔

ایسا ہوتے ہی میرے لہو میں' میرے پورے وجود میں حرارت سی سرایت کر گئی۔ سردی کا احساس تک مٹ کر رہ گیا۔

"شکریہ محترمہ......" میں بدقت تمام کہہ سکا۔

"کیا میں آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں......"

"میرا نام گنزا ہے اور کچھ......" وہ کھلکھلا اٹھی۔

"جی ہاں۔ میرے لئے یہ حیرت انگیز بات ہے کہ آپ تنہا سفر کر رہی ہیں......"

"میں تنہا کہاں ہوں چغتائی صاحب۔ آپ جو میرے ساتھ ہیں......" گنزا نے بدستور

مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''وہ تو ٹھیک ہے مس گنزا پھر بھی آپ کا تنہا ہونا حیرت انگیز ہے۔ میں زیادہ سے زیادہ جہلم تک آپ کا ساتھ دے سکتا ہوں......''

''یہ تو آنے والا وقت ہی بتائے گا۔ بہر حال آپ کافی پئیں میں ابھی حاضر ہوئی............'' کہتے ہوئے گنزا کسی ناگن کی طرح بل کھاتی ہوئی اٹھی اور تالاب میں تیرتی ہوئی گولڈ فش کی طرح لہراتی چلی گئی۔ اس کا رخ ٹوائلٹ کی طرف تھا پھر جیسے ہی گنزا ٹوائلٹ میں داخل ہوئی' ایک باوردی ٹکٹ چیکر کمپارٹمنٹ میں داخل ہوا۔

''گڈ مارننگ بابو صاحب......ٹکٹ دکھلایئے......''

''مارننگ بابو صاحب۔ بابو یا ٹی ٹی تو آپ ہیں......'' میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ پھر اوور کوٹ کی جیب سے ٹکٹ نکال کر ٹی ٹی کو تھما دیا۔

ٹکٹ چیکر کے انداز سے لگتا تھا کہ وہ میری شخصیت اور لباس سے بہت متاثر ہو گیا ہے۔

''کیا آپ تنہا ہیں صاحب......'' ٹکٹ چیکر پنچ کیا ہوا ٹکٹ مجھے دیتے ہوئے بولا۔

''کیا آپ کو میرے علاوہ کوئی اور نظر آرہا ہے......'' میں نے بالکل غیر ارادی طور پر جواب دیا۔ حالانکہ مجھے گنزا کی طرف سے فکر لاحق ہو گئی تھی۔

''نہیں تو' پھر بھی ہم امکانی کوشش ضرور کرتے ہیں......'' جواب کے ساتھ ہی وہ ٹوائلٹ کی طرف بڑھ گیا اور میرا دل دھک سے ہو کر رہ گیا میں کوشش کے باوجود اسے روک نہ سکا۔ مجھے یوں لگا جیسے میری زبان تالو سے چپک گئی ہو۔

میں نے بوکھلا کر گنزا کی بیڈ سیٹ کی طرف دیکھا۔ پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ گنزا کی سیٹ پر نہ تو اس کا کوئی سامان ہے اور نہ ہی پیالی جس میں گنزا نے مجھے کافی دی تھی۔

اچانک' ٹکٹ چیکر کی چیخ نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے دیکھا چیکر کا چہرہ فرط خوف سے ہلدی کی طرح زرد ہو چکا ہے۔ اس کی آنکھیں پھیل کر بے جان سی ہو گئی ہیں۔

''کک' کیا ہوا بابو......'' میں نے دھڑکتے دل سے پوچھا مگر وہ کوئی جواب دیئے بغیر

محاورتاہی نہیں حقیقتاً سر پر پیر رکھ کر بھاگ کھڑا ہوا۔

میں کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں سر جھٹک کر جیسے ہی ٹوائلٹ کی طرف بڑھا' اچانک ہی دروازہ کھلا اور گنزا کا مسکراتا چہرہ نمودار ہوا۔

''کیا بات ہے وصی صاحب' آپ پریشان لگ رہے ہیں......'' گنزا اپنی سیٹ کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔

''مم' میرا دماغ پھٹنے لگا ہے گنزا......'' میں دونوں ہاتھوں سے اپنی کن پٹیاں دباتے ہوئے بولا۔

''اپنی سیٹ پر بیٹھ جایئے اور بتایئے آپ کو کیا پریشانی ہے......''

''سب سے پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ تم کون ہو۔ کہاں رہتی ہو' کہاں سے لوٹی ہو اور کہاں جارہی ہو......''

''یا اللہ خیر۔ ایک ہی سانس میں آپ نے اتنے سارے سوالات کر دیئے۔ تاہم میں آپ کے ہر سوال کا جواب دوں گی۔ اَب ذرا ہوشیار ہو جایئے۔ کوٹری جنکشن پر گاڑی رک جائے گی اور ریلوے پولیس اس کمپارٹمنٹ پر دھاوا بول دے گی۔

''اوہ۔ مم مگر تمہیں کیسے معلوم ہوا......''

''میں نے کہاں ناں کہ آپ کی ہر الجھن دور کر دوں گی۔ فی الحال آپ حالات کا سامنا کریں......'' گنزا کا جملہ مکمل ہوا ہی تھا کہ انجن کی تیز سیٹی کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ اس کے ساتھ ہی میل ٹرین کی رفتار گھٹنے لگی۔ گھٹتی گئی۔ گھٹتی گئی اور...... پھر ایک جھٹکے سے ٹرین رک گئی۔

میں الجھی ہوئی نظروں سے گنزا ہی کو گھور رہا تھا۔ اس کے لبوں پر ملکوتی تبسم کھیل رہا تھا۔

اچانک بھاری جوتوں کی دھمک محسوس کر کے میں دروازے کی طرف مڑا' ابھی میں نے ایک قدم بھی نہیں اٹھایا تھا کہ ایک دم سے دروازہ کھلا اور ایک باوردی پولیس انسپکٹر آیا۔ اس کے ہمراہ بہت سے پولیس والے بھی تھے اور ٹکٹ چیکر بھی۔

پولیس والے سر پر خاکی کپڑے کی پگڑیاں باندھے ہوئے تھے۔ اس دور میں پینٹ کی جائے پولیس کو (نیکر) سِلائی کی جاتی تھی۔

"کیا بات ہے انسپکٹر' آپ مجھے اس طرح کیوں گھور رہے ہیں.........." میں سراپا احتجاج بن گیا۔ میرے ذہن سے گنزا کا خیال بالکل اتر گیا تھا۔

"ابھی بتلاتا ہوں......" کہتے ہوئے انسپکٹر ٹوائلٹ کی طرف بڑھ گیا جب کہ گرم اوور کوٹوں میں ملبوس کانسٹیبل میرے گرد گھیرا ڈال چکے تھے اور ٹکٹ چیکر میری طرف دیکھ کر طنزیہ مسکرا رہا تھا۔

چند لمحے ٹوائلٹ کا جائزہ لینے کے بعد انسپکٹر جھلاہٹ میں ٹکٹ چیکر کی طرف متوجہ ہوا۔

"کہاں ہے لاش۔ کہاں ہیں خون کے دھبے......"

انسپکٹر کے الفاظ سن کر میرا دل دھک سے ہو کر رہ گیا جب کہ ٹکٹ چیکر کے چہرے پر ہوائیاں سی اڑنے لگی تھیں۔

"مم' باتھ روم ہی میں تھی۔ کوئی عورت تھی اور اس کا نرخرہ کٹا ہوا تھا جس سے خون بہہ رہا تھا......"

"اسی لئے سیانے کہتے ہیں کہ ڈیوٹی اوقات میں شراب نہیں پینی چاہئے۔"

انسپکٹر کے کچھ کہنے سے پہلے میں نے ٹکٹ چیکر کو مخاطب کیا۔ میں ویسے بھی مطمئن ہو گیا تھا اس لئے کہ گنزا اپنی سیٹ پر نہیں تھی۔ اس کی شخصیت میری نظروں میں بہت ہی پراسرار ہو چکی تھی۔ نہ جانے کیوں مجھے یقین سا ہو چلا تھا کہ کچھ پراسرار شخصیات اللہ کے حکم سے میری مدد کر رہی تھی۔

"مم' میں شراب نہیں پیتا......" ٹکٹ چیکر غصیلی آواز میں بولا۔

"تو پھر کہاں ہے لاش۔ ٹوائلٹ میں خون کا ایک قطرہ بھی نہیں ہے۔ سب سے اہم یہ کہ ٹوائلٹ اس طرح خشک پڑا ہے جیسے کئی گھنٹوں سے استعمال نہ کیا گیا ہو......" انسپکٹر ٹی ٹی پر برس پڑا۔

''میں جھوٹ نہیں کہہ رہا۔ میں نے جو کچھ دیکھا تھا وہی بتایا ہے۔''

''سوری محترم۔ بلاوجہ آپ کو زحمت دی۔ .... ''انسپکٹر مجھ سے مخاطب ہوا اور ماتحتوں کو اشارہ کرتے ہوئے کمپارٹمنٹ سے نکلا چلا گیا۔

چونکہ صبح کے ساڑھے نو بج رہے تھے' بیرونی مناظر پر سورج پورے آب و تاب سے چمک رہا تھا اس لئے بوگی کوری ڈور اور پھر کمپارٹمنٹ میں اچھی خاصی روشنی تھی۔ اشیائے خورد و نوش بیچنے والوں کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔

جو کچھ بھی تھا میں دروازہ بند کر کے جیسے ہی گھوما گنز اہیڈ سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی۔

''تم ہو کون' کیا ہو تم۔ کیوں مجھے پریشان کر رہی ہو ....'' میری جھلاہٹ عود کر آئی۔

ٹھیک اسی لمحے خیبر میل کی سیٹی میری سماعت سے ٹکرائی۔

''دوشیزہ ہوں' وصی صاحب۔ قوم جنات سے ہوں' اور آپ کے والدین کی دعاؤں کا ثمر ہوں ....'' گنزا نے ملکوتی تبسم کے ساتھ جواب دیا اور مسلسل کہتی رہی۔

''جنگ کے میدانوں میں' جب آگ' خون اور بارود کے طوفان اٹھ رہے تھے' اس وقت بھی ہم آپ کے ساتھ تھے۔ جنرل بیڈل اسمتھ نے جو کچھ بھی آپ کو دیا ہے وہ اپنی مرضی یا خوشی سے نہیں دیا' بلکہ وہ آپ کو قتل کر کے آپ کی تمام قیمتی اشیاء پر قابض ہونا چاہتا تھا' مگر میں اس کے وجود میں داخل ہو چکی تھی اور میں نے ہی آپ کو سب کچھ دلوایا ہے۔ ایئرپورٹ پر ڈرائیور کے روپ میں کوچوان اور قلی کے روپ میں آپ کی مدد کرنے والے بھی جن تھے جنہیں آتشی مخلوق کہا جاتا ہے۔ آپ کے بیڈ روم کا دروازہ میں نے تھپتھپایا تھا تاکہ آپ بیشک سوتے رہیں مگر آپ کا ذہن جاگتا رہے۔

ہم سب ایک لافانی قوت کے زیر اثر آپ کی معاونت پر مامور ہیں۔ ایک بزرگ و برگزیدہ شخصیت آپ کی اور ہماری پشت پر موجود ہے۔ آپ ان سے مل چکے ہیں۔ محض آپ کی حوصلہ افزائی ہی کی خاطر ظاہر ہوئے تھے ....'' جملے کے اختتام تک ٹرین نہ صرف یہ کہ کوٹری جنکشن چھوڑ چکی تھی بلکہ دریائے سندھ کے آہنی برج کو عبور کر رہی تھی۔

میرا منہ فرط حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا تھا۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ میری تمام الجھنیں

مٹ چکی تھیں۔

"وصی الدین صاحب' آپ کو بہت محتاط رہنا پڑے گا۔ آپ کے لئے نہ صرف یہ کہ چوہدری نظام اور اس کے بیٹے آزمائشوں کے پہاڑ کھڑے کر دیں گے بلکہ فرنگی' ہندو اور سکھ عملدار بھی آپ کی جان کے دشمن بن جائیں گے سب سے اہم ترین مقابلہ بد روحوں اور دیومالائی قوتوں سے کرنا پڑے گا۔ لہٰذا پھونک پھونک کر قدم اٹھایئے گا۔ اب آپ حیدر آباد سندھ کا اسٹیشن گزر جانے کے بعد اطمینان سے اپنے والد صاحب کی ڈائری پڑھیں گے۔ مجھے یقین ہے آپ آئندہ لائحہ عمل مرتب کرنے میں آسانی محسوس کرینگے..........."



پانچ منٹ حیدر آباد ریلوے اسٹیشن پر ٹھہرنے کے بعد خیبر میل منزل کی طرف چل دی۔ ان پانچ منٹوں میں میرے کمپارٹمنٹ میں دو عورتیں' ایک مرد اور تین معصوم بچے سوار ہوئے تھے۔ وہ سب اونی لباس پہنے اور اونی شالیں اوڑھے ہوئے تھے۔

مرد جواں سالہ تھا اور میرے سامنے والی بیڈ سیٹ پر بیٹھ گیا تھا۔ گنزا غائب ہو چکی تھی۔ دونوں عورتیں بہت ہی خوبصورت اور زیورات سے آراستہ تھیں ان کی باہم گفتگو سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ پنجابی ہیں اور آزاد و خوش حال گھرانے سے تعلق رکھتی ہیں۔ جوان العمر شخص اور دونوں عورتیں مجھ سے کافی متاثر معلوم ہو رہی ہیں۔ میں چونکہ فلیٹ ہیٹ کا گوشہ پیشانی کی طرف جھکائے یادداشت بک پر بے مقصد نظریں دوڑا رہا تھا' اس لئے جوان العمر شخص عورتوں اور بچوں ہی سے مخاطب تھا۔

"فرش صاف ستھرا ہے۔ بہتر ہے کہ بچوں کا بستر نیچے ہی لگا دیا جائے۔"

"ابھی نہیں بھیا۔ ابھی تو دن ہے۔ جیسے ہی ہم ڈنر سے فارغ ہونگے۔ بچوں کے لئے بستر لگا دینگے......" ایک خاتون بولیں۔ وہ پنجابی ہی میں باتیں کر رہے تھے۔ انہیں کیا معلوم کہ میں بھی پنجابی ہوں۔

"بھائی صاحب......" اچانک جوان آدمی نے مجھے متوجہ کیا۔

''مداخلت کی معافی چاہتا ہوں...... '' وہ بہترین انگلش بول رہا تھا۔

''جی نہیں محترم۔ معافی کی کیا بات ہے۔ فرمائیے میں ہمہ تن گوش ہوں۔'' میں نے بھی انگلش میں جواب دیا۔ میرا لہجہ اہل زبان کی طرح تھا۔

''کیا میں آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں ....''

''خادم کو وصی الدین کہتے ہیں......'' میں نے ایک دم سے پنجابی زبان میں جواب دیا۔

میری اس تبدیلی نے دونوں خواتین کو بھی متوجہ کر لیا تھا۔

''اوہ۔ تو آپ اپنے ہی ہیں۔ میں تو آپ کو انگریز سمجھے ہوئے تھا۔''

''میرا نام اختر نواز ہے۔ یہ میری بہن اور میری بھابھی ہیں۔ یہ تینوں بچے میرے بھائی کے ہیں......''

تعارف کے ساتھ ہی علیک سلیک کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ذرا سی دیر میں ہم اس قدر بے تکلف ہو گئے کہ اجنبیت کا احساس تک نہ رہا۔ میرے مکمل تعارف کے بعد جنگ عظیم کے چند اہم واقعات مجھے بتلانے پڑ گئے۔ لنچ ہم نے ایک ساتھ ہی لیا تھا۔ اسی طرح مسافت ہوتی رہی۔ آہستہ آہستہ کمپارٹمنٹ میں اندھیرا ہوتا گیا اور عین مغرب کے وقت روشنیاں جاگ اٹھیں۔

ہم نے آٹھ بجے ڈنر لیا۔ پھر کافی کا دور چلا اور پھر نو بجے شب تک وہ سب گرم کمبلوں میں سمٹ کر سو گئے۔

میں بھی اپنے بیڈ پر دراز ہو گیا اور ابا کی یادداشت بک کے مطالعے میں مصروف ہو گیا۔ ٹھنڈ اس قدر بڑھ چکی تھی کہ مجھے بھی کمبل کا سہارا لینا پڑ گیا۔

گڑگڑاہٹیں جاری رہیں ہلکورے لگتے رہے اور میں کمپارٹمنٹ کی ملگجی روشنی میں ابا جی کی مرتب کردہ ڈائری کے اوراق پڑھتا رہا۔ دوران مطالعہ میرے سینے پر جوار بھاٹا سا چھا جاتا' میری سسکیاں نکل جاتیں۔ آنکھوں سے آنسوؤں کی دھاریں بہنے لگتیں۔ کبھی میں مسکرا پڑتا' کبھی فرط غضب سے میرے وجود میں انگارے سے دوڑنے لگتے۔ عجیب کیفیت تھی میری میں خود کو لق و دق صحرا میں بھٹکتا ہوا محسوس کرتا اور کبھی حقیر تنکے کی طرح خود

کو خلاؤں میں ڈولتا ہوا محسوس کر تا رفتہ رفتہ مگر بڑی تیزی سے الجھی ہوئی گتھیاں سلجھتی چلی جا رہی تھیں۔ مجھ پر واضح ہو تا گیا کہ میرے دادا جی اور ابا جی مجھے میرے گاؤں سے کیوں دور بھیجنا چاہتے تھے۔

اوراق پلٹتے پلٹتے میری نیند غائب ہو چکی تھی میری رگوں میں خون کی جائے لاوا سا دوڑنے : لگا تھا۔ میں اس قدر بے چین ہو گیا کہ کمبل جھٹک کر اٹھ بیٹھا میری سانس گویا اکھڑ رہی تھی۔ میں امریکی جنرل، ہیڈل اسمتھ سے زیادہ خونخوار بھیڑیا بن چکا تھا۔

''اوں ہوں......'' اچانک میری سماعت سے مترنم سی نسوانی آواز ٹکرائی۔ میں نے چونک کر باتھ روم کی جانب دیکھا۔ دیکھتے ہی میرے اعصاب کا تناؤ ماند پڑ گیا۔

وہ گنزا تھی میرے گاؤں کی الہڑ دوشیزہ کا سا لباس پہنے مسکرا رہی تھی اس کا زیر جامہ زرق برق شرارے پر مشتمل تھا؛ در کمر سے اوپر ویسا ہی بھڑکدار چنٹی کوٹ پہنے تھی۔ اس کا سر ڈھکا ہوا تھا' دودھیائی پیروں میں گولڈن سلیم شاہی جوتے پہنے تھی اور ٹخنوں کے گرد پازیب پہنے تھی اس کی گوری چٹی کلائیوں میں طلائی کنگن پڑے تھے۔

''سب سے پہلے میں آپ کو یہ بتلانا چاہتی ہوں کہ میرے اور آپ کے درمیان ہونے والی گفتگو سے یہ پسنجر ڈسٹرب نہیں ہونگے بلکہ انہیں خبر تک نہیں ہو گی اس لئے کسی خدشے کو ذہن میں نہ لائیے گا۔''

''وہ' وہ تو ٹھیک ہے گنزا امم 'مگر' تم کہاں چلی گئی تھیں......'' میں گنزا کے مثالی حسین سراپا سے نکلتے ہوئے بولا۔

''میں کہیں نہیں گئی تھی بلکہ آپ کے قریب ہی بیٹھی ہوئی تھی۔ اب جب کہ آپ شعلہ جوالا بن چکے تھے تو مجھ پر لازم ہو گیا کہ آپ کے سامنے پہنچ جاؤں' آپ کو محتاط کر دوں کہ اپنے جذبات پر قابو پائیں۔ کسی کو بھی معلوم نہ ہونے پائے آپ کے خاندان پر کیا بیتی اور آپ کیا کرنا چاہتے ہیں۔

آپ کی منزل قریب ہوتی جا رہی ہے۔ بے شک ڈائری پڑھتے رہیں مگر پیش آئندہ حالات سے نمٹنے کے لئے آپ کو نیند لینی پڑے گی۔ روہڑی جنکشن آنے والا ہے اور وہی

ٹکٹ چیکر پھر آئے گا۔ وہ ہندو ہے' بت پرست اور توہمات کا قائل ہے۔ میں اسے تگنی کا ناچ نچاؤں گی۔ سکون سے بیٹھ جایئے اور فلیٹ ہیٹ سر پر رکھیں۔ شب بخیر ......''

گنزا حرف غلط کی طرح غائب ہو گئی اور میں جنات کے متعلق سوچتا رہ گیا۔ جنات جن کا تصور ہی وجود میں خوف کی لہریں دوڑا دیتا ہے۔ کیا جنات ایسے ہی ہوتے ہیں' جیسی گنزا ہے۔



جیسے ہی ٹرین کی رفتار ہلکی ہوئی کمپارٹمنٹ کا دروازہ کھول کر وہی ٹی ٹی نمودار ہوا۔ میں جان بوجھ کر ڈائری پڑھنے میں منہمک ہو گیا تھا یہ علیحدہ بات ہے کہ کن انکھیوں سے ٹی ٹی کا جائزہ لے رہا تھا۔ کمپارٹمنٹ میں داخل ہوتے ہی ٹی ٹی کی نظریں مجھ پر پڑیں۔ نظریں پڑتے ہی میں نے صاف محسوس کیا کہ ٹی ٹی ٹھٹک کر رہ گیا ہے۔ گو کمپارٹمنٹ کی روشنی اونگھتی ہوئی تھی' اس کے باوجود میں نے ٹی ٹی کے چہرے پر شدید خوف کے سائے محسوس کر لئے تھے۔ اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا' آنکھیں پھیل کر رہ گئی تھیں اور اس کا پورا وجود سردی سے یا پھر ہو سکتا ہے خوف سے تھر تھرانے لگا تھا۔ میرا اندازہ ہے کہ وہ سانس لینا بھی بھول چکا تھا۔

''کیا ہوا ٹی ٹی صاحب......'' میں ڈائری سے نظریں ہٹاتے ہوئے بولا اسی دوران ٹرین رک چکی تھی اور میری آواز سن کر اختر نواز بیدار ہو چکا تھا۔

ٹکٹ چیکر نے میرے سوال کا کوئی جواب نہیں دیا بلکہ آہستگی سے ہاتھ اٹھا کر انگلی کا اشارہ کیا۔

اب اختر نواز پوری طرح حواس پر قابو پا کر اپنی جیبیں ٹٹولنے لگا تھا۔

''ہاں۔ یہ میرا ہیٹ ہے' لندن سے خریدا تھا۔ کیا آپ کو پسند ہے......'' مگر میرے سوال کا جواب کون دیتا' ٹی ٹی محاورتاً ہی نہیں حقیقتاً سر پر پیر رکھ کر بھاگ کھڑا ہوا تھا۔

''یہ...... یہ ٹکٹ چیکر کیوں چلا گیا......'' اختر نواز ٹکٹیں ہاتھ میں تھامے مجھ سے مخاطب ہوا۔

"پتہ نہیں۔ بہت ہی خوف زدہ ہو کر بھاگا ہے...." میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"خوفزدہ ہو کر۔ بھئی وصی الدین صاحب .... "اختر نواز متعجب اور پھر کمپارٹمنٹ میں نظریں دوڑاتے ہوئے بولا۔

"خوف کا سماں تو محسوس ہو رہا ہے...." اس نے جملہ مکمل کر دیا۔ پھر اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا' ٹکٹ چیکر ایک بار پھر ریلوے پولیس سمیت پہنچ گیا۔ اس مرتبہ انسپکٹر سکھ تھا۔

"فرمایئے انسپکٹر صاحب' پھر کیا ہوا...." میں نے مسکرا کر پوچھا۔

قطع نظر اس کے ٹی ٹی میرے ہیٹ ہی کی طرف تک رہا تھا۔

"پھر سے آپ کی مراد کیا ہے.... "انسپکٹر شائستہ لہجے میں بولا۔ غالباً وہ میری شخصیت سے متاثر ہو چکا تھا۔

"بتلا دونگا۔ انسپکٹر صاحب۔ پہلے یہ بتلائیں کہ آپ صاحبان بار بار اسی کمپارٹمنٹ پر ریڈ کیوں کر رہے ہیں...." میں نے اپنے لہجے میں ترشی پیدا کر لی۔

"ٹی ٹی بابو کہتا ہے کہ اس نے آپ کے عقبی گوشے میں ڈھائی تین انچ کی حسین و جمیل گڑیا کو رقص کرتے دیکھا ہے...."

"اوہ.... آپ.... آپ کیا دیکھ رہے ہیں...." میں طنزیہ مسکراہٹ سے بولا جب کہ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ گنزا ہی نے ٹی ٹی کو خوفزدہ کرنے کے لئے مافوق الفطرت قوت کا مظاہر کیا ہو گا۔

"کچھ بھی نہیں۔ آپ کا ہیٹ صاف و شفاف ہے.... "انسپکٹر نے جواب دیا۔

"یہ ٹی ٹی کوئی نہ کوئی مہلک نشہ ضرور کرتا ہے انسپکٹر۔ کبھی اسے باتھ روم میں لاش نظر آتی ہے' تو کبھی میرے پیچھے رقص کرتی گڑیا دکھائی دیتی ہے...."

"لینگویج پلیز' میں کسی قسم کا نشہ نہیں کرتا۔ آپ' آپ یقیناً جادوگر ہیں یا.... یا پھر یہ کمپارٹمنٹ آسیبی ہے۔" ٹی ٹی اپنے خوف پر قابو پاتے ہوئے بولا۔

''انسپکٹر ..... ''میرے کچھ جواب دینے سے پہلے اختر نواز بول اٹھا۔

''مسٹر وصی الدین صاحب بہت ہی شریف النفس انسان ہیں۔ کئی گھنٹوں سے ہمارے ساتھ ہیں۔ ہاں' یہ کمپارٹمنٹ ضرور آسیبی ہو سکتا ہے۔ پلیز میرے ساتھ عورتیں اور بچے ہیں۔ برائے مہربانی ہمیں دوسرے کمپارٹمنٹ میں شفٹ کروادیں...... ''ایک بحث سی شروع ہو گئی اور اس بحث مباحثہ میں ٹرین کو ایک گھنٹہ رکنا پڑا۔

بالآخر اختر نواز اپنی فیملی سمیت دوسرے فرسٹ کلاس ڈبے میں شفٹ ہو گیا۔ مجھ پر دباؤ ڈالا گیا مگر میں نے شفٹ ہونے سے انکار کر دیا تھا۔

اب میرے کمپارٹمنٹ میں پولیس کے علاوہ کوئی تھا تو وہ صرف میں تھا۔

''یہ دیکھئے انسپکٹر' یہ امریکن ملٹری کا میرا ذاتی کارڈ...... ''میں نے کوٹ کی جیب سے تین کارڈ نکال کر ایک انسپکٹر کو دکھایا۔

میرا کارڈ دیکھتے ہی سکھ انسپکٹر کے چہرے پر ہوائیاں سی اڑنے لگیں اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ہیروشیما اور ناگاساکی کی مکمل تباہی نے پوری دنیا پر امریکہ کی دھاک بٹھادی تھی۔ کس میں مجال تھی کہ امریکہ کے خلاف ہرزہ سرائی کر سکے۔ پھر یہ کہ میں جس دور کے واقعات اور حالات بتلا رہا ہوں' وہ دور جنوبی ایشیا پر برطانوی تسلط کا دور تھا۔ لہٰذا میرا برطانوی آئڈنٹی کارڈ دیکھتے ہی سکھ انسپکٹر کی گھگھی بندھ گئی۔

''مم' معافی چاہتا ہوں میجر سر۔ آپ یقین کریں ٹی ٹی کی باتیں سن کر مجھے خود بھی اس کے صحیح الدماغ ہونے پر شبہ ہوا تھا' لیکن ڈیوٹی از ڈیوٹی......''

انسپکٹر مع اپنے سپاہیوں کے مجھے فوجی انداز میں سیلوٹ کر کے روانہ ہو گیا۔ میں نے کمپارٹمنٹ کا دروازہ بند کر دیا۔ ویسے بھی خیبر میل کی تیز سیٹی روانگی کا اعلان کر چکی تھی۔

میں جیسے ہی گھوما' حسین نسوانیت کا شاہکار گنزا اپنی برتھ پر اس طرح سمٹی سمٹائی بیٹھی ہوئی نظر آئی جیسے کوئی نئی نویلی دلہن حجلہ عروسی میں منتظر بیٹھی ہو۔

وہ شرمیلی نظروں سے مجھ کو تک رہی تھی۔ اس کے یاقوتی لبوں پر ملکوتی تبسم کھیل رہا تھا۔ وہ بدستور زرق برق لباس میں ملبوس تھی۔

مگر، میرے دل و دماغ پر اس کے حسین ضیاء پاش نے کوئی اثر نہیں چھوڑا بلکہ میں نے اس خشمگیں نظروں سے تکتے ہوئے تلخ لہجہ اختیار کر لیا۔

"تم نے اچھا نہیں کیا گزرا......" کہتے ہوئے میں اپنی برتھ پر بیٹھ گیا۔

"آدمی کی سوچ ہم سے مختلف ہی ہوتی ہے وصی صاحب۔ جو کچھ میں جانتی ہوں، اس کے لئے سب کچھ ضروری تھا جس کا مظاہرہ میں کر چکی ہوں....."

"تم کیا جانتی ہو۔ کیوں کیا یہ سب کچھ تم نے......" میرے لہجے میں بدستور تلخی تھی۔

"میرے پاس مافوق الفطرت علم ہے۔ اسی علم سے میں نے جانا کہ آپ مجھ پر عاشق ہو چکے ہیں اور مجھ سے وہ سب کچھ حاصل کرنا چاہتے ہیں جو ایک شوہر اپنی بیوی سے چاہتا ہے۔ کہہ دیجئے کہ میں غلط کہہ رہی ہوں....."

گزرا نے بالکل صحیح کہا تھا۔ اصلیت بھی یہی تھی کہ میں گزرا کے حسین ترین سراپا کے سحر میں ڈوب چکا تھا اور یہ بھی حقیقت ہے کہ میں گزرا کے جسم کا رسیا ہو چکا تھا۔

"نہیں۔ تم صحیح کہہ رہی ہو۔ میں حقیقتاً تم سے محبت کرنے لگا ہوں۔ ایک لمحہ کو تمہاری جدائی برداشت نہیں کر سکتا......" میں نے بے باکی سے اقرار اور اظہار کر دیا۔

آپ کے گرد شیطانی قوتیں اپنا گھیرا تنگ کر رہی ہیں اس کی پہلی کڑی یہ ہے کہ آپ مجھ سے قرب کے خواہش مند ہو چکے ہیں۔ اگر آپ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے تو اپنے اصل مقصد سے ہٹ جائیں گے اور سب کچھ پا لینے کے باوجود تباہ ہو جائیں گے۔

آپ کو میرا وجود، میری محبت اور میرا جسم ضرور ملے گا مگر، اس کے لئے آپ کو انتظار کرنا پڑے گا۔

میں نے ہی ایسے حالات پیدا کئے ہیں کہ یہ کمپارٹمنٹ دیگر لوگوں سے خالی رہے اور آپ یکسوئی سے اپنا لائحہ عمل مرتب کر سکیں۔ میں بھی تھوڑی دیر کے بعد چلی جاؤں گی۔ آئندہ جو کچھ کرنا ہے آپ نے کرنا ہے۔۔۔"

☆☆☆

خیبر میل واقعی طوفان میل بنا ہوا تھا ہلکوروں اور گھڑگھڑاہٹ میں شدت آ چکی تھی

شبنمی زراعت کے احساس میں مغرق ہو چکا تھا۔ میں نے ایک بار بھی گنزا کی طرف دیکھنے کی زحمت نہیں کی۔ گو کہ ٹھنڈک بہت بڑھ چلی تھی مگر مجھے سردی کا احساس تک نہیں ہو رہا تھا۔

ان ہی خیالات میں غلطاں پیچاں مجھے نیند آگئی۔ میں اس وقت جاگا جب گنزا ہی نے اپنے نرم و ملائم ہاتھوں سے مجھے جھنجھوڑ کر بیدار کیا۔

رسٹ واچ میں وقت دیکھا تو صبح کے ساڑھے دس بج رہے تھے۔ ٹرین رکی ہوئی تھی کمپارٹمنٹ میں اجالا تھا اور میری سماعت سے بھانت بھانت کی آوازیں ٹکرا رہی تھیں۔ ٹھنڈک کا یہ عالم تھا کہ رگوں میں دوڑتے ہوئے خون کی رفتار نقطہ انجماد کو چھونے لگی تھی۔

"صبح بخیر گنزا۔ کون سا اسٹیشن ہے......"

"ملتان کینٹ۔ اچھا بس اٹھیں اور دس منٹ میں ریڈی ہو جائیں۔ خیال رہے باتھ روم کا پانی بہت گرم ہو گا۔ ٹھنڈا پانی ملائے بغیر غسل مت کیجئے گا......"

مجھے کوئی حیرت نہ ہوئی اور میں اوور کوٹ اتار کر باتھ روم کی طرف بڑھ گیا میرا اندازہ تھا کہ پانچ گھنٹے بعد میں جہلم پہنچ جاؤں گا۔

میں آٹھویں منٹ پر باتھ روم سے نکل آیا اور اپنی سیٹ پر بیٹھنے کے بعد ناشتے میں مصروف ہو گیا۔

یقیناً ناشتہ گنزا ہی لائی تھی۔ حلوہ پوری اور چھولے سمیت دو بائل انڈے بھی تھے۔ میں ناشتے میں مصروف ہی تھا کہ ٹرین نے روانگی کا اعلان کر دیا۔ میں نے گنزا کو ناشتے میں ساتھ دینے کو اس لئے نہیں کہا کہ مجھے اس کی پسند کا علم نہ تھا۔

"بہت خاموش ہیں آپ............" مجھے ناشتے سے فارغ ہوتے دیکھ کر گنزا نے لب کشائی کی۔ اتنی سی دیر میں ٹرین رفتار پکڑ چکی تھی۔

"آں ہیں......" میں چونکا۔

"ہاں گنزا۔ میں بہت سی شرمندگی محسوس کر رہا ہوں ...

اچھی علامت ہے۔ لیکن' اب زیادہ شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے اور کچھ پوچھنا ہے؟"

"ہاں' پوچھنا تو ہے'......"

تو پھر جلدی سے پوچھ لیجئے۔ اس لئے کہ لاہور سے تین یوگیوں کا ایک گروہ اسی کمپارٹمنٹ میں پہنچے گا۔ گو کہ وہ تھرڈ کلاس کا ٹکٹ لئے ہوئے ہونگے مگر انہیں تمہارے کمپارٹمنٹ میں ٹھہرایا جائے گا اور یہ سب کچھ ریلوے پولیس اور ٹی ٹی کے ایما پر ہو رہا ہے......"

"اوہ مگر کیوں......"

"صرف اس لئے کہ ٹی ٹی اور ریلوے پولیس کو آپ پر شبہ ہو چکا ہے۔ بلکہ ان کو یقین ہے کہ آپ واقعی جادوگر ہیں۔ جن تین یوگیوں کا میں نے تذکرہ کیا ہے' ان میں سے ایک کچھ نہ کچھ شیطانی قوتیں رکھتا ہے......"

"جہنم میں جائیں وہ۔ مجھے صرف اتنا بتلا دو کہ سیدن شاہ بابا کو دنیا سے گئے ہوئے کتنے برس گزر چکے ہیں وہ دوبارہ زندہ کیسے ہو گئے۔"

"فرسودہ خیالات میں اپنی انرجی ضائع نہ کریں آپ۔ مت بھولئے کہ ہر مذہب کے اپنے اپنے جداگانہ عقائد ہوتے ہیں مگر' مرکزی تصور سبھی کا ایک ہوتا ہے۔ یہ بحث تو علمائے کرام' پنڈتوں اور فادران کلیسا کے لئے رہنے دیجئے تو بہتر ہے......"

"ہاں گنز! تم صحیح کہہ رہی ہو۔ نہ تو میں بزدل ہوں اور نہ ہی میرے عقائد میں کمزوری ہے۔ اگر میرے عقائد کمزور ہوتے یا ان میں ذرہ برابر بھی فرق ہوتا تو میں اسی وقت خوف میں مبتلا ہو جاتا جب دیجور شیورلیٹ کار سمیت گھر کے دبیز پردوں سے اچانک ہی نمودار ہوا تھا۔ میرے بنگلے کی بدلتی کیفیات میرے ہوش اڑا دیتی۔ کوچوان افراہیم اور قلی شرجیل کا انداز میرا ہارٹ اٹیک کر دیتا۔ اس کمپارٹمنٹ میں آپ سب کی موجودگی اور اچانک غائب ہو جانا مجھے دیوانہ بنا دیتا۔ میں سب کچھ محسوس کر رہا تھا اور ان تمام واقعات کے لئے تائید پروردگار سمجھتا رہا ہوں۔

"مجھے بہت خوشی محسوس ہو رہی ہے چغتائی صاحب۔ اگر مشیت میرے آڑے نہ ہوتی تو آپ کے ہونٹ چوم لیتی۔ آپ کے سینے سے چمٹ جاتی میری بے باکی کو بے حیائی نہ سمجھئے گا۔ بلکہ اسے میری عقیدت سمجھیں۔

ہاں تو میں کہہ رہی تھی اللہ تعالیٰ نے اپنے پاک کلام میں ارشاد فرمایا ہے ولی میرے دوست ہیں' انہیں مردہ نہ سمجھو یہ اپنی قبروں میں زندہ ہیں۔ اللہ ان کی کوئی خواہش رد نہیں کرتا۔ بالکل اسی طرح سیدن شاہ بابا کے خاندان کے ایک ولی اللہ کے حکم سے ہم آپ کی حفاظت اور اعانت پر مامور ہیں۔ وہ اس قدر طاقتور ہیں کہ ہم 'یعنی جنات ان کی ڈیوڑھی پر حاضری دیتے ہیں' ان کے احکامات کی تکمیل کرتے ہیں......"

"سوری گنزا۔ میرا سوال واقعی احمقانہ تھا......"

"نہیں چغتائی صاحب۔ آپ کا سوال عالمانہ ہی تھا۔ ہم دونوں کے درمیان مذہبی باتیں ہوتی رہیں اور خیبر میل طوفان کی طرح منزل کی طرف بڑھتی رہی۔



تقریباً ڈھائی بجے ٹرین لاہور اسٹیشن پہنچ گئی۔ چونکہ میں سیٹ پر بیٹھے بیٹھے اونگھ گیا تھا اس لئے ٹرین کے رکنے سے مجھے جھٹکا لگا اور میں پوری طرح بیدار ہو گیا۔

کمپارٹمنٹ دن ہونے کی وجہ سے روشن تھا۔ گنزا اپنی سیٹ پر نہیں تھی۔ میں لمبی سی سانس کھینچ کر کھڑا ہوا۔ خیال یہی تھا کہ ڈبے سے نکل کر کچھ کھانے کے لئے خریدوں۔ لیکن اچانک ہی گنزا کی سرگوشیانہ مگر سرسراتی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

"آپ باہر نہیں جائیںگے۔ آپ کی پسند کا کھانا سامان والی برتھ پر ٹفن میں رکھا ہے۔ چھوٹے گوشت اور لذیذ پائے۔

آپ کے پاس ڈالرز ہیں' سونا ہے اور جواہرات بھی ہیں۔ یہ امانت ہے آپ کی دو معصوم بہنوں کی جو آج بھی آپ سے ملنے کی آس لگائے بیٹھی ہیں۔ اچھا بس شیطان آرہے ہیں......"

گنزا کی سرگوشی ختم ہو گئی اور میں ڈبل شیڈ والی کھڑکی کی طرف بڑھ گیا۔

اچانک کمپارٹمنٹ کا دروازہ کھلا اور ایک دوسرے کے پیچھے تین انسان نظر آئے۔

میں نے اپنا ارادہ ترک کر دیا اور اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ سب سے پہلے داخل ہونے والا شخص ایک لمبا تڑنگا اور دبلا پتلا بوڑھا تھا۔ گو کہ اس کی داڑھی کے بال نہیں تھے تاہم سر اور مونچھوں کے بال سفیدی مائل مٹیالے تھے۔

اس کی مونچھیں اس قدر گھنی تھیں کہ اس کے ہونٹ ڈھک کر رہ گئے تھے۔ سر کے بال بہت لمبے اور کیچڑ میں لتھڑے ہوئے تھے اس کے گلے میں موٹے موٹے دانوں کی مالائیں پڑی تھیں اور پیشانی پر اوم کا نشان بنا ہوا تھا۔ اس کے لباس پر روشنی اس لئے نہیں ڈال سکتا کہ اس کا پورا وجود بہت ہی موٹے، میلے اور بدبودار کمبل میں لپٹا ہوا تھا۔

اس کا چہرہ مکروہ اور جھریوں سے لبریز تھا آنکھیں بڑی بڑی اور خون کی طرح سرخ تھیں۔ اس کے پیچھے اسی کے دو ادھیڑ عمر چیلے بھی تھے۔

"وہیں ٹھہرو......" میں چیخ سا پڑا۔

بالکل غیر ارادی طور پر میں کھڑا ہو گیا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ گندے اور غلیظ بوڑھے کے کمبل سے اٹھنے والی بدبو نے میرے تنفس میں کراہت سی پیدا کر دی تھی۔

بوڑھا ٹھٹک کر رک گیا مگر وہ میری طرف متوجہ نہ ہوا بلکہ اس کی خون اگلتی آنکھیں پورے کمپارٹمنٹ کا جائزہ لیتی رہی۔

"نکلو باہر۔ یہ ڈبہ غلیظ لوگوں کے لئے نہیں ہے......" میں نے جملہ مکمل کر دیا۔

"کیا کہہ رہے ہو بالک............" بوڑھا پہلی بار میری طرف متوجہ ہوا۔

اس کا لہجہ کھرکھراتا ہوا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے اس کی آنکھوں سے دو برقی لہریں سی نکل کر میری آنکھوں سے ٹکرائی ہیں۔

"جو کہا ہے درست کہا ہے۔ نکلو باہر......" کہنے کے ساتھ ہی میں نے اوور کوٹ کی جیب سے اپنا لوڈر یوالور نکال لیا۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ میرا دل از خود بڑی تیزی سے دھک دھک کرنے لگا تھا۔ فی الفور میں نے آیت الکرسی پڑھنا شروع کر دی تھی۔

شروع کی ہی تھی کہ منحوس بوڑھے نے کراہتے ہوئے اپنی آنکھیں موند لیں اور اوم

اوم کہتا ہوا پلٹ گیا۔ اس کے چیلے بھی اس کے پیچھے چل دیئے تھے۔

میں کمپارٹمنٹ کا دروازہ بند کر کے جیسے ہی گھوما گنزا کو اس کی سیٹ پر بیٹھا ہوا پایا۔

وہ حسب معمول مسکرا رہی تھی اور مجھے تحسین بھری نظروں سے تک رہی تھی۔

"قصہ یہیں ختم نہیں ہو جاتا چغتائی صاحب......" خلاف توقع اس کے لہجے میں خرخراہٹ سما چکی تھی۔

"یہ یوگی اگھوری ہے۔ معصوم بچوں کو ذبح کر کے ان کا خون پیتا رہا ہے اور گوشت کھاتا رہا ہے۔ سراپا شیطان ہے۔ ماورائی قوتیں پا چکا ہے چڑیلیں اور بدروحیں اس کے قبضے میں ہیں۔ ہندو اور سکھ اسے شکتی مان دیوتا مانتے ہیں۔ فی الحال یہ لوٹ گیا ہے مگر آپ کو زک پہنچانے کی پوری پوری کوشش کرے گا۔ بڑے بڑے روسا' زمیندار اور جاگیر دار اسے پوجتے ہیں' اس کی شیطانی شکتی سے خوف زدہ بھی رہتے ہیں اور فائدے بھی اٹھاتے ہیں۔ یہ ڈھوک نالیاں جا رہا ہے جہاں پاتال میں اس کا گروہ رہتا ہے۔

آپ کھانا کھالیں اور ہر لحہ محتاط رہیں۔ شیطانی قوتوں کا کھیل شروع ہو چکا ہے اور یہ اگھوری میری موجودگی کو محسوس کر چکا ہے......" گنزا خاموش ہو گئی۔

"اللہ بڑا ہی کارساز ہے گنزا......" لاپرواہی سے جواب دے کر میں نے کھانے کا ٹفن اٹھا لیا۔ ٹھیک اسی لمحے خیبر میل کی سیٹی طول وارض میں گونج اٹھی تھی۔



"فوہ......" خوفناک پھنکار سنتے ہی میرے رگ وپے میں سنسنی سی دوڑ گئی۔

میں اپنے بیڈ پر چت لیٹا ہوا ڈائری پڑھ رہا تھا۔ میرے دل و دماغ پر غم و فکر کے دبیز سائے چھائے ہوئے تھے۔ پھوٹ پھوٹ کر رونے کو جی چاہتا تھا مگر آنکھوں سے آنسو نہیں گر رہے تھے۔

وجہ یہ تھی کہ میرے دادا کی موت کے حالات میرے علم میں آ چکے تھے۔ مجھے پتہ چل گیا تھا کہ جاگیردار نظام نے میرے دادا جی سے کس طرح بلینک اسٹامپ پر دستخط لئے تھے اور گاؤں میں ہماری زمینوں کھیتوں' باغات اور مویشیوں کا مالک بن بیٹھا تھا۔ اس

کے ساتھ ہی مجھے یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ نظام چوہدری' اس کے بیٹوں امام دین' عبدالسلام' بہرام اور ارسلان نے میرے اباجی سے کس طرح ہماری شوگر ملیں ہتھیائیں۔ میری آپا سلیمہ اور چھوٹی آپا نسیمہ پر کیا گزری تھی۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ چوہدری نظام اور اس کے بیٹے محض مال و دولت کی ہوس میں اس قدر سفاکی' بے رحمی اور بے دردی کا مظاہرہ کریں گے۔

میرے لہو میں انگارے سے دوڑ رہے تھے۔ میرا ذہن پھنک رہا تھا اور میرے دل میں انتقام کے شعلے مچل رہے تھے۔ ایسے میں ڈبے کی ہولناک خاموشی میں' فولادی پہیوں اور پٹڑیوں کی گڑگڑاہٹ پر حاوی پھنکار نے مجھے بری طرح چونکا دیا۔

اف۔ وہ بہت ہی لمبا اور چتکبرا سانپ تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ اس کی لمبائی پانچ فٹ سے زیادہ ہی تھی۔ وہ میری سیٹ سے پائنتی جانب بمشکل ڈیڑھ فٹ کے فاصلے پر میرے لانگ چرمی شوز کے درمیان کنڈلی مارے بیٹھا تھا۔ یقیناً اس نے میرے پیروں پر ڈنک مارنے کی کوشش کی ہوگی۔

گنزا اپنی سیٹ پر نہیں تھی۔ پورے کمپارٹمنٹ پر عجیب سی وحشت سوار تھی۔ پھن کاڑھے سانپ کی زبان بار بار منہ سے نکل رہی تھی اس کی گول آنکھوں سے گویا دو برقی لہریں سی نکل رہی تھیں ایک لمحہ کے دسویں حصے میں' میں محتاط ہو گیا اور سورہ مزمل شریف پڑھتے ہوئے میں نے کوٹ کی جیب سے ریوالور نکال لیا۔ دھائیں سے گولی چلی اور سانپ کے پھن کے پرخچے اڑ گئے۔ سانپ کا بقیہ جسم گڈمڈ ہونے لگا۔

"گنزا......" سورۂ مبارکہ کا اپنے اوپر دم پھونکنے کے بعد میں نے ڈبے کے پراسرار ماحول میں گنزا کو پکارا۔ کوئی جواب نہ پا کر دوسری اور پھر تیسری بار پکارا۔

"لاحول ولا قوۃ......" جھلا کر میں نے لاحول پڑھی اور مردہ سانپ کو ایک نظر دیکھنا چاہا۔ مگر سانپ اور اس کے لہو کا کوئی وجود نہ پا کر یکبارگی میرا دل دھک سے ہو کر رہ گیا۔

"یا اللہ۔ میری حفاظت و مدد فرما۔ مجھے استقامت اور جرائت عطا فرما دے......"

خشوع و خضوع قلب سے دعائیں مانگتے ہوئے میں نے اپنے جوتے کھینچ کر پہن لئے

اور اپنے پھیلے ہوئے سامان کو سمیٹنے میں مصروف ہو گیا۔

ریوالور میں نے اوور کوٹ کی جیب میں محفوظ کر لیا تھا۔ سامان سمیٹتے وقت میری چھٹی حس پوری طرح بیدار تھی۔ سانپ کے اس طرح غائب ہو جانے سے مجھے یقین ہو چکا تھا کہ میرے خلاف انتقامی کارروائی غلیظ اگھوری کی جانب سے کی گئی ہے ورنہ ہر طرف سے محفوظ کمپارٹمنٹ میں خوف ناک سانپ کیسے داخل ہوتا جب کہ کسی قسم کا کہیں بھی روزن نہیں ہے۔ پھر یہ کہ مردہ سانپ کا اچانک غائب ہو جانا میرے شبہے کو تقویت دے رہا تھا۔

"وصی الدین۔ میرے بیٹے' میرے لال......" غیر متوقع طور پر اچانک ہی میری امی کی پکار میری سماعت سے ٹکرائی۔

یکبارگی میرا دل اچھل کر میرے حلق میں آاٹکا۔ میرے رگ و پے میں تیز سنسنی سی دوڑ گئی۔ میں بالکل غیر ارادی طور پر مڑا اور کمپارٹمنٹ کی شیشہ چڑھی کھڑکی کے شیڈ پر ایک متحرک سایہ دیکھ کر میرا ذہن بھک سے اڑ گیا۔ میرا وجود میرا سراپا کسی بے جان بت کی طرح اکڑ کر رہ گیا۔ کمپارٹمنٹ کی آسیبی روشنی نے میرے دل و دماغ پر' میری سوچ پر اندھیرے کے دبیز پردے حائل کر دیئے۔

"تو آگیا میرے جگر گوشے۔ دروازہ کھول دے میرے بچے۔ مدتوں پیاسی ماں کے سینے سے لگ جا......"

کسی عورت کا متحرک سایہ میں نے دیکھا۔ میری ماں ہی کی آواز تھی۔ ممتا کے کرب میں بھری ہوئی آواز نے میرے دل و دماغ پر چھائے ہوئے اندھیرے یکسر مٹا دیئے۔ میری رگوں کا لہو گرم ہو گیا۔ میری سانس لوہار کی دھونکنی بن گئی۔ میں قطعی بھول گیا کہ میری اماں کو وفات پائے ہوئے دو برس سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے۔

میری آنکھوں سے سیل رواں جاری ہو گیا۔ بے خود ہو کر میں دروازے کی جانب بڑھ ہی رہا تھا کہ اچانک کمپارٹمنٹ کی ہولناک وسعتوں میں روشنی کا' انتہائی تیز روشنی کا ایک جھماکہ ہوا۔ بالکل ساون میں آسمانی بجلی کی سی چمک کا جھماکہ۔ یہ سب کچھ چند ہی

لمحوں میں ہو گیا حیرت انگیز طور پر میں نہ صرف نارمل ہو گیا بلکہ میری سوچنے سمجھنے کی تمام قوتیں لوٹ آئیں۔

معاً میں نے آنکھیں بھینچ لیں۔ صرف اس لئے کہ غیر ارادی طور پر کوئی مکڑی' جگنو یا کاکروچ میری آنکھوں پر چوٹ کرنا چاہتا ہو۔

میں نے آنکھیں بھینچی ہی تھیں کہ ایک نقرئی قہقہے کی آواز سنتے ہی بے ساختہ آنکھیں کھول دیں۔

"چغتائی صاحب۔ دھوکہ کھا گئے۔ آ گئے ایک چڑیل کے جھانسے میں۔ آپ بھول گئے کہ آپ کی والدہ دار فانی کو چھوڑ چکی ہیں۔"

یہ گنزا کے الفاظ تھے۔ سن لینے کے بعد باوجود کڑا کے کی سردی کے میرے ماتھے پر ندامت کے پسینے عود کر آئے۔

پھر ایک روشن جھماکہ ہوا اور گنزا غائب ہو گئی۔ اس کے غائب ہوتے ہی میری نظریں از خود کھڑکی کی طرف اٹھ گئیں۔ کسی قسم کا سایہ نہ تھا۔

"وہ چڑیل تھی چغتائی صاحب......

گنزا کی مدھ بھری آواز سن کر میں بڑی تیزی سے پلٹا۔ گنزا بد ستور گاؤں کی الھڑ دوشیزہ کے قیمتی لباس میں ملبوس اپنی سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی۔

"تم کہاں چلی گئی تھیں گنزا......" میں شکایتی لہجے میں کہتے ہوئے اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

"کہیں نہیں۔ آپ کے ہیٹ پر لیٹی ہوئی سب تماشہ دیکھ رہی تھی۔ یقین جانئے کہ چڑیل نہ آتی تو میں آپ کے سامنے نہ آتی۔

"مگر کیوں مجھ سے تمہاری جدائی برداشت نہیں ہوتی گنزا۔" میرا لہجہ رومانی ہو گیا۔

آپ کو میری جدائی برداشت کرنا پڑے گی۔ صرف اس لئے کہ آپ کو بہت ہی صبر آزما اور کٹھن مراحل سے گزرنا ہے۔ میں سوائے اہم حالات کے آپ کے سامنے نہیں آؤنگی۔ یقین رکھئے ہر مشکل وقت میں آپ کے وجود کا سایہ بنی رہونگی۔ جونہی آپ اپنے جسم میں' دماغ و اعصاب میں جھٹکا' تناؤ یا حدت محسوس کریں تو سمجھ جائیں کہ میں آپ کے

وجود میں موجود ہوں۔

میں ہی آپ کی سوچ ہوں' قوت ہوں اور لائحہ عمل ہوں۔ آپ کا شعور اور لاشعور بے شک آپ ہی کا ہوگا لیکن' اس پر حکم میرا چلے گا۔ میں آپ کو قانونی' ماورائی اور دیومالائی قوتوں سے بچاؤں گی۔ صرف اس لئے کہ آپ کا محافظ حقیقی یہی چاہتا ہے......"

☆☆☆

جہلم اسٹیشن آگیا۔ شام کے سرمئی سائے تیزی سے شب کی سیاہی میں تحلیل ہونے لگے تھے۔ ٹھنڈ کا یہ عالم تھا کہ دانتوں کا بجنا بھی موقوف ہو چکا تھا۔ جبڑے گویا برف کی مانند جم چکے تھے۔ اسٹیشن رنگ و نور میں رچا بسا ہوا تھا۔ روشنیاں جاگ چکی تھیں۔ بھانت بھانت کی آوازوں سے پلیٹ فارم گونج رہا تھا۔ کوئی شخص ایسا نہ تھا جو دبیز اونی کمبل میں لپٹا ہوا نہ ہو۔

کمبلوں میں لپٹے ہوئے تین قلی میری طرف بھی دوڑے آگئے۔ میں نے ایک دراز قد اور بھاری بھر کم قلی سے سامان اٹھوایا اور خارجی گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔

میں نے صاف محسوس کیا کہ مرد عورتیں اور بچے بھی متاثر کن نظروں سے تک رہے ہیں' ریلوے پھاٹک پر کھڑا ٹکٹ کیپر بھی مجھ سے بڑے ہی اخلاق سے پیش آیا تھا۔

چونکہ سامان اٹھوانے سے پہلے ہی میں قلی سے کہہ چکا تھا کہ مجھے چکوال جانا ہے۔ لہٰذا قلی کا رخ بس اسٹینڈ ہی کی طرف تھا۔ بس اسٹینڈ اتنی ہی دوری پر تھا کہ میں کنڈیکٹر کی آواز صاف سن رہا تھا جو چکوال چکوال کی رٹ لگائے ہوئے تھا۔

ہوٹلوں اور سرائے کے نمائندے الگ شور مچائے ہوئے تھے۔ ریستوران کے گراموفون پر پنجابی نغمے گونج رہے تھے۔ گویا بے ہنگم سا شور برپا تھا جو کچھ بھی تھا' میں چکوال جانے والی بس میں سوار ہو گیا۔ میرا سامان بس کی چھت پر محفوظ کر دیا گیا تھا۔ میں نے قلی کو جب دس روپے دیئے تو وہ بھونچکارہ گیا۔ اتنے روپے تو وہ شاید مہینہ بھر میں بھی نہ کما سکتا تھا۔

بہر حال میں نے مسکرا کر قلی کا شانہ تھپ تھپایا اور بس میں داخل ہو گیا۔

بس کی سیٹیں بھری ہوئی تھیں۔ صرف ایک سیٹ ایسی تھی کہ اس پر میں بیٹھ سکتا تھا بشر طیکہ سانولی سی رنگ کی خانہ بدوش ٹائپ کی لڑکی کو میرے بیٹھنے پر اعتراض نہ ہوتا۔"

وہ چھریرے جسم والی لڑکی تھی۔ اس نے کانوں میں چاندی کے جوڑے رنگ پہنے تھے اور ہاتھوں میں کلائی سے کہنی تک چاندی ہی کے کنگن نظر آئے۔

اس کے چہرے کے نقوش انتہائی تیکھے اور پرکشش تھے۔ گو کہ وہ موٹے سے اونی کمبل میں لپٹی ہوئی بیٹھی تھی مگر اس کی ہر ادا سے سیکس اپیل ٹھاٹھیں مار رہی تھی۔

میں تذبذب میں مبتلا ہی تھا کہ کنڈیکٹر جو مسلسل پسندیدہ نظروں سے میری طرف تک رہا تھا' میری جھجک کو محسوس کر کے چلایا۔

"نی ٹھیا رے۔ پرے ہٹ تے باؤ جی نوں بہن دے......"

"بیٹھ جاؤ باؤ جی۔ میں آپ کے ہاتھ پیر جوڑنے سے تو رہی......"

خانہ بدوش لڑکی کھڑکی کی طرف کھسکتے ہوئے بولی۔ وہ پنجابی میں ہی بولی میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ہینڈ بیگ سیٹ کے ساتھ رکھا اور بیٹھ گیا۔

ان دنوں خانہ بدوش عورتیں کسی بھی مرد کے ساتھ بیٹھنے میں معترض نہ ہوتی تھیں' بشر طیکہ وہ غیر مسلم ہوں۔

پوری بس کی کھڑکیاں بند تھیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو لوگوں کی قلفی جم جاتی۔

شام کے پانچ بج کر بیس منٹ کا وقت تھا سورج غروب ہو چکا تھا اور بس کا واحد داخلی و خارجی گیٹ بند کر کے کنڈیکٹر نے سیٹی بجادی تھی۔ بس کا انجن جاگا اور بس کھسکنا شروع ہو گئی۔

میں شیشے کے شیڈ والی کھڑکی سے بیرونی مناظر دیکھنے لگا تھا۔

غالباً اطراف کے درختوں' باغات اور کھیتوں سے کہر کے بادل اٹھنے شروع ہو چکے تھے۔

"کیا نام ہے آپ کا' جواناں.....'

بس نے رفتار پکڑ لی تھی۔ ہر پسنجر ٹھنڈ میں سکڑا ہوا اپنی ہی دھن میں مگن ہو چکا تھا۔

ایسے میں خانہ بدوش لڑکی نے مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔وہ ٹھیٹ پنجابی لب و لہجہ میں بولی تھی۔

"وصی......وصی الدین......" بے ساختگی سے میں نے نام بتلا دیا۔اس سے آگے ایک لفظ بھی اس لئے نہ کہہ سکا کہ میری زبان محاورتاً ہی نہیں حقیقتاً تالو سے جا لگی تھی۔

میری آنکھیں پتھرا گئیں اور دل کی دھڑکن جیسے تھم گئی ہو۔وجہ بھی معقول تھی۔

خانہ بدوش لڑکی کی آنکھوں سے جیسے ہی میری نظریں چار ہوئیں' میری تمام حسیات منجمد ہو کر رہ گئیں۔کچھ ایسی ہی مقناطیسیت تھی اس کی آنکھوں میں۔

"بہت خوب صورت نام ہے آپ کا۔میرا نام راجوڑی ہے۔کیا میں آپ کے کندھے سے سر ٹیک سکتی ہوں............" وہ اپنے چمکتے ہوئے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے بولی۔

گو کہ وہ مسکرائی تھی'مگر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس نے اپنے دانت میری گردن میں گاڑ دیئے ہوں۔

بتلا چکا ہوں کہ میری زبان گنگ ہو چکی تھی۔میں نے لڑکی کے سوال کا جواب نہیں دیا۔اس طرح میری خاموشی کو میری رضا مندی سمجھتے ہوئے اس نے اپنا بایاں گال میرے دائیں کندھے سے ٹکا دیا۔

ٹکایا ہی تھا کہ لڑکی ایک جھٹکے سے اذیتناک سسکاری بھرتے ہوئے اچھل پڑی۔یک بیک اس کی آنکھیں دہکتے انگارے بن گئیں۔اس کا جاذب نظر چہرہ کریہہ ترین جھریوں سے بھر گیا۔اس کے اوپر کے دو دانت کسی خونخوار بھیڑنی کی طرح نمودار ہو گئے اور وہ اس طرح تیز تیز اور خرخراتی سانسیں لینے لگی جیسے واقعی میں وہ بھیڑنی ہو......"

خرخراہٹ اس قدر تیز'کریہہ اور بھیانک تھی کہ لاری کے انجن کی آواز پر بھی حاوی ہو گئی۔

بالکل ہی اچانک اور غیر ارادی طور پر لاری ڈرائیور کے پیروں کا دباؤ بریک پر دب گیا۔

چرچراہٹ کی طویل آواز سے لاری کے ٹائر چیخ پڑے چونکہ راجوڑی کی خرخراہٹیں

اعصاب شکن تھیں اس لئے لاری میں بیٹھے ہوئے مردوزن اور بچے خرخراہٹوں کی طرف متوجہ ہو چکے تھے۔ ہر آدمی ہذیانی انداز میں چیخ پڑا' ہر آنکھ فرط خوف سے پتھرا گئی۔

اس پر ستم یہ ہوا کہ لاری کے اچانک رکنے سے شیڈز سے گرنے والے سامان نے پسنجروں میں ہیجان سا برپا کر دیا تھا۔ کئی لوگ باہم ٹکرا گئے۔ بہت سوں کے ماتھے سامنے والی سیٹ کی پشتگاہ سے ٹکرا گئے۔ ایک قیامت سی برپا ہو چکی تھی۔ یہ سب کچھ آن واحد میں ہو چکا تھا اور اسی آن واحد میں' میں اس طرح چونک پڑا جیسے کوئی بھیانک خواب دیکھ کر بیدار ہوا ہوں۔

اسی آن واحد میں میری سو جانے والی تمام حسیات بیدار ہو گئیں۔ دوسرے لمحے کے شروع ہونے سے پہلے ہی میری حلق سے نعرۂ حق بلند ہوا اور میں نے بجلی کی سی تیزی سے جھپٹا مار کر راجوڑی کی چٹیا پکڑ لی۔

ساتھ ہی راجوڑی کے حلق سے ایک خوفناک 'کریہہ اور لرزہ براندام کر دینے والی چیخ نکلی۔ تمام لاری پسنجروں پر سکتہ سا سوار ہو گیا۔ ان کے وجود شاخ بریدہ کی طرح تھر تھر کانپ رہے تھے۔ اس وقت تو ہر ایک کی گھگھی بندھ گئی جب راجوڑی کا گردن سے نچلا پورا جسم گیس بھرے غبارے کی طرح بلند ہو گیا اس کا لاچہ الٹ گیا' اس کا پورا جسم مادر زاد ننگا ہو گیا وہ کرب و اذیت سے چلاتی رہی اور اپنے دونوں پیروں سے دھب دھب چھت ٹھونکتی رہی۔ قطع نظر اس کے میں چٹان کی طرح اکڑا رہا' میری گرفت راجوڑی کی چٹیا پر تنگ سے تنگ ہوتی گئی۔

نہ جانے وہ کونسی قوت تھی جس نے میرے چہرے کو شعلہ جوالا بنا کر رکھ دیا تھا۔ مجھے نہ تو خوف محسوس ہوا اور نہ ہی کوئی خدشہ میرے ذہن میں سما سکا۔ برعکس اس کے میں بلند آواز سے تمام پسنجروں کے حوصلے بڑھانے والے مکالمے بولنے لگا تھا۔ "جل جاؤنگی' فنا ہو جاؤنگی' معاف کر دو مجھے۔" راجوڑی کی التجائیں گونجتی رہیں گونجتی رہیں اور گونجتی رہیں۔ یہاں تک کہ میں نے راجوڑی کی شدت پا جانے والی جدوجہد کو ماند پڑتے ہوئے محسوس کر لیا۔

"ایک شرط پر تجھے چھوڑ سکتا ہوں۔" میرے لبوں سے بھاری بھر کم اور غیر ارادی آواز نکلی۔

"میں...... میں تیری شرط ماننے کو تیار ہوں مجھے چھوڑ دے' بخش دے۔" "مجھے یہ بتلاؤ' تو میرے پیچھے کیوں پڑی ہے' کس نے تجھے میرا دشمن بنایا ہے۔" میں غیر ارادی طور پر بولتا رہا۔

"میں تیرا خون پینا چاہتی تھیں۔ ٹرین میں بھی میں نے ہی تیری ماں کی آواز میں پکارا تھا' اور یہ سب کچھ میں پنڈت دھیراج اگھوری کے لئے اسی کے حکم سے کر رہی ہوں۔ وہی اگھوری جسے تو نے کمپارٹمنٹ سے بے عزت کر کے نکالا تھا۔"

"اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ رہائی پانے کے بعد تو میرا تعاقب نہیں کریگی۔"

"کوئی ضمانت نہیں دے سکتی۔ اس لئے میں پنڈت دھیراج اگھوری کے چنگل میں جکڑی ہوئی ہوں۔"

"چغتائی صاحب......" اچانک پشتی سیٹ سے کسی مرد کی کھوکھلی آواز سن کر میں نے چونک کر گردن موڑی۔

"اس بدبخت کو میرے سپرد کر دیں۔ دروازہ کھول او کنڈیکٹر۔" وہ ساکت و جامد کھڑے ہوئے کنڈیکٹر سے مخاطب ہو گیا۔ "آپ فکر مند نہ ہوں چغتائی صاحب' میں گنزا کا ساتھی ہوں۔" جملے کے اختتام تک' دراز و قوی ہیکل گبرو جوان نہ صرف میرے قریب پہنچ گیا تھا بلکہ اس نے راجوڑی کا لاچہ ہٹا کر میرے ہاتھ سے راجوڑی کی چٹیا چھڑا کر خود پکڑلی تھی۔

"گنزا کہاں ہے دوست......" میں نے بے ساختگی میں پوچھ لیا۔

"چند لمحے پہلے وہ آپ ہی کے وجود میں تھی......" کہنے کے ساتھ ہی وہ لاری پسنجروں سے مخاطب ہوا۔ "گھبراؤ نہیں لوگو! یہ خانہ بدوش ضرور ہے مگر انسان نہیں ہے' یہ چڑیل ہے اس نے نہ جانے کتنے گبرو جوانوں اور معصوم بچوں کو مارا ہے' مگر اب اس کا وقت پورا ہو چکا ہے۔" وہ پراسرار شخص راجوڑی کی چیخوں خرخراہٹوں کی پرواہ کئے بغیر اسے کھینچتا ہوا

دروازے کی طرف بڑھتا رہا۔ لوگ باگ ہذیانی آوازیں نکال کر پہلو تہی کرتے رہے۔

راجوڑی کا تمام دھڑ اب بھی بلند تھا وہ دھپا دھپ اپنے پیروں سے چھت ٹھونک رہی تھی۔

"میں جیسے ہی لاری سے اتر جاؤں' آپ لوگ بے خوف ہو کر منزل کی طرف بڑھ جائیں...... " کہتے ہوئے پراسرار جوان' راجوڑی کو خارش زدہ کتیا کی طرح کھینچتے ہوئے لاری سے اتر گیا۔

تھر تھر کانپتے ہوئے کنڈیکٹر نے دروازہ فوراً ہی بند کر دیا اور اپنے اسٹول پر بیٹھ کر پیاسے ہرن کی طرح ہانپتا رہ گیا۔

صرف اسی پر کیا منحصر تھا' تمام پسنجر ہانپ رہے تھے۔ ہر چہرے پر خوف تھا۔ چند عورتیں اور بچے تو دم خود ہو چکے تھے' چند ایک کے کپڑے بھیگ چکے تھے۔

میں تھکے ہوئے مسافر کی طرح لبوں سے گہری سانس خارج کرتے ہوئے اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا اور کھڑکی کے شیشے سے بیرونی مناظر پر توجہ مرکوز کر لی۔

لاری کے پسنجروں کے تاثرات جو ہوں سو ہوں لیکن میری عجیب کیفیت تھی۔ میں آنکھیں بند کرتا تو چڑیل کا بھیانک ترین چہرہ سامنے آجاتا۔ یوں لگتا جیسے وہ اپنا خوف ناک دہانہ میرے لئے کھولے کھڑی ہے۔ اس کے پیلے' نوکیلے اور لمبے دانت میرے نرخرے میں پیوست ہونا چاہتے ہوں۔ میں جھرجھرا کے آنکھیں کھول لیتا' میرے خوف زدہ ہونے کی ایک وجہ یہ بھی میری سمجھ میں آرہی تھی کہ شاید آتشی مخلوق یعنی گنزا میرے وجود سے نکل چکی تھی۔ دوسری وجہ میری سمجھ میں یوں آئی کہ میرے جسم میں گرمی نہ تھی اور اب مجھے شدت سے سردی لگ رہی تھی۔ لبوں سے آسودہ سی سانس خارج کرتے ہوئے میں نے سیٹ کی پشتگاہ سے اپنا سر لگا کر آنکھیں موند لیں۔ فی الفور پراسرار جوان کا سراپا میرے سامنے آن کھڑا ہوا وہی جوان جس نے گنزا کا ساتھی ہونے کا دعویٰ کیا تھا۔ اور میرے سامنے راجوڑی کو کھینچتے ہوئے لے گیا تھا۔

نوجوان کے تصور سے ہٹ کر مجھے گنزا کے تصور نے گھیر لیا۔ میں نے خود کو پوری

طرح ٹٹولا۔ کیا میں گنز اکو شریک زندگی بنا سکتا ہوں۔ میں جو انسان ہوں اور گنز اجنی ہے۔ آگ سے بنائی ہوئی آتشی مخلوق میں سے ایک ہے۔

وہ میرے اعصاب پر چھا چکی تھی' اس کا مرمریں جسم' اس کی دل کو کھینچ لینے والی مسکراہٹ میرے لئے حصول بن چکی تھی۔ عطا کرنے والی قائم ودائم ہستی نے آتشی مخلوق کو کس قدر شکتی عطا کر دی ہے کہ وہ کسی بھی جاندار کے بالعموم اور انسانی جسم میں بالخصوص داخل ہو کر اس کے اعصاب پر حرکات' وسکنات پر حاوی ہو جائیں۔

''ہوں......'' میں خود بخود ہنکارہ۔ یقیناً گنز اہی نے میرے اعصاب کو جگایا تھا' اسی کے ایما پر میں نے چڑیل کو چٹیا سے دبوچ لیا تھا۔ یہ تو میں نے بچپن ہی میں بزرگوں سے سنا ہوا تھا کہ اگر چڑیل کو اس کی چٹیا سے پکڑ لیا جائے تو وہ بے بس ہو جاتی ہے۔

میں گنز اہی کی سحر انگیز شخصیت میں ڈوبا ہوا نیم بیداری کے عالم میں سو گیا۔



لاری جب چکوال پہنچی تو عشاء کی اذانیں گونج رہی تھیں۔ ریستوران اور مسافر خانے کھلے تھے۔ دیہاتی اور شہری لوگ بہت کم تعداد میں ریستوران وغیرہ میں بیٹھے تھے۔ رنگ برنگی بکھرائی ہوئی روشنیاں انسانی بیداری کا ثبوت فراہم کر رہی تھیں۔ ٹھنڈک کا یہ عالم تھا کہ دانتوں سے دانت ٹکرا رہے تھے' جبڑے دکھنے لگے تھے' جسم کپکپا رہا تھا اور باوجود انسانی بیداری کے ہر سو سناٹا اور جمود سا طاری تھا۔

چکوال پہنچتے ہی مجھے میرا ماضی یاد آنے لگا۔ میں فرط مسرت سے کھل اٹھا' مگر میری یہ مسرت عارضی ثابت ہوئی۔ میرے دادا' ماں باپ اور دونوں بڑی مقتول بہنوں کے سراپا کفن میں لپٹے ہوئے میری نظروں کے سامنے آن کھڑے ہوئے میرے ہاتھوں کی مٹھیاں اس شدت سے بھنچ گئیں کہ دستانے پھٹتے محسوس ہونے لگے۔

جی میں آیا کہ چکوال ہی میں ٹھہر جاؤں اور چوہدری نظام اور اس کے بیٹوں بیٹے چوہدری امام دین اور چوہدری عبدالسلام سے اپنا حساب کتاب بے باک کر دوں مگر مصلحتیں آڑے آنے لگیں۔ سب سے اہم یہ کہ میں اپنی دونوں معصوم بہنوں سے ملنا چاہتا

تھا' انہیں یہ احساس دلانا چاہتا تھا کہ میں زندہ ہوں' ان کا باپ ہوں ماں بھی اور وارث بھی۔

میں نے جوں توں اپنا سامان اٹھایا اور تانگہ اسٹینڈ کی جانب بڑھ گیا۔ یہاں یہ بتلانا ضروری ہے کہ میرے گاؤں تک پہنچنے کے لئے چند درمیانے گاؤں عبور کرنے پڑتے ہیں بھلا کریالہ گاؤں میں میری نالہ اپنے شوہر اور بچوں کے ہمراہ رہتی ہیں۔ مجھے میرے کراچی والے دوست مصور منہاس نے بتایا تھا کہ میری دونوں چھوٹی بہنیں میری خالہ کے پاس ہیں۔

بھلا کریالہ کے بعد کھرپال گاؤں ہے۔ اس گاؤں کا بڑا زمیندار سکھ ہے۔ اس کے زیادہ تر مزارعے سکھ ہی ہیں۔ کھرپال کے بعد کنگر اور اس کے بعد ڈھوک ٹالیاں نامی گاؤں ہیں جہاں میرے پھوپھا زمینداری کرتے ہیں۔

چند ہی قدموں بعد میں تانگہ اسٹینڈ پہنچ گیا۔ چند تانگے اور بیل گاڑیاں دکھائی دیں مگر وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ ان میں سے کوئی جانے پر آمادہ ہو گا یا نہیں۔

میں نے اپنا سامان جھگی نما ریستوران کے باکڑے پر رکھا۔ قریب ہی ایک تانگہ کھڑا تھا۔ گھوڑے کو سردی سے بچانے کے لئے بڑی مہارت سے بوریاں لپیٹ دی گئی تھیں اور کوچوان موٹا سا کمبل لپیٹے تانگے ہی میں گٹھڑ بنا بیٹھا تھا۔

''کیوں پہلوان جی۔ چلو گے۔'' میں کوچوان سے مخاطب ہوا۔ میری آواز پر اطراف کے لوگ میری طرف متوجہ ہو چکے تھے۔

''آہو باؤ جی۔ کہاں جانا ہے......'' وہ مستعدی سے بولا۔

اور بے ساختگی میں' میں نے اپنے گاؤں کا نام لے لیا۔

قارئین کرام۔ میں نے ارادتاً اپنے گاؤں کا نام چھپا دیا ہے۔ اس کے لئے معذرت خواہ ہوں۔

جیسے ہی میں نے اپنے گاؤں کا نام لیا' کوچوان کی ساری مستعدی دھری کی دھری رہ گئی۔

''معاف کرنا باؤ جی۔ میں صرف اندرون شہر کی سواریاں پکڑتا ہوں کسی بھی گاؤں کی

سواری نہیں بٹھاتا۔

کچھ کہے بغیر میں چند قدم دور کھڑے ہوئے تانگے کی طرف بڑھ گیا۔ دوسرا کوچوان لباس و پگڑی کے لحاظ سے سکھ تھا۔

"سردار جی۔ چلو گے......"

"آہو جی بادشاہو۔ پر کہاں جانا ہے......" سردار جی بڑی جی داری سے بولا۔

"چوہدری نظام کے گاؤں تک جانا ہے......" میں نے ردعمل جاننے کی غرض سے نام لیا۔

"کس بھیڑیے کا نام لیا ہے بادشاہو......" وہ نفرت سے منہ سکیڑتے ہوئے بولا۔

"ویسے بھی راستہ ناہموار ہے۔ میں آپ کی ضرورت کی خاطر چل بھی پڑوں تب بھی پہنچتے، پہنچتے صبح ہو جائے گی۔ درمیان میں بھوت پلید بھی بہت ہیں۔ بھیڑیوں اور سانپ بچھوؤں سے الگ واسطہ پڑے گا......"

"ہوں۔ اچھا ڈھوک ٹالیاں چلو گے......"

ڈھوک ٹالیاں کی مشہوری کا باعث ٹالی کے درختوں کی بہتات ہے، میرے پھوپھا زمینداری کے ساتھ ٹالیوں کی ٹھیکیداری بھی کرتے تھے۔

"باؤ جی۔ ڈھوک ٹالیاں تو بہت ہی خطرناک جگہ ہے۔ خونخوار بھیڑیوں، خونی چمگادڑوں اور دنیا کے زہریلے ترین سانپوں کا مسکن ہے۔ سورج ڈھلنے سے پہلے ہی وہاں موت ہی موت منڈلانے لگتی ہے۔ بزرگوں سے سنا ہے کہ چڑیلیں بھوت اور دیگر ارواح خبیثہ کی حکمرانی شروع ہو جاتی ہے۔

میں بزدل نہیں ہوں باؤ جی اور نہ ہی مجھے اپنی زندگی سے کوئی دلچسپی ہے، میں جو کچھ کہہ رہا ہوں صرف آپ کی بھلائی کی خاطر ہے......"

"اوہ یارا۔ کن الجھاوؤں میں ڈال دیا تم نے......" میں نے بظاہر لاپرواہی سے جواب دیا لیکن حقیقت یہ ہے کہ سردار جی کی معلومات نے میرے پورے وجود میں سنسنی سی دوڑا کر رکھ دی تھی۔

"چنگا دوستا' بھلا کریالہ ہی لے چلو......" میں نے جملہ مکمل کر دیا۔

"آہو جی بادشاہو۔ بیٹھ جائیے۔ بھلا کریالہ زیادہ دور بھی نہیں ہے گھنٹہ سوا گھنٹے میں پہنچ جائینگے......" وہ خوشی خوشی کمبل چھوڑ کر اترا اور میرا سامان بڑی احتیاط سے رکھنے لگا۔

"ایک پنتھ دو کاج۔ بھلا کریالہ میں میرا جگری یار رندھیر سنگھ رہتا ہے۔ آپ کو منزل مل جائے گی اور میری یار سے ملاقات بھی ہو جائے گی......" کوچوان کچھ کچھ باتونی بھی لگ رہا تا۔

میرے لبوں سے سکون کی سانس نکلی۔ خالہ ماں' خالو اور ان کے دیگر اہل خانہ سے ملنے کی بے انتہا خوشی ہونے لگی۔ بالخصوص اپنی دونوں چھوٹی بہوں فوزیہ اور فرحین سے ملنے کی شدید آرزو نے میرے دل کی دھڑکنیں بڑھا کر رکھ دیں' میری سانسیں تک وزنی ہو گئیں۔



سناٹا شروع ہو گیا۔ دائیں بائیں' آگے پیچھے اندھیرا ہی اندھیرا' ویرانی ہی ویرانی تھی۔ سر پر اگر ستاروں بھرے آسمان کا احساس نہ ہوتا تو میں خود کو قبر میں نہ سہی' اندھے کنویں میں گرتا ہوا محسوس کرتا۔

اندھیرے کنویں میں اس لئے کہ تانگے میں مجھے شدید ہلکورے لگ رہے تھے سناٹے کا یہ عالم تھا کہ گھوڑے کے تنفس کی پھنکاریں صاف سنائی دے رہی تھیں۔

پیچھے مڑ کر دیکھنے سے یوں لگتا جیسے کہر کے ہلکے پردوں پر جگنو سے چمک رہے ہوں۔ چمگادڑوں کی اڑان جاری تھی۔ تانگے کے دونوں جانب چھوٹی لالٹینیں جل رہی تھیں جن کی مدہم سی روشنی صرف محسوس کی جا سکتی تھی۔ میں سردار جی کے ساتھ آگے ہی بیٹھا تھا۔

"نام کیا ہے تمہارا سردار جی......" ماحول کی ہولناکی سے اپنی توجہ ہٹانے کے لئے میں نے لب کشائی کی۔ "رمھیر سنگھ۔ہے میرا نام۔ اگر برا محسوس نہ کریں تو آپ......"

"ہاں ہاں رمھیر سنگھ......" میں اس کا مطلب سمجھ کر جملہ اچکتے ہوئے بولا۔

"میرا نام وصی الدین ہے اور میں چغتائی ہوں......" میں نے نام بتلا دیا میرا خیال تھا

کہ رمھیر سنگھ مجھ سے کچھ مزید جاننا چاہے گا مگر دس منٹ کا صبر آزما وقت گزر جانے کے بعد بھی جب وہ خاموش رہا تو مجھ پر جھلاہٹ سوار ہو گئی۔

"کیا ہوا رمھیر سنگھ، تم خاموش کیوں ہو گئے......"

"کیا بتلاؤں باؤ جی۔ اپنی حماقت پر پچھتا رہا ہوں......

"حماقت پر۔" میرے لہجے میں حیرت تھی۔

"آہو جی بادشاہو۔ دراصل میں دن میں بھی شہر سے باہر کی سواری بٹھاتا ہوں تو اپنے گھر والوں کو ضرور بتاتا ہوں۔ چہ جائیکہ میں اس ٹھٹھرتی رات میں گھر والوں کو بتائے بغیر چل پڑا ہوں۔ دراصل آج کل ڈاکے بہت پڑنے لگے ہیں۔ کنواری کڑیوں کے اغواء اور قتل کا سلسلہ سا جاری ہو گیا ہے۔

شہر ہو یا گاؤں کوئی مقام بھی ڈاکوؤں کی دسترس سے باہر نہیں ہے۔ گو کہ ہر چھوٹے بڑے گاؤں میں چیک پوسٹیں قائم کر دی گئی ہیں۔ ہتھیار بند پولیس کے جوان گھوڑوں اور جیپوں پر گشت بھی کرتے رہتے ہیں، مگر آج تک نہ تو کوئی ڈاکو پکڑا جا سکا ہے اور نہ ہی قتل یا قاتل کا سراغ مل سکا ہے۔

ایسے میں میرے گھر والے بہت پریشان ہو جائینگے۔ تھوڑا سا اطمینان اس لئے ہے کہ جب میرے بھائی میری تلاش میں تانگہ اسٹینڈ پہنچیں گے تو انہیں میرے متعلق صحیح اطلاع مل جائے گی......"

"آں......ہاں......" میں پرسوچ لہجے میں بولا۔

"کہہ تو تم ٹھیک رہے ہو، مگر گھبراؤ نہیں۔ میں جنگ عظیم کا ایک منجھا ہوا فوجی ہوں' اسلوب جنگ سے بھی پوری طرح واقف ہوں۔ وقت پڑنے پر دیکھ لینا' ڈاکوؤں کی لاشوں کے ڈھیر لگا دونگا......"

"اوناں جی باؤ۔ میں گھبرا نہیں رہا۔ خنجر اور ترپال میرے پاس بھی ہے فکر صرف اس بات کی ہے کہ اگر ہم نے دو چار ڈاکو مار بھی دیئے تو پولیس الٹا ہمیں گرفتار کر لے گی۔"

"وہ کیوں۔ پولیس ہمیں کیوں گرفتار کرے گی "

"یہ پولیس والے اپنے باپ کو بھی نہیں بخشتے باؤ جی۔ کہتے ہیں قانون کو ہاتھ میں لینے والوں کا یہی انجام ہوتا ہے۔

ابھی کوئی چند روز پہلے چکوال کے ایک بڑے بیوپاری کے گھر پر ڈاکہ پڑا۔ بیوپاری کا نام ملک صفدر حسین ہے۔ اس کے چوکیدار دینو چاچا کی نے بڑی جوانمردی سے ڈاکوؤں کا مقابلہ کیا اور دو ڈاکوؤں کو کاٹ کر رکھ دیا۔ خود بھی بری طرح زخمی ہوا تھا' مگر شاباش دینے کی بجائے پولیس نے دینو چاچا کو پکڑ لیا ملک صاحب نے دینو کو چھڑانے کے لئے پانی کی طرح پیسہ بہایا۔ اثرورسوخ استعمال کیا مگر دینو کو پھانسی کے پھندے سے نہیں بچا سکے......"

"پرواہ مت کرو میرے یار ہمارے ساتھ ایسا نہیں ہوگا......" میں نے کہا۔

"آپ نہیں جانتے باؤ جی۔ جب تک چوہدری نظام کی حویلی انگریز مہمانوں کی آماجگاہ بنی رہے گی۔ چوہدری کا بڑا بیٹا چوہدری امام چکوال کا ڈپٹی کمشنر' چوہدری عبدالسلام سپرنٹنڈنٹ آف پولیس اور چوہدری بہرام ڈائریکٹر آف آروینیو رہیں گے' ظلم و ناانصافی' ڈاکہ زنی و اغواء کی وارداتیں ہوتی رہینگی......"

"کیا کہہ رہے ہو سردار جی......" میں انجان بن کر کوچوان سے مزید معلومات حاصل کرنے کی غرض سے بولا۔

"صحیح کہہ رہا ہوں صاحب۔ ہر عام و خاص کا تاثر یہی ہے کہ ڈاکوؤں کا سردار چوہدری ارسلان ہے' چوہدری نظام کا سب سے چھوٹا بیٹا سب جانتے ہیں کہ وہ شرابی' زانی اور عزتوں کا سوداگر ہے......"

"اوہ۔ تو پھر لوگ اس کے خلاف بغاوت کیوں نہیں کرتے......"

"توبہ کریں جی۔ اپنی جان و عزت کسے عزیز نہیں ہوتی۔ کیا تھا احتجاج کسی عمادالدین نامی دیندار بوڑھے نے......"

اپنے دادا کا نام سنتے ہی میرے رگ و پے میں شعلے سے دوڑتے چلے گئے' جب کہ سردار جی میری کیفیت سے بے خبر کہتا ہی رہا۔ ویسے بھی اس قدر اندھیرا تھا کہ ہم ایک دوسرے کے تاثرات کا اندازہ ہی نہیں لگا سکتے تھے۔

"بہت ہی مالدار تھا مگر' جان سے گیا' مال ودولت' عزت وآبرو سب کچھ گنوادی...... ہوشیار باؤ جی۔ شاید پولیس جیپ ہو......"

گو کہ میرے ذہن پر آندھیاں سی چلنے لگی تھیں' ذہن میں انتقام کے شعلے رقص کرنے لگے تھے' میں اگر یہ کہہ دوں کہ سراپا قہر بن چکا تھا تو بے جانہ ہوگا۔

میں سامنے ہی تک رہا تھا۔ کہر کے بادل زمین سے آسمان تک چھائے ہوئے تھے' ٹھنڈک کا یہ عالم تھا کہ پورا جسم برف بن چکا تھا۔ میں دیکھ چکا تھا کہ دھند کے دبیز پردوں کو دو جگنو سے چیرتے ہوئے قریب ہو رہے ہیں' جن کی جسامت بھی بڑھ رہی تھی۔

☆☆☆

جیپ تانگے کے قریب ہی پہنچ کر رک گئی۔ جیپ کا انجن بیدار تھا اور ہیڈ لائٹس روشن تھیں۔ نہ میں تانگے سے اترا اور نہ ہی رمھیر سنگھ کو اترنے دیا۔

جیپ میں ڈرائیور کے ساتھ گرم اوور کوٹ اور موٹے سے اونی کمبل میں لپٹا ہوا اے ایس آئی بیٹھا تھا۔ پچھلی نشست پر چار کانسٹیبل اونی اور گرم کمبلوں میں لپٹے ہوئے بیٹھے تھے۔ ان کے سروں پر پگڑیاں بندھی ہوئی تھیں۔

"کون ہے بے تو......" انسپکٹر (اے ایس آئی) رمھیر سنگھ پر تارچ کی روشنی ڈالتے ہوئے ہتک آمیز لہجے میں بولا۔ وہ لب ولہجہ اور داڑھی کے لحاظ سے سکھ ہی لگ رہا تھا۔

"رمھیر سنگھ مائی باپ......" کوچوان نے جواب دیا۔

"کہاں سے آرہا ہے اور کہاں جارہا ہے......" اے ایس آئی سابقہ لہجے میں بولا۔

"چکوال سے آرہا ہوں اور بھلا کریالہ گاؤں جارہا ہوں......"

"ہوں......" "کون ہے تیرے ساتھ......"

اے ایس آئی کے بے جا سوالات نے مجھے الجھن میں مبتلا کر دیا' لہٰذا رمھیر سنگھ کے جواب دینے سے پہلے ہی میں بول اٹھا۔

"وقت ضائع کر رہے ہو آفیسر۔ جس مقصد کے لئے تانگہ رکوایا ہے وہ پورا کرو......"

"اوہو وقت ضائع ہو رہا ہے تمہارا......" تحقیر آمیز لہجے میں کہتے ہوئے اے ایس آئی

بادل نخواستہ جیپ سے اترا اور سائے کی مانند چلتے ہوئے میرے قریب پہنچا اور ٹارچ کی تیز روشنی میرے چہرے پر ڈالی۔

"ہلے بھئی ہلے......" وہ میرے سراپا کا جائزہ لیتے ہوئے متاثر کن لہجے میں بولا اور اپنے ماتحتوں کی جانب مڑا۔

"چلو جوانو۔ سامان کی تلاشی لو......"

"ٹھہرو......" میرا لہجہ یک بیک بھیانک ہو گیا۔ مجھے خود اپنے لہجے کی تبدیلی پر حیرت ہوئی تھی۔ ایک اور تبدیلی بھی میں نے اپنے وجود میں محسوس کی تھی۔ وہ یہ کہ میرا سراپا اچانک ہی گرما گیا تھا۔

"میرے سامان کی تلاشی لینے سے پہلے میرا کارڈ دیکھ لو......" کہتے ہوئے میں نے کوٹ کی جیب سے برٹش گورنمنٹ کا کارڈ نکال کر اسے ایس آئی کو تھما دیا۔

وہ میری شخصیت سے متاثر تو ہو ہی چکا تھا' لہٰذا میرا کارڈ لے کر ٹارچ کی روشنی میں دیکھا' پڑھا اور پھر فوراً ہی اٹینشن ہو کر مجھے سیلوٹ کیا۔

"سوری میجر' سر' میں نے آپ کا وقت ضائع کیا۔ دراصل ڈاکوؤں وغیرہ......"

"ٹھیک ہے......" میں اس کا جملہ اچکتے ہوئے بولا۔

"مجھے رمھیر سنگھ بتلا چکا ہے' چلو رمھیر......" جملے کے آخری الفاظ میں نے کوچوان سے کہے۔

"اوئے رمھیر۔ میجر صاحب کو بڑی احتیاط سے لے جانا۔ اور سر' اگر میرے لائق کوئی خدمت ہو تو میں بھلا کریالہ چوکی پر ہی متعین ہوں......"

اے ایس آئی کے آخری الفاظ ختم ہونے تک تیز ہنہناہٹ کے ساتھ گھوڑا آگے بڑھ چکا تھا۔

"مم' معاف کرنا باؤ جی۔ میں آپ کو ایک عام سا فوجی سمجھ ہوئے تھا......"

"او یارا۔ کیوں پریشان ہوتے ہو تم مجھے وہی کچھ سمجھتے رہو جو سمجھتے رہے تھے......"

اس قسم کی باتیں ہوتی رہیں' گھوڑے کی ٹاپیں گونجتی رہیں اور تانگہ آگے بڑھتا رہا۔

ابھی ہم بمشکل تین میل کا فاصلہ ہی عبور کرنے پائے تھے کہ اچانک ہی گھوڑے کی ہن ہناہٹ میں پاگل پن سوار ہو گیا' اس نے بھیانک ترین ہن ہناہٹ کے ساتھ اگلے دونوں پیر زمین سے اٹھا دیئے یہ تو اچھا ہوا کہ پشتی سیٹ پر میرا سامان مضبوطی سے بندھا ہوا تھا ورنہ گر پڑتا۔

پھر' اگلے پیر زمین سے ٹکاتے ہی گھوڑا طوفان بن گیا۔ کوچوان نے لگام کھینچ کر گھوڑے کو نارمل رکھنے کی اپنی سی کوشش کر لی مگر گھوڑا تانگے سمیت ہوا سے باتیں کرنے لگا۔

''باؤ جی۔ پشتگاہ کو مضبوطی سے تھام لیجئے۔ گھوڑے نے بالیقین کسی شر شیطان' چڑیل بھوت یا ارواح خبیثہ کو دیکھ لیا ہے......''

کوچوان کے لہجے میں عجیب سی کپکپاہٹ اور بھاری پن سما چکا تھا۔ محسوس تو میں بھی کر چکا تھا۔ اسی لئے میں نے اپنی سی کوششیں شروع کر دی تھیں ساتھ ہی ریوالور بھی جیب سے نکال لیا تھا۔

گھوڑا اصل گزرگاہ کو چھوڑ کر دائیں جانب کے ڈھلوانی راستے پر دوڑنے لگا تھا۔ یوں لگا جیسے گاڑی یا اس کے پہیے ٹوٹ جائیں گے۔ تانگہ دائیں بائیں اس قدر جھٹکے لینے لگا کہ سلامتی کی امید ڈوبتی محسوس ہوئی کہیں نشیب تھا تو کہیں فراز۔ گھپ اندھیرا گہرے دبیز پردے اور ڈراؤنے سناٹے میں کچھ بھی تو سجھائی نہیں دے رہا تھا۔

چونکہ میں اپنے سامان کی طرف سے فکر مند تھا اس لئے بار بار پشتی جانب گردن موڑ رہا تھا۔

معاً میری نظریں ایک وجود پر پڑیں۔ بلکہ یوں کہنا مناسب ہے کہ قد آدم سے چند انچ بڑا ایک وجود' جس کا گردن سے نچلا دھڑ آگ کی طرح دہک رہا تھا۔ آنکھوں کی جگہ دو پانچ پانچ سو وولٹ کے بلب سے روشن تھا' ہمارے تانگے کے پیچھے لپک رہا تھا۔ درمیانی فاصلہ چند گز ہی تھا جو گھٹتا جا رہا تھا۔

حیرت انگیز طور پر مجھے کوئی خوف محسوس نہیں ہوا' برعکس اس کے میں نے نشانہ

لے کر ٹریگر دبا دیا۔

دھائیں کی ہولناک آواز سے سناٹا ریزہ ریزہ ہو گیا' میرے پستول کی نال سے ایک شعلہ نکلا اور آتشی وجود سے ٹکرا گیا۔ بالکل یوں محسوس ہوا جیسے وہ منہ کے بل زمین پر گر کر آگ کے گولے کی طرح لڑھکنیاں کھانے لگا ہے۔

ایک لمحہ کی تاخیر کے بغیر میں نے دو فائر اور کر دیئے اس دوران ہمارا گھوڑا ایک لمبا چکر کاٹ کر دوبارہ اصل گزرگاہ کی طرف بڑھ چکا تھا اچانک شعلہ جوالا وجود پھر کھڑا ہو گیا اور...... کھڑا ہی رہا۔ ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا البتہ اس کی شعلہ بار آنکھیں مجھ پر ہی مرکوز رہیں گھوڑا سرپٹ دوڑ تا رہا اس کی خوفناک پھنکاریں نارمل ہوتی گئیں یہاں تک کہ تانگہ صحیح گزرگاہ پر پہنچ گیا آتشی وجود کا کہیں نشان تک نظر نہیں آیا۔

''کیا حال ہیں رمھیر سنگھ......'' میں درست زاویے سے بیٹھتے ہوئے لاپرواہی سے بولا۔

رمھیر سنگھ نے کوئی جواب نہیں دیا وہ گھوڑے ہی کو چمکارنے اور کنٹرول کرنے میں مصروف رہا۔

''جی باؤ جی۔ آپ نے 'کس پر گولی چلائی تھی......'' ہر طرح سے مطمئن ہونے کے بعد کوچوان گویا ہوا۔

''کیا تم نے نہیں دیکھا......'' میں متعجب سا ہو گیا۔

''میں...... میں تو گھوڑے کو کنٹرول کرنے میں مصروف تھا باؤ جی۔ اگر ذرا دیر کو بھی میری توجہ گھوڑے سے ہٹ جاتی تو گرو جانے ہمارا اور تانگے کا کیا حشر ہوتا......''

ایک طرح سے مجھے خوشی ہوئی کہ رمھیر سنگھ نے وہ کچھ نہیں دیکھا جو میں دیکھ چکا تھا۔ اگر کوچوان ایک جھلک بھی دیکھ لیتا تو شاید وہ فرط خوف سے پاگل ہو جاتا۔

دوسری طرف مجھے تعجب ہونے لگا کہ مجھے کیوں رتی برابر بھی خوف محسوس نہ ہوا بلکہ آتشی ہیولے کو میں ایک تماشبین کی سرح دیکھتا رہا تھا۔ شاید اس لئے کہ میرے وجود میں گنز اسمائی ہوئی تھی۔ یا شاید اس لئے کہ در پردہ وہی برگزیدہ شخصیت میری مسلسل حفاظت

کر رہی تھی۔ جو کچھ بھی تھا' میں اس تبدیلی پر بہت ہی خوش تھا۔

"ارے بھئی وہ تین بھیڑیے تھے۔ میں نے تین فائر کر کے تینوں کو مار ڈالا ہے......" میں نے غلط بیانی سے اس لئے کام لیا کہ رمھیر نے بہر حال واپس جانا ہے۔ چاہے رات میں چاہے صبح۔

ہمارا تانگہ اب ہرے بھرے کھیتوں سے نکل کر دائیں بائیں طویل القامت اور گنجان درختوں کے درمیان راہ گزر پکڑ چکا تھا۔ اس طرح اندھیرا کچھ زیادہ ہی گہرا ہو گیا تھا۔ سناٹا اور کہرا اپنی تمام تر حشر سامانیوں سے چھایا تھا۔

"عجیب بات ہے باؤ جی۔ میں نے تو بزرگوں سے یہی سنا ہے کہ گھوڑا غیبات کو دیکھ لیتا ہے اور اپنی جان پر کھیل کر مالک کو بچانے کی کوشش کرتا ہے' آپ یقین جانیے صاحب گھوڑے کے بدکتے ہی میری سٹی گم ہو چکی تھی۔ اگر آپ کا ساتھ نہ ہوتا تو شاید میرا ہارٹ فیل ہو جاتا......"

"ارے نہیں یار۔ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ بھیڑیے بھی تو اروا ح بد ہیں......"

"ہاں باؤ جی۔ آپ ہی کا خیال درست ہے۔ چند برس پہلے ان راستوں اور کھیتوں میں کوئی قابل ذکر واقعہ نہیں ہوتا تھا مگر جب سے ڈاکہ زنی' قتل و غارتگری' چوہدریوں اور انگریزوں کا ملا جلا ظلم و ستم شروع ہوا ہے چکوال سے چووہ سیدن شاہ تک کا علاقہ ناقابل یقین اور محیر العقل واقعات کا گڑھ بن چکا ہے۔ کہیں بھوت پریت نظر آجاتے ہیں تو کہیں انسانوں اور چوپائے جانوروں کی ادھڑی ہوئی لاشیں پڑی سڑ رہی ہوتی ہیں۔ کہیں چڑیلیں ٹہلتی نظر آتی ہیں اب تو مزارعے بیچارے بھی سورج غروب ہونے سے پہلے گھروں کو چل دیتے ہیں اور سورج غروب ہونے کے بعد گاؤں والے اپنے دروازے بند کر کے گھروں میں ہی دبکے رہتے ہیں۔ بہت کم لوگ مسجدوں' مندروں اور گردواروں میں عبادت کے لئے جاتے ہیں۔

"رندھیر سنگھ یہ اتنی ساری معلومات کیسے تمہیں حاصل ہوئیں......" میں دلچسپی لیتے ہوئے بولا۔

''ہو جاتی ہیں باؤ جی۔ میرے شہر چکوال میں ہر ایک گاؤں کے افراد جایا کرتے ہیں۔ وہی لوگ عجیب و غریب واقعات بتلاتے ہیں۔ اور تو اور' سنا ہے ڈھوک ٹالیاں کے جنگل میں پنڈت دھیراج اگھوری اپنے چیلوں سمیت کسی پاتال میں رہتا ہے انگریز' سکھ' ہندو اور مسلمان اسے بہت ہی پہنچی ہوئی ہستی سمجھ کر ہر منگل کو اس کے آستانے پر جاتے ہیں بالخصوص چوہدری نظام اور اس کے بیٹے تو پنڈت دھیراج اگھوری کے خاص الخاص مرید ہیں۔ صاحب دائیں جانب نشیب میں دیکھئے۔ روشنی نظر آ رہی ہے۔ یہی بھلا کریالہ کی چیک پوسٹ ہے......''

میں نے خالی الذہنی سے مغربی سمت دیکھا۔ واقعی پتھر کی بنی ہوئی عمارت میں جا بجا روشنی نظر آ رہی تھی۔

یہ تو میرا غیر ارادی جائزہ تھا ورنہ حقیقت یہ تھی کہ پنڈت دھیراج کے تذکرے پر میرا ذہن سینکڑوں فٹ کی بلندیوں پر قلابازیاں کھانے لگا تھا۔ ایک ایک کر کے سارے گزرے ہوئے واقعات میرے شعور پر گڈمڈ ہونے لگے تھے۔



واقعی وہ چیک پوسٹ یا پولیس چوکی تھی۔ قریب ہونے کی وجہ سے پتہ چلا کہ پتھر کی نہیں بلکہ سرخ اینٹوں کی عمارت تھی۔ دو منزلہ پر بنی ہوئی اس عمارت کی بالائی منزل کی کھڑکیاں گو کہ بند تھیں مگر روشن تھیں۔

واحد خارجی و داخلی طور پر ایک ہی گیٹ تھا۔ اندرونی جانب صحن میں ایک ٹرک' دو جیپیں اور چند گھوڑے بندھے ہوئے کھڑے تھے۔ گھرر گھرر کی تیز آواز سے ظاہر تھا کہ کسی طرف طاقتور جنریٹر چل رہا ہے۔

جو کچھ بھی تھا' ہمارے گھوڑے کی ہنہناہٹ' ٹاپوں اور پھنکاروں کی آواز سن کر کسی طرف سے تین پگڑی والے پولیس مین کمبلوں میں لپٹے ہوئے ظاہر ہوئے ان میں سے ایک کے پاس لمبی بندوق بھی تھی۔ ''کون ہو جی آپ......'' ایک کمبل پوش پولیس والا میرے قریب پہنچ کر کھردرے لہجے میں بولا۔ گو کہ وہ ڈبل کمبل لپیٹے ہوئے تھا۔ اس کے

ہاتھوں پر دستانے بھی چڑھے ہوئے تھے۔ اس کے باوجود وہ تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اس کی آواز بھی تھر تھرا رہی تھی۔

مجھ پر ایک نظر ڈالتے ہی وہ مرعوب ہو چکا تھا۔ ہمارا تانگہ رکوانے والا گارڈ گیٹ کے ساتھ بنے ہوئے کیبن میں دبک چکا تھا۔

''گوشت پوست کا انسان ہوں۔ کیوں رکوایا ہے تانگہ......'' میں اندرونی جانب نظریں دوڑاتے ہوئے بولا۔ میرے لہجے میں از خود کرختگی سما چکی تھی اور اس تبدیلی پر میں خود حیران تھا۔

سوال کے دوران پھاٹک سے صرف چند قدم اندرونی جانب' نیم تاریک برآمدے میں میں نے ایک انوکھا منظر دیکھ لیا تھا۔ میں نے دیکھا دو پگڑی والے ایک جواں سالہ عورت کو گھسیٹتے ہوئے کسی طرف لے جا رہے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ عورت بے ہوش ہے۔

''برا نہ منانا صاحب جی۔ یہ ہماری ڈیوٹی ہے کہ ہر آنے جانے والے کو چیک کریں......'' کانسٹیبل کا لہجہ مؤدبانہ تھا۔

''تو پھر کر لو چیک۔ میرا نام میجر وصی الدین چغتائی ہے۔ میں برطانیہ سے آیا ہوں اور میں اپنے خالو کمال الدین چغتائی کے گھر جا رہا ہوں......''

''آپ اصل میں کہاں رہتے ہیں صاحب......''

میں نے بلا جھجک اپنے گاؤں کا نام بتلا دیا اور غور سے مخاطب کا جائزہ لیا' مگر اس کے چہرے کے تاثرات پر کوئی تبدیلی نہ پا کر میں مطمئن ہو گیا۔

''اوہ۔ آپ آپ چوہدری نظام کے عزیز تو نہیں ہیں......'' وہ گھبرا سا گیا۔

''تمہیں اس سے کیا غرض......'' میری نظریں مشکی کلر گھوڑے پر مرکوز تھیں جو اپنی ٹاپوں سے زمین کھرچ رہا تھا۔ اس کی چرمی لگام ایک ایسے کھمبے سے بندھی ہوئی تھی جس کے بلند سرے پر بلب جل رہا تھا۔ ''کوئی غرض نہیں صاحب...... یہ...... یہ گھوڑا جو آپ دیکھ رہے ہیں چوہدری ارسلان کا ہے۔ کیا آپ ملنا چاہیں گے......'' مخاطب پر بوکھلاہٹ

سوار ہو چلی تھی۔ ''کیا وہ اکثر یہاں آتے ہیں......'' میں اس کے سوال کو نظر انداز کر گیا۔

''جج، جی ہاں صاحب......''

''ہوں۔ اور وہ عورت کون ہے......''

''کک، کون سی عورت صص صاحب......'' وہ مزید بوکھلا گیا۔

''وہی جسے تمہارے سپاہی ابھی ابھی کھینچتے ہوئے لے گئے ہیں......''

میرا لب و لہجہ از خود بھیانک ہو تا گیا۔

''ارے وہ...... وہ کھیتوں میں بے ہوش پڑی تھی صاحب۔ ہم اسے حفظ ماتقدم کے طور پر اٹھا لائے ہیں یہ سوچ کر کہ صبح اسے شناخت کے لئے گاؤں میں لے جائیں گے......''

''ویری گڈ، بہت اچھا کام کیا ہے۔ وہ جس حالت میں بھی ہے اسے لے آؤ، میں اسے تانگے میں لئے جاتا ہوں۔ بے شک رجسٹر میں اندراج کر کے مجھ سے دستخط لے لو۔ صبح میں خود اسے اس کے وارثوں کے سپرد کر دونگا......''

''لل، لیکن صاحب، سپرنٹنڈنٹ پولیس اور ڈی سی چکوال مجھے، مجھے سزا وار ٹھہرائینگے۔ ہو سکتا ہے مجھے ملازمت سے علیحدہ کر دیں......''

''ہوں، اس وقت تھانے میں کتنے لوگ موجود ہیں......''

''گگ، گیارہ۔ ایک گارڈ ہے، چھ کانسٹیبل ہیں۔ میں ہوں، چوہدری ارسلان ہے اور اس کے تین ساتھی ہیں......'' تعداد بتلانے کے ساتھ ہی وہ اس تیزی سے کانپنے لگا۔

''کیا نام ہے تمہارا......''

''دد، دیدار خان اور میں ہیڈ کانسٹیبل ہوں......''

''بے ہوش عورت کو ارسلان کے لئے اغواء کیا ہے......''

''جی ہاں، جج، جی نہیں صاحب......'' میرے بے ساختہ سوال پر دیدار خان بھی بری طرح ہکلا گیا اس نے سنبھالا لینے کی کوشش کی تھی مگر میں نے اسے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا بلکہ عقاب کی طرح جھپٹا مار کر دائیں ہاتھ سے اس کی گردن دبوچ لی۔ بیک وقت بائیں

ہاتھ سے بندوق بردار کی گردن دبوچ لی۔

"سردار جی' تیسرے کو دبوچ لو۔ خبردار' کوئی آواز نہ ہونے پائے۔ نہ جانے وہ کون سی قوت تھی جس نے مجھے ایسا سب کچھ کرنے پر اکسایا میری سرسراتی آواز بھی بالکل غیر انسانی ہو چکی تھی۔

بجلی کی سی تیزی سے رمھیر سنگھ نے میرے حکم کی تعمیل کی۔ تینوں کانسٹیبلوں کی آوازیں ان کے حلق میں گھٹ گئیں۔ ان کے جسم پھڑ پھڑانے لگے' آنکھوں کے ڈھیلے اور زبانیں ابلنے لگیں۔

ذرا سی دیر میں تینوں کانسٹیبل زندگی کی قید سے آزادی ہو گئے۔ انہیں احتیاط سے زمین پر ڈالنے کے بعد میں نے بدستور سفاکانہ سرگوشی میں رمھیر سنگھ کو مخاطب کیا۔

"تینوں لاشوں کو احتیاط سے اٹھاؤ اور پھاٹک کے بائیں سمت والے تاریک حصے میں ڈال دو......"

جواب کا انتظار کئے بغیر میں پھاٹک سے نکل کر گارڈ کیبن میں داخل ہو گیا۔ کیبن میں زیرو وولٹ بلب کی روشنی تھی اور گارڈ کیبن کی دیوار سے سر ٹیکے اونگھ رہا تھا۔ اس کی بندوق قریب ہی رکھی تھی۔

پھر' اس سے پہلے کہ گارڈ آنکھیں کھولتا' میں نے اس کی گردن دبوچ لی۔ ذرا سی دیر میں گارڈ تڑپ تڑپ کر ساکت ہو گیا۔

مطمئن ہو کر میں جب رمھیر سنگھ کے قریب پہنچا تو وہ اپنے کام سے فارغ ہو کر پورے اطمینان سے کھڑا ہوا تھا۔

"تانگے میں بیٹھ جاؤ' رمھیر اور میری واپسی کا انتظار کرو......

کہتے ہوئے میں گھوڑوں پر اچٹتی سی نظر ڈالتے ہوئے نیم تاریک برآمدے کی طرف بڑھ گیا۔

گاہے گاہے گھوڑوں کی ہنہناہٹ اور ٹاپوں سے زمین کھرچنے کی آوازیں آسیبی سناٹے میں ارتعاش سا پیدا کر دیتیں ورنہ یوں لگتا جیسے میں خود آسیب ہوں۔ ویران و

سنسان چیک پوسٹ کا آسیب۔

میرا رخ اسی طرف تھا جہاں میں نے دو کانسٹیبلوں کو بے ہوش عورت کو لے جاتے ہوئے دیکھا تھا۔

اسی وقت میں نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ مظلوم عورت کی عصمت اور زندگی کو ضرور بچاؤں گا۔ مجھے یہ بھی یقین تھا کہ اس حرکت کا ذمے دار ارسلان ہے اور پولیس اس کی پشت پناہی کر رہی ہے۔ ایسی چند ظالمانہ حرکات کا ذکر میرے ابا نے اپنی یادداشت بک میں کیا تھا۔

اچانک' قدموں کی واضح دھمک سن کر مجھے تاریک اوٹ لینی پڑی۔

جی ہاں' وہاں سے زینے ہی شروع ہوتے تھے جو ایک موڑ کے بعد بالائی منزل پر ختم ہوتے تھے۔

"یار بابو رام۔ لڑکی بہت خوب صورت ہے......"

میری سماعت سے مردانہ اور سرگوشیانہ آواز ٹکرائی۔ میں کچھ مزید دیوار کی سمت سرک گیا اور احتیاطاً اپنی سانس بھی روک لی تھی۔

"ہاں۔ ہے تو۔ کم بخت کے نقش و نگار بھی غضب کے ہیں لیکن۔ ہماری باری تو تب آئے گی جب چھوٹا چوہدری اور اس کے تینوں ساتھی فارغ ہو جائیں گے......"

بابو رام کا جملہ ختم ہونے تک وہ دونوں آخری زینے پر پہنچ چکے تھے۔ پہنچے ہی تھے کہ میں چھلاوے کی طرح ان کے سامنے پہنچ گیا۔

☆☆☆

چونکہ میں ٹخنوں تک لمبے اوور کوٹ میں ملبوس تھا۔ میرا سیاہ فلیٹ ہیٹ سر پر رکھا تھا۔ جس کا گوشہ میں نے اس قدر پیشانی کی طرف جھکایا ہوا تھا کہ میرا چہرہ تقریباً ڈھک گیا تھا۔ دونوں ہاتھوں میں سیاہ چرمی دستانے چڑھے ہوئے تھے۔

لہٰذا میں جیسے ہی دونوں افراد کے سامنے' کسی بدروح کی طرح پہنچا' دونوں کے لبوں سے بیک وقت خوف و دہشت میں ڈوبی ہوئی ہلکی سی کراہ نکل گئی وہ دم بخود ہو گئے یا یوں

سمجھئے کہ ان پر سکتہ سا سوار ہو چکا تھا۔

پھر' اس سے پہلے کہ میں ان کے نرخرے دبو چتا' میں نے دیکھا' ان کی پتھرائی ہوئی آنکھیں میرے ہیٹ کے گوشے پر مرکوز ہیں۔ فرط خوف سے ان کی سانس انہی کے سینے میں گھٹ کر رہ گئی تھی۔

بالکل ہی غیر ارادی طور پر میں نے اپنا ہیٹ اتار لیا اور یہ دیکھ کر میرے لبوں سے سکون کی سانس نکل گئی کہ وہ گنزا تھی۔ ڈھائی انچ کی ننھی سی گڑیا۔ اس کی آنکھوں سے دودھیائی دھاریں سی نکل کر دونوں سپاہیوں کی آنکھوں سے ٹکرا رہی تھیں۔

اب ساری بات میری سمجھ میں آچکی تھی۔ وہ یہ کہ گنزا نے میرا ساتھ نہیں چھوڑا تھا۔ کبھی تو وہ میرے جسم میں داخل ہو جاتی' کبھی میرے وجود کا حصہ بن کر میری جسمانی' روحانی اور ذہنی قوت کا باعث بن جاتی اور کبھی میرے ہیٹ پر پہنچ کر اپنی مافوق الفطرت قوتوں کا مظاہر کرتی۔

"چغتائی صاحب...... "گنزا کی منمناتی سرگوشی نے مجھے چونکا دیا۔

"بالائی منزل کے پہلے کمرے میں دوشیزہ بیہوش پڑی ہے۔ دبے قدموں جائیے اور اسے اٹھا کر فوراً روانہ ہو جائیں۔

آخری کمرے میں اوباش لوگ شراب پینے میں مصروف ہیں...... "

ایک ہلکی سی چکا چوند ہوئی اور گنزا میرے ہیٹ سے غائب ہو گئی۔ قطع نظر اس کے دونوں کانسٹیبل ہوا نکلے غبارے کی طرح پچک کر ڈھیر ہو چکے تھے۔

ایک لمحہ کی تاخیر کے بغیر میں بے آواز طور پر اوپر چڑھتا چلا گیا۔ زینے کے اختتام پر ہی مجھے روشن کھڑکی نظر آ گئی جب کہ چند قدم جنوب کی طرف کے کمرے کی دونوں کھڑکیاں نظر آ رہی تھیں۔ کوئی آواز تو سنائی نہیں دی البتہ شراب کی بوپارے بالائی ماحول میں رچی بسی ہوئی تھی۔

میں انتہائی احتیاط سے دبے قدموں ملحقہ کمرے میں داخل ہو گیا۔

سامنے ہی زمین پر بچھے ہوئے قالین پر ایک حسین و جمیل دوشیزہ بے سدھ پڑی ہوئی

تھی۔ اس کا چہرہ ہی دکھائی دیا۔ بقیہ جسم موٹے سے کمبل سے ڈھکا ہوا تھا۔

فی الفور آگے بڑھ کر میں نے دوشیزہ کو اٹھا کر اپنے کندھے پر لاد لیا۔ اس سے پہلے کمبل کھینچ کر میں نے اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا تھا۔ محض اس لئے کہ کمبل ہی سے اپنے قدموں کے نشانات مٹاتے ہوئے جاؤں گا۔

تھوڑی سی دقت کے بعد میں نے وہی کچھ کیا جو سوچ رکھا تھا۔

رمھیر سنگھ مجھے دیکھتے ہی مستعد ہو گیا۔ میں نے ہر ممکن احتیاط سے لڑکی کو تانگے کے پشتی حصے پر ڈالا۔ رمھیر سنگھ سے اس کا کمبل لے کر لڑکی کو پوری طرح ڈھک دیا۔ پہلے والا کمبل میں نے پھاٹک پر پہنچ کر پوری قوت سے ٹرک اور جیپ کے درمیان اچھال دیا تھا۔

ہمارا گھوڑا بڑے زور سے ہن ہنایا اور پھر کچی زمین پر تانگہ آگے کی طرف بڑھ گیا۔

دائیں بائیں کچھ کچھ فاصلے پر درخت تھے لہلہاتے کھیت تھے اور درمیان میں اس قدر راستہ تھا کہ دو بیل گاڑیاں بغیر ٹکرائے ہوئے آمنے سامنے سے گزر جائیں۔

کچھ ہی فاصلے پر بہت سے چھوٹے بڑے دھبے محسوس ہو رہے تھے جو یقیناً گاؤں کے مکانات کے ہونگے مگر کہر کی وجہ سے واضح نہیں تھے۔

''رمھیر سنگھ۔ تم خوفزدہ تو نہیں ہو......'' چیک پوسٹ سے کافی دور پہنچنے کے بعد میں نے کوچوان کو مخاطب کیا۔

''نہیں باؤ جی۔ بلکہ مجھے خوشی ہے کہ آپ کی وجہ سے ایک نیک کام میں میرا حصہ بھی شامل ہو گیا

''اس کے باوجود میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تم پر کوئی آنچ نہیں آنے دونگا......''

کہتے ہوئے میں اسے انتہائی اہم ہدایات دیتا رہا۔ میں نے محسوس کر لیا تھا کہ ایک انسان کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد وہ مستقبل سے مایوس سا ہو گیا تھا۔

''بس رمھیر تانگہ روک دو......'' پکی اینٹوں کے بنے ہوئے حویلی نما مکان کے پھاٹک کے قریب پہنچ کر میں نے ہاتھ اٹھا دیا۔

کچھ بھی نہیں بدلا تھا۔ سب کچھ ویسے کا ویسا تھا۔ حالانکہ میں کئی برسوں بعد خالو کے گھر آیا تھا۔ دروازے کے سامنے کچھ فاصلے پر وہی پیپل اور نیم کے گنجان درخت تھے۔ کنویں کے قریب مویشیوں کے پینے کے پانی کا حوض بنا ہوا تھا۔ حوض کے قریب چند گائے بھینسیں بندھی تھیں جو ہمارے گھوڑے کی خوفناک ہنہناہٹ سن کر گردنیں گھمارہی تھیں۔ ان کی گردنوں میں بندھی ہوئی گھنٹیاں پراسرار سناٹے میں جلترنگ سی بجانے لگی تھیں۔ ابھی میں تانگے سے اترنے بھی نہیں پایا تھا کہ ......

"خبردار کوئی حرکت نہ کرنا۔ تم میرے نشانے پر ہو......"

اچانک ہی گیٹ کے قریب ایک اونچے درخت سے کرخت اور تحکمانہ مردانہ آواز سن کر پہچان کر میری تمام حسیات سمٹ کر میرے چہرے پر آجمیں۔ میری آواز بھاری ہو گئی، سانسوں میں تیزی آگئی۔ میں فرط مسرت سے چلا سا پڑا۔

"مم...... میں ہوں لالا...... میں، وصی الدین۔ رفیع الدین کا بیٹا اور عماد الدین کا پوتا ...." میں درخت کی جانب تک رہا تھا مگر مجھے کچھ بھی سجھائی نہیں دیا۔ میری آواز قرب وجوار کے کچے پکے مکینوں نے بھی سن لی ہوگی بشرطیکہ وہ جاگ رہے ہوں۔ ویسے بھی شب کے دس بج چکے تھے۔

میری آواز گو کہ رندھی ہوئی تھی اس کے باوجود میرا جملہ مکمل ہونے تک ایک زوردار دھماکہ ہوا اور ایک دراز قد و قوی ہیکل گبرو جوان عالم دیوانگی میں وصی الدین، میرے بھائی، میرے جگر تو آگیا پکارتا ہوا قریب آیا اور نہ صرف یہ کہ مجھ سے بغلگیر ہو گیا بلکہ مجھے اپنے مضبوط بازوؤں میں دبوچ کر پھرکی کی طرح گھمانے لگا۔ ساتھ ہی اس کے لبوں سے روتی ہوئی آواز بھی نکل رہی تھی۔

ابا جی، اماں جی، دوڑو۔ زمان خان، فرحان خان۔ دوڑو۔ دیکھو تو کون آیا ہے ارے فوزیہ اور فرحین کو جگاؤ۔ وصی الدین آگیا میرا چاند بھائی آگیا۔



رنبھیر سنگھ میرے اور سلطان خان لالا کے بے حد اصرار کے باوجود ہمارے ساتھ

رہنے پر آمادہ نہ ہوا۔ پھر میں نے اسے بیس روپے کرایہ ادا کیا۔ وہ صرف پانچ روپے لینے پر آمادہ تھا مگر میرے بے حد اصرار پر بیس روپے لے کر اپنے دوست رندھیر سنگھ کے گھر کی طرف بڑھ گیا۔

میرے خالو کمال الدین' خالہ ماں' خالہ زاد بھائی' زمان خان اور فرحان خان عالم بے خودی میں حویلی سے باہر آگئے تھے اور باری باری مجھ سے لپیٹ کر فرط مسرت سے بھو ہو کر روتے رہے۔ مجھے بھی گویا ہچکی بندھ گئی تھی اور جب رمبھیر سنگھ کے جانے کے بعد ہم حویلی کے صحن میں پہنچے تو سامنے ہی میری دونوں معصوم و یتیم بہنیں مجسم پتھر بنی کھڑی نظر آئیں۔ میری دونوں خالہ زاد بہنیں حسینہ اور ثمینہ لالٹین تھامے ان ہی کے ساتھ کھڑی تھیں۔

"فوزیہ اور فرحین میرے سینے سے لگ جاؤ۔ اری خاموش کیوں ہو کیا اپنے لالا کو بھول گئیں......" میں بانہیں پھیلا کر' ہچکیاں بھرتے ہوئے اِن کی جانب بڑھا۔

میری دونوں بہنوں کا سکتہ ٹوٹا اور پھر...... مجھے یقین ہے ہم بچھڑوں کا ملاپ دیکھ کر فرشتے بھی رو پڑے ہوں گے۔ میں نے حسینہ اور ثمینہ کو بھی نظر انداز نہیں کیا تھا۔ میرے خالہ زاد بھائی لالا سلطان نے بہت پہلے بے ہوش لڑکی کو تانگے سے اٹھا کر اندر کمرے کے گرم گرم بستر پر ڈال دیا تھا چاروں بہنیں مجھ سے چمٹی ہوئی تھیں۔ ملاپ کے اس رقت آمیز منظر میں پندرہ منٹ صرف ہو گئے۔

اس کے بعد ہم بڑے کمرے میں پہنچ کر چارپائیوں پر بیٹھ گئے۔ کمرے کو گرم رکھنے کے لئے درمیان میں دو انگیٹھیاں اوپلوں سے سلگ رہی تھیں۔

"ماں جی......" سلطان لالا اپنا بازو میرے کندھے میں حائل کرتے ہوئے بولا۔

"بہت رو لئے۔ خبردار جو اب کسی کی آنکھوں میں آنسو آئے۔ اب اٹھو اور میرے وصی کے لئے کھانے کا انتظام کرو......"

"ماں صدقے۔ میں ابھی انتظام کئے دیتی ہوں اپنے پتر کے لئے۔ نی حسینہ چل اٹھ......"

اس تمام کارروائی کے دوران میرے خالو پلکیں جھپکائے بغیر میری طرف ہی تک رہے تھے۔ ان کے چہرے اور آنکھوں سے ایک عجیب سی یاسیت ایک ایسا گہرا غم چھلک رہا تھا جسے میں کوئی معنی نہیں پہنا سکا۔

”وصی الدین......“ سلطان لالا مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”یہ کلپنا کیسے بیہوش ہوئی۔ کہاں ملی تمہیں......“

”کلپنا......“ میں چونکا۔

”کس کلپنا کی بات کر رہے ہیں آپ......“

”ارے بھئی وہی' جسے تم تانگے میں لائے ہو......“

”اوہ۔ تو کیا آپ اسے جانتے ہیں......“

”لو بھئی اور سنو......“ سلطان لالا اپنے بھائیوں کی طرف تکتے ہوئے بولا۔

”ارے بھئی کلپنا رندھیر سنگھ کی بہن اور نمبردار رستم سنگھ کی دھی ہے۔ حسینہ اور ثمینہ کی پکی دوست ہے......“

”اوہ...... مگر لالا' میں نے تو اسے بھیڑیوں کے چنگل سے چھڑایا ہے...“

”بھیڑیوں کے چنگل سے......“ لالا سلطان حیرت سے بولا۔

”ہاں لالا......“ کہتے ہوئے میں نے ساری روداد مفصل سنا دی۔

”او شاوا بھئی۔ غیرت والا کام کیا ہے......“ لالا سلطان میرا شانہ تھپکتے ہوئے بولا۔ جب کہ کمال الدین خالو بڑی بیتابی سے پہلو بدلنے لگے تھے۔

اتفاق سے کلپنا نے ساری باتیں دروازے کی اوٹ سے سن لی تھیں۔ نہ جانے وہ کب ہوش میں آگئی تھی۔ ویرا ویرا کہتی ہوئی دوڑی اور میرے قدموں سے لپٹ گئی۔

میں بوکھلا گیا۔ فوراً ہی اسے بازوؤں سے پکڑ کر کھڑا کر دیا۔ اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”میری بہنا۔ رو ناں۔ میں میں بھائی ہوں ناں تمہارا۔ بہن کی عزت بچانا مجھ پر فرض تھا......“

"مم' مجھے فخر ہے ویرا' مجھے آپ پر فخر ہے......" وہ میرے سینے سے لگ گئی اور روتی رہی۔

'اس کے ساتھ ہی مجھے دکھ بھی ہے۔ پولیس آپ کو نہیں چھوڑے گی ڈاکو' آپ سے انتقام ضرور لیں گے......"

"کلپنا بہن' میرا رب بہت زبردست ہے۔ تم فکر ہی نہ کرو۔ نا' تو پولیس میرا کچھ بگاڑ سکتی ہے اور نا ڈاکو مجھے کوئی گزند پہنچا سکتے ہیں۔ صرف اتنا بتلا دو کہ تمہیں کس نے اور کب اغواء کیا......"

"پپ' پتہ نہیں وہ کون تھا ویرا مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ میں رسوئی میں دودھ پکا رہی تھی کہ اچانک مجھے پیچھے سے کسی نے دبوچ لیا اور میری ناک پر رومال رکھ دیا۔

اب جب میں جاگی تو خود کو چچا کمال کی حویلی میں پایا۔ اگر میں نے آپ کی پوری بات نہ سن لی ہوتی تو میرا کلیجہ پھٹ جاتا۔ یہ سوچ کر کہ چچا کمال کے بیٹوں نے' جنہیں میں اپنے سگے بھائی کی طرح پیار کرتی ہوں مجھے اغواء......" آخری الفاظ کلپنا کے حلق ہی میں اٹک کر رہ گئے۔

"سلطان پترا۔ دیکھنا باہر کون ہے۔ آواز تو رندھیر ہی کی ہے......" میری خالہ نے کمرے میں آتے ہی کہا۔ "ہاں خالہ ماں رندھیر سنگھ ہی ہوگا۔ یقیناً اسے رمبھیر سنگھ نے ہی کچھ بتلایا ہوگا......" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

صبح نو بجے مجھے جگا دیا گیا۔ جگانے والی میری دونوں بہنیں فوزیہ اور فرحین تھیں۔

"اٹھیں نا لالا۔ ہم رات بھر سے آپ کے سرہانے بیٹھی ہیں......" فوزیہ نے کچھ ایسی معصومیت سے کہا کہ فرط محبت سے میرا دل اچھل کر میرے حلق میں آ اٹکا۔ بے ساختہ میں نے دونوں بہنوں کو لپٹا لیا اور بے تحاشہ ان کی پیشانی چومنے لگا۔

"کیوں میری بہنوں' تم کیوں نہیں سوئیں......" میں بدقت تمام اپنے آنسو روکتے ہوئے بولا۔

"کیسے نیند آتی ہمیں لالا۔ ذرا سوچئے تو کتنے برسوں بعد آپ کو دیکھا ہے۔"

"میں...... میں تو آپ کے سینے پر ہی سر رکھے بیٹھی رہی......" فرحین مجھ سے لپٹتے ہوئے بولی۔

"میں، میں آگیا ہوں میری چیو۔ اللہ نے مجھے تم دونوں کے لئے زندہ رکھا ہے......" میری آواز بھرا گئی تھی۔

حقیقت بھی یہ تھی کہ جب اپنی بہنوں سے رخصت ہوا تھا تو...... یہ دونوں نابالغ اور معصوم تھیں۔ معصوم تو اب بھی تھیں مگر نابالغ نہ تھیں۔ ان کا قد بھی ساڑھے پانچ فٹ سے نکل گیا تھا۔

"وصی الدین پترا......" معاً میرے خالو کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولے۔

"ناشتہ واشتہ تو کرلو......" انہوں نے جملہ مکمل کر دیا۔

"السلام علیکم خالو ابا......" میں فوراً ہی کھڑا ہو گیا۔

گو کہ میرے خالو پچاس برس کی عمر پا چکے تھے تاہم تیس پینتیس برس سے زائد کے نہ لگتے تھے...... سر' داڑھی اور مونچھ کے بالوں میں کچھ کچھ سفیدی نہ ہوتی تو بالکل ہی ہماری طرح ہوتے۔

دراز قد و قوی ہیکل بھی تھے۔ دراز قد و قوی ہیکل میرے تینوں خالہ زاد بھائی بھی تھے' مگر میرے خالو کے سرخ و سفید چہرے پر ایک خاص جلال اور ٹھیراؤ تھا۔ بارعب مونچھ و داڑھی نے انہیں نمایاں کر رکھا تھا۔ ان کی بڑی بڑی آنکھوں میں کچھ ایسی کشش' جیداری اور چمک تھی کہ میں بھی ان سے نظریں ملانے سے کتراتا تھا۔

گزشتہ شب وہ جس قدر پریشان محسوس ہوئے تھے' کلپنا اس کے بھائی رندھیر سنگھ اور نمبردار رستم سنگھ سے جو اور جس قسم کی باتیں میں نے کی تھیں' اس کے بعد ہی وہ مطمئن ہو گئے تھے۔

"چل پترا۔ دسترخان پر سب ہی تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ غسل خانے میں گرم پانی کا ٹب رکھا ہے۔ فارغ ہو کر آجاؤ......" انتہائی شفقت سے کہتے ہوئے خالو ابا کمرے سے

چلے گئے۔

''چلو بہوں' مجھے غسل خانہ دکھلادو......''

پندرہ منٹ بعد میں غسل وغیرہ سے فارغ ہو گیا۔ مجھے گاؤں والا ہی لباس پہننا پڑا' یعنی یہ کہ زیر جامہ کے طور ریشمی اور موٹے کپڑے کی تہمد' اس پر ریشمی ہی کپڑے کا کڑہائی دار کرتہ اور سردی سے محفوظ رہنے کے لئے موٹا سا اونی کمبل لپیٹ لیا تھا' صرف سر پر شملہ دار پگڑی کی جگہ اونی ٹوپی ڈال رکھی تھی اور یہ لباس میرے خالہ زاد بھائی ہی کا تھا۔ میرا اپنا سوٹ وغیرہ صحن میں دھوپ دکھانے کے لئے رکھ دیا گیا تھا۔ دستر خوان پر سب لوگ موجود تھے' صرف سلطان بھائی نہ تھے۔ گرما گرم پراٹھے' مکھن اور انڈا آملیٹ سے میں نے جی بھر کر ناشتہ کیا۔

''خالو ابا......'' ناشتے سے فارغ ہو کر میں نے مقصد کی بات شروع کر دی۔

''ہاں پترا۔ کیا کہنا چاہتے ہو......''

''رات جب میں گاؤں پہنچا تو پورے گاؤں پر ایک جمود سا طاری تھا۔ میرا اندازہ ہے ہر شخص لحاف میں دبکا سو رہا تھا۔ ٹھنڈک بھی بڑے غضب کی تھی اس پر کہر نے تسلط جمایا ہوا تھا۔

مگر' تعجب ہے ایسی برفانی شب میں سلطان بھائی درخت پر کیوں بیٹھے ہوئے تھے......''

''محض حفاظت کی خاطر پترا......'' خالو تولیے سے اپنے ہاتھ صاف کرتے ہوئے بولے۔

''میں سمجھا نہیں خالو ابا......''

''او پترا' جس علاقے میں چوری' ڈاکہ اور اغواء کی وارداتیں ہوتی ہوں' وہاں غیرت مند جوان سکھ کی نیند نہیں سوتے۔ انہیں اپنے مال و اسباب سے بڑھ کر جوان بہوں کی حفاظت کے لئے جاگنا ہی پڑتا ہے......''

''لیکن خالو ابا۔ گاؤں کے سرے پر پولیس چوکی جو ہے......''

''مت نام لو ان کتوں کا۔ وہ تب پہنچتے ہیں جب ڈاکو واردات کر کے' اور کسی نہ کسی

جوان لڑکی کو اغواء کر کے جا چکے ہوتے ہیں۔ تین مرتبہ تو تمہارے بھائیوں نے ڈاکوؤں کو ذلیل کر کے بھاگنے پر مجبور کر دیا......"

"اوہ۔ سلطان بھائی ہیں کہاں......" میں نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

"سویرے سویرے دو پولیس والے آئے تھے۔ انہی کے ساتھ رمھیر کے تانگے میں بیٹھ کر گیا ہے۔ رندھیر سنگھ اور نمبردار سلطان بھی ساتھ گئے ہیں......"

"اوہ......" میرا ماتھا ٹھنکا۔ میں فوراً ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ "فرحین' میرا لباس صحن سے لے آؤ......" میں نے اپنی بہن سے کہا۔ وہ فوراً ہی اٹھ کر کمرے سے نکل گئی۔

"کیا ہوا بیٹے' کہاں جا رہے ہو......" خالہ ماں نے فکرمندی سے پوچھا۔

"کچھ نہیں خالہ ماں' میرا تھانے پہنچنا ضروری ہے......"



میں جب چیک پوسٹ پہنچا تو بڑے پھاٹک پر متعین چند نیکر اور پگڑی والے کانسٹیبل بندوقیں کندھے سے ٹکائے اٹینشن ہو گئے۔ وہ یقیناً مجھ سے متاثر ہو چکے تھے یا پھر ہو سکتا ہے مجھے کوئی بڑا آفیسر سمجھ رہے ہوں۔

جو کچھ بھی تھا' میں فورڈ ویگن سے ہٹ کر پھاٹک کی طرف بڑھ گیا۔ یہ واکس ویگن میرے خالو ہی کی تھی۔ عموماً اس پر دودھ کے بڑے بڑے ٹب رکھ کر چکوال لے جائے جاتے تھے۔

جیسے ہی میں پھاٹک سے اندر داخل ہوا' مجھے چھ چارپائیوں پر چھ لاشیں نظر آئیں۔ ہر لاش پر سفید چادر ڈالی گئی تھی لاشوں کے قریب ہی چند کرسیوں پر پولیس افسران' سلطان بھائی' رندھیر سنگھ اور نمبردار بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک طرف وہی گزشتہ شب نظر آنے والا ٹرک اور قریب میں تین جیپیں پارک کی ہوئی تھیں۔ کچھ کانسٹیبل اٹینشن کھڑے ہوئے تھے۔ حالانکہ پورے صحن پر دھوپ مسلط تھی' اس کے باوجود لوگ اوور کوٹوں اور کمبلوں میں لپٹے ہوئے تھے۔ اب بھی اس قدر ٹھنڈ تھی کہ باوجود گرم لباس کے جسم ٹھٹھر رہے تھے۔

میرے قدموں کی دھمک پر سب ہی لوگ میری طرف متوجہ ہو گئے اور غیر ارادی طور پر اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کے اس طرح کھڑے ہو جانے پر سلطان لالا کا سینہ فخر سے اکڑ چکا تھا۔

"السلام علیکم ایوری باڈی......" میں نے قریب پہنچ کر باوقار لہجے میں سلام کیا۔

یوں تو سب ہی نے بیک زبان سلام کا جواب دیا' مگر ایک شخص واع کہنے کے بعد ہی سناٹے میں آگیا۔ وہ پلکیں جھپکائے بغیر میری طرف تکنے لگا۔ اس کے چہرے پر ایک سے ایک رنگ آآکر گزر تا رہا۔

میں اسے پہچان چکا تھا۔ یہ چوہدری نظام کا بیٹا عبدالسلام تھا جو ایس پی کی وردی میں ملبوس تھا۔

"ارے۔ سلاماتم......"

گو کہ اس پہ نظریں پڑتے ہی میرے رگ و پے میں بدلے کی آگ بھڑک اٹھی تھی' مگر میں نے اپنے اعصاب پر قابو پایا ہوا تھا اور پوری اپنائیت سے عبدالسلام کو مخاطب کیا۔

"اوئے وصی الدین۔ تم...... تم کب آئے۔" عبدالسلام بھی حیرت انگیز طور پر خود پر قابو پا گیا اور بڑی گرم جوشی سے مجھ سے بغلگیر ہو گیا۔

چار پانچ منٹ اسی طرح رسمی علیک سلیک میں گزر گئے وہ اے ایس آئی' جس نے گزشتہ شب تانگہ رکوا کر میرے سامان کی تلاشی لینی چاہی تھی؟ بغلیں جھانکنے لگا تھا۔

"سناؤ بھئی۔ تم کب آئے ......" رسمی تعارف ہوتے ہی عبدالسلام نے مجھ سے پوچھا۔

"یہ رات ہی میں آگیا تھا۔ رمھیر سنگھ تانگے والا جس پسنجر کی بات کر رہا تھا وہ یہی میرا بھائی وصی الدین تھا......"

میرے جواب دینے سے پہلے ہی سلطان بھائی نے جواب دیا۔ "واہ بھئی سلطان۔ تم نے پہلے کیوں نہیں بتلایا......" عبدالسلام شکایتی لہجے میں بولا۔

"آپ نے مجھے بولنے کا موقع ہی کب دیا۔ آپ تو نمبردار اور اس کے بیٹے ہی سے

مخاطب رہے......"

"بات کیا ہے سلام۔ باہر چارپائیوں پر غالباً لاشیں پڑی ہیں اور صبح ہی صبح سلطان لالا کو آپ لوگوں نے بلوالیا ہے......" میں قطعی انجان بن گیا۔ ویسے میں نے صاف محسوس کر لیا تھا کہ عبدالسلام چبھتی نظروں سے میرا جائزہ لے رہا ہے۔

"ہاں وصی الدین۔ سب انسپکٹر ڈیوڈ اور میں صبح ساڑھے سات بجے چکوال سے یہاں پہنچے ہیں تو گارڈ کیبن میں مردہ پڑا تھا۔ ہم بوکھلا کر اندر آئے تو دیوار کے سائے میں تین لاشیں پڑی تھیں مزید اندر گئے تو دو لاشیں اور ملیں۔

پورے تھانے میں صرف ایک ہی کانسٹیبل زندہ ملا ہے۔ شاید وہ اس لئے زندہ بچ گیا ہے کہ بالائی منزل پر تھا۔"

"اوہ۔ کچھ پتہ چلا کہ مرنے والے طبعی موت مرے ہیں یا انہیں قتل کیا گیا ہے......"

"اندازہ ہے کہ انہیں قتل کیا گیا ہے......"

"ہوں۔ ہو سکتا ہے انہیں ڈاکوؤں نے قتل کیا ہو......"

"نہیں' ایسا ہو ہی نہیں سکتا......" عبدالسلام نے پورے وثوق سے کہا' اور پھر خود ہی بوکھلا بھی گیا۔

"تو پھر میرے بھائی کو کیوں بلوایا گیا ہے۔ میرے بھائی سلطان کا اس واردات سے کیا تعلق ہے......" میں عبدالسلام کی بوکھلاہٹ کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔

"آں......" وہ چونکا۔

"نہیں وصی الدین۔ سلطان کو تو ہم نے اس لئے بلوایا ہے کہ نمبردار کے بعد سلطان خان ہی بھلا کریالہ کی مقبول شخصیت ہے۔ شاید ان سے ہی کچھ معلوم ہو جائے۔

خیر جی ہٹاؤ اس فضول بحث کو۔ اپنی سناؤ کہاں رہے اتنے برسوں......"

"جنگ عظیم کی ہولناکیوں میں امریکہ اور برٹش فوج کے شانہ بشانہ جرمنوں سے لڑتا رہا۔ نہ صرف امریکی حکومت نے بلکہ برٹش گورنمنٹ نے بھی مجھے اس قدر اہم اختیار نامے دیئے ہیں کہ اگر پنجاب کے وائسراء کو بھی پتہ چل جائے تو سر کے بل دوڑا آئے

گا......"

"ویری گڈ...... کیا میں دیکھ سکتا ہوں......"

"نہیں۔ آپ صرف میرا ایک کارڈ دیکھ سکتے ہیں......" کہتے ہوئے میں نے کوٹ کی جیب سے جنرل ہیڈل اسمتھ کے دستخط والا فوجی کارڈ نکال کر عبدالسلام کو تھما دیا۔

"میں آگیا ہوں سلاما......"

عبدالسلام کے چہرے کی اڑتی ہوئی رنگت کو نظر انداز کرتے ہوئے میں نے مزید کہا۔

"میرے دادا' میرے ابا اور میری دو بہنوں کے قتل کی تحقیقات کرونگا۔ اپنی جائیداد کی چھان بین کرونگا اور ظلم کرنے والوں کا صفحہ ہستی سے نام و نشان مٹا دونگا......"

میرا لہجہ اس قدر بھیانک ہو گیا کہ ہر شخص پر سکتہ سا طاری ہو گیا۔

"تم...... تم ایک پولیس آفیسر کے سامنے......"

وہ یہیں تک کہنے پایا تھا کہ میں بھوکے شیر کی طرح دھاڑ اٹھا۔

"اپنی پولیس افسری کا رعب ان شریف دیہاتیوں پر جمانا سلامے' میں وسیع اختیارات رکھنے والا میجر ہوں۔ میجر وصی الدین چغتائی' تمہاری حیثیت میری نظروں میں ایک اردلی سے زیادہ نہیں ہے۔ چلو لالا......" کہنے کے ساتھ ہی میں اپنا کارڈ جھپٹ کر اٹھ کھڑا ہوا......

☆☆☆

میں ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا اور سلطان لالا میرے ساتھ والی سیٹ پر اور نمبردار رستم سنگھ اپنے بیٹے رندھیر سنگھ سمیت ہماری پشتی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ "نمبردار جی' آپ کو پولیس نے روکنے کی کوشش تو نہیں کی......"

میں واکس ویگن اسٹارٹ کرتے ہوئے بولا۔

"نہیں پترا۔ وہ ہمارا منہ تکتے رہ گئے تھے......"

چونکہ ہنوز زمین پوری طرح خشک نہیں ہوئی تھی اس لئے مٹی معمولی سی اڑنے لگی

تھی۔ دائیں بائیں ہرے بھرے کھیت تھے عورتیں مرد اور بچے اپنے اپنے کام میں مگن تھے۔ فضاؤں میں مختلف پرندوں کی اڑان جاری تھی اور پورا علاقہ دھوپ میں نہایا ہوا تھا۔

"انہوں نے رمبیر سنگھ کو چوان کو تو تنگ نہیں کیا......"

"نہیں۔ اس سے صرف اتنا پوچھا کہ سواری کہاں سے اٹھائی اور کہاں اتاری۔ دوم یہ کہ چیک پوسٹ تانگہ روکا گیا تھا کہ نہیں۔

رمبیر سنگھ نے پورے اعتماد سے وہی جواب دیئے جو گزشتہ شب آپ نے سمجھائے تھے......"

"ہوں۔ آپ لوگوں سے کیا پوچھا۔" میں ونڈ شیلڈ پر نظریں جمائے ہوئے بولا۔

"بہت سے سوال کئے ہم سے مگر مقصد ایک ہی تھا کہ ہماری کوئی چیز گم تو نہیں ہوئی۔ جب ہم ان کے سوالیہ چکروں میں نہ آئے تو عبدالسلام اور ڈیوڈ نے ہماری گھریلو خیریت پوچھنی شروع کر دی تھی۔ میں نے مسکراتے ہوئے حتمی جواب دیا کہ ایک بیوی اور دو جوان بچوں کے علاوہ ہمارے گھر میں ہے ہی کون۔

ویسے وصی پترا' میرے اس جواب پر کم از کم چوکی انچارج ڈیوڈ مطمئن نظر نہیں آرہا تھا......"

"وہ مطمئن ہو ہی نہیں سکتا چاچا۔ اس لئے کہ کلپنا کو اغواء کرنے والے اسی کے ماتحت تھے' جن میں سے ایک زندہ بچ بھی گیا ہے۔"

اسی طرح گفتگو کرتے ہوئے ہم گھر پہنچ گئے۔

نمبردار اور اس کے بیٹے کے جانے کے بعد ہم گھریلو خوش گپیوں میں کھو گئے نہ تو خالو اور خالہ نے میرے پیاروں کی موت کا ذکر چھیڑا اور نہ ہی میں نے ان سے کچھ دریافت کرنے کی کوشش کی۔

اس کی سب سے اہم وجہ میری چھوٹی بہنیں تھیں جن کے چہرے گلاب کی طرح کھل اٹھے تھے۔ وہ ایک لمحہ کے لئے بھی مجھ سے الگ نہیں ہو رہی تھیں۔ میں نے اپنے سوٹ کیس سے قیمتی جواہرات کے سیٹ نکال لئے تھے۔

جو چیزیں میں نے اپنی دونوں بڑی بہنوں کے لئے خریدی تھیں وہ میں نے حسینہ اور ثمینہ کو دے دیں۔ اس طرح میرے خالو کے گھر میں میری موجودگی سے گویا عید کا سماں بندھ گیا تھا۔

دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد میں سلطان بھائی کے ہمراہ گاؤں کی سیر کو نکل گیا۔ میں گاؤں کے تمام نشیب و فراز سے واقف ہونا چاہتا تھا۔ میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ آج رات کچھ نہ کچھ ضرور ہوگا۔ نمبردار کی بیٹی کلپنا کو اغواء کرنے کی اور مجھے قتل کرنے کی کوشش ضرور کی جائے گی۔

دوران گشت میں نے تین راستے ایسے جان لئے جہاں سے بیرونی لوگ یا حملہ آور بآسانی داخل ہو سکتے تھے۔

چار بجے تک ہم گھر لوٹ آئے۔ چونکہ مجھے رات میں بہت کچھ کرنا تھا اس لئے میں نے نیند لینی ضروری سمجھی اور بدقت تمام فوزیہ اور فرحین کو سمجھا کر اپنے کمرے میں داخل ہو گیا۔

داخل ہوا ہی تھا کہ میری چارپائی پر کمبل اوڑھے کوئی سویا ہوا نظر آیا۔

''کون ہو بھئی......'' میں ذرا سا آگے بڑھ کر بولا۔ حالانکہ میں بخوبی جانتا تھا کہ سبھی افراد بڑے کمرے میں موجود ہیں۔

کوئی جواب نہ پا کر میں نے کمبل کھینچنے کے لئے ہاتھ بڑھایا تھا کہ اچانک میرا جسم ایک جھٹکے سے اکڑ گیا۔ میرے پورے وجود میں آگ سی سلگ اٹھی۔ میرا اندازہ تھا کہ میرا چہرہ بھی تپے ہوئے تانبے کی طرح سلگ اٹھا ہے۔

معاً میں نے ہاتھ بڑھا کر ایک جھٹکے سے کمبل کھینچ لیا۔



بے ساختہ میرے حلق سے کراہ نکل گئی' آنکھوں کے گرد اندھیرا سا چھا گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے پورا کمرہ گھومنے لگا ہے۔ لیکن' میری یہ کیفیت ایک لمحہ کے نصف حصے میں سنبھل گئی۔

چونکہ دونوں کھڑکیاں بند تھیں' ان پر پردے چڑھے ہوئے تھے اور دروازہ بھی بند تھا اس لئے کمرے میں اندھیرا تھا اور اس اندھیرے میں میری چارپائی پر کسی عورت کا مادر زاد برہنہ اور آگ کی طرح دہکتا ہوا وجود پڑا تھا۔

وہ عورت نہیں بلکہ نوجوان لڑکی تھی۔ بہت ہی پرکشش نقوش رکھنے والی۔ اس کے سر کے گھنے اور سنہرے بال اس قدر لمبے تھے کہ سرہانے کی جانب سنہرے ناگوں کی طرح زمین کو چھو رہے تھے۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ اور انار کی پھانکوں کی طرح تراشے ہوئے ہونٹوں پر بے پناہ اپیل چھائی ہوئی تھی۔

اس کا سینہ آہستگی سے پھول پھول کر پچک رہا تھا۔ ایک نظر ڈالتے ہی میرے جسم میں چیونٹیاں سی رینگ گئیں۔ جوان تھا میں برہنہ جسم دیکھتے ہی میرے لہو میں انگارے سے دوڑ گئے۔ میں نے بے ساختہ بڑھنے کی کوشش کی' مگر میرا جسم منوں وزنی ہو گیا۔ پوری قوت صرف کرنے کے باوجود قدم نہ اٹھا سکا یوں لگا جیسے میرے پیر زمین نے جکڑ دیئے ہوں۔

بے ساختہ میرے لبوں سے لاحول نکل گئی۔ لاحول پڑھنا ہی تھا کہ مادر زاد برہنہ سوئی ہوئی لڑکی کے حلق سے ایک کریہہ اور زمین و زمان کو لرزا دینے والی چیخ نکلی۔ اسکے ساتھ ہی وہ ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھی۔ آن واحد میں اس کی آنکھیں انگارہ بن گئیں اس کا جبڑا دائیں بائیں کھنچ گیا اس کے دانت آہنی میخوں کی طرح کررٹ کررٹ کرنے لگے اور اس کے چہرے پر سینکڑوں بھیانک جھریاں پڑ گئیں۔

وہ کوئلے پر چلنے والے انجن کی طرح اس قدر خوفناک سانسیں لینے لگی کہ پورا کمرہ لرز کر رہ گیا۔ وہ اب بھی مادر زاد برہنہ تھی اور اس کا سینہ لوہار کی دھونکنی کی طرح پھول پھول کر پچکنے لگا تھا۔ ٹھیک اسی لمحے میری زبان سے غیر ارادی طور پر نظر نہ آنے والی ہستی کا نام نکل گیا ویسے میں حیرت انگیز طور پر پلکیں جھپکائے بغیر بد روح نما عورت کی آنکھوں میں تکنے لگا۔ میرے دل و دماغ سے شہوانی شدت حرف غلط کی طرح مٹ گئی تھی۔

اسی بے ساختگی میں اچانک ہی میری نظریں اس کے پیروں کی طرف گھوم گئیں۔

وہ.......وہ پچھل پیری تھی۔ اس کی ایڑیاں سامنے کی جانب اور پنجہ پشتی جانب تھا۔

ا ۔ وہ گیس بھرے غبارے کی طرح اڑتی ہوئی مجھ پر جھپٹی وہ کسی جونک کی طرح میرے وجود سے چمٹ جانا چاہتی تھی کہ میں نے جھپٹا مار کر اس کے دونوں پیر اپنے پنجوں میں جکڑ لئے۔

جیسے ہی میں نے پچھل پیری کو پیروں سے دبوچا' اس کے حلق سے طویل اور لرزہ خیز چیخ خارج ہو گئی وہ انتہائی بھیانک انداز میں میرے نرخرے پر اپنے بھیانک ترین دانت گاڑنا چاہتی تھی کہ میں نے اس کے چہرے پر سر کی بھرپور ٹکر رسید کر دی۔ اف' وہ اس شدت سے چلائی کہ کمرے کے درو دیوار لرز اٹھے۔ ساتھ ہی اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا۔ میں نے اس کے پیر چھوڑ دیئے اور وہ دھب سے فرش پر گر گئی۔ گرنے سے اس کے دونوں ہاتھ اس کے چہرے سے ہٹ چکے تھے۔

اف خدایا۔ اس کا چہرہ بری طرح بگڑ چکا تھا اور اس کے بگڑے ہوئے چہرے سے اس قدر کریہہ بو اٹھنے لگی تھی کہ مجھے سانس لینا دوبھر محسوس ہوا۔ معاً میرے پورے وجود سے قوس و قزح کی طرح رنگ بکھیرتی ہوئی باریک باریک لہریں سی نکلیں اور پچھل پیری کے وجود سے لپٹ گئیں۔ اس کی چیخیں میرے کانوں اور دماغ پر کچوکے سے لگاتی رہیں۔ وہ ذبح کئے ہوئے مرغ کی طرح تڑپتی پھڑکتی رہی۔ اس کے جسم کا گوشت از خود ادھڑتا گرتا اور غائب ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ ایک روشن جھماکے سے اس کا ڈھانچہ بھی غائب ہو گیا۔

میں بے حس و حرکت کھڑا ہوا پتھرائی ہوئی نظروں سے سب کچھ تکتا رہا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے میں ایک بے جان مجسمہ ہوں۔

قوس و قزح کی طرح رنگ بکھیرتی لہریں بڑی تیزی سے باہم گڈمڈ ہونے لگیں اور میرے دیکھتے ہی دیکھتے روشن لہریں انسانی جسامت پانے لگیں۔ صرف چند لمحوں میں میرے سامنے ایک ایسا روشن مجسمہ کھڑا تھا جو ہفت رنگی شعائیں بکھیر رہا تھا۔

پھر' اچانک ہی اندھیرا چھا گیا۔ پورے کمرے کے ماحول پر ابدی سکوت طاری ہو گیا اور میرے سامنے مسکراتی ہوئی گنز اکھڑی نظر آئی۔

"ہوش میں تو ہیں چغتائی صاحب......"

گنزا کی رس گھولتی ہوئی آواز نے آن واحد میں مجھے مدہوشی سے کھینچ لیا' میں اس طرح چونکا جیسے بھیانک خواب دیکھ کر بیدار ہوا ہوں۔ بے ساختہ میری نظریں دروازے کی طرف گھوم گئیں۔

"اس کمرے میں جو کچھ بھی ہوا ہے وصی صاحب' اس کی باہر والوں کو بھنک بھی نہیں لگی ہے......"

گنزا یقیناً میری نظروں کا مقصد سمجھتے ہوئے بول اٹھی۔

بے ساختہ میرے لبوں سے آسودہ سی سانس نکلی اور اسی بے ساختگی میں' میں گنزا کو بازو سے پکڑنے کے لئے بڑھا ہی تھا کہ......

"نہیں وصی الدین صاحب مجھے مت چھونا میں آتشی ہوں' آپ کا ہاتھ جل جائے گا......"

"ب' بیٹھو گنزا اور' مجھے بتاؤ کہ تم کہاں تھیں......" میں ٹھٹک کر رکتے ہوئے بولا۔

"آپ کے وجود میں تھی' آپ میں سمائی ہوئی تھی۔ اگر' ایک لمحہ کو بھی آپ سے الگ ہوئی ہوتی تو مجھل پیری بڑے مزے لے لے کر اس وقت آپ کے جسم سے گوشت نوچ رہی ہوتی اور آپ کے خون سے اپنی پیاس بجھا رہی ہوتی......"

الفاظ ہی ایسے تھے کہ میں جھرجھرا کر رہ گیا۔ شدت ٹھنڈک سے نہیں بلکہ فرط خوف سے......

☆☆☆

آٹھ بجے تک ہم سب کھانے سے فارغ ہو کر بڑے کمرے میں پہنچ گئے میرے ساتھ میری دونوں بہنیں چپکی بیٹھی تھیں۔ خالو اور خالہ الگ الگ چارپائیوں پر بیٹھے تھے۔ خالو حقہ پھونکنے میں مصروف تھے۔ سلطان بھائی زمان اور فرحان ایک ہی چارپائی پر بیٹھے تھے۔ اور میری دونوں خالہ زاد بہنیں حسینہ اور ثمینہ انگیٹھی کے قریب بیٹھی ہوئی ہاتھ سینک رہی تھی۔

چونکہ سردی پورے عروج پر تھی اس لئے کمرے میں دو انگیٹھیاں سلگ رہی تھیں۔ روشندان چاروں ہی کھلے ہوئے تھے۔ ہر چہرے پر مسرتیں ٹھاٹھیں مار رہی تھی۔

"وصی الدین پترا......" میرے خالو نے مجھے متوجہ کیا۔

"تیری پھوپھی سائرہ اور پھوپھا ریشم خان اپنے دونوں بیٹوں علاؤالدین اور امیر جان کے لئے حسینہ اور ثمینہ کا رشتہ لے چکے ہیں۔ ایک برس سے زیادہ عرصہ ہو گیا منگنی کو۔ تو آگیا ہے ناں' کیوں نہ شادی کی تاریخ مقرر کر دی جائے......"

"یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے خالو ابا۔ ویسے پھوپھا کے دونوں بیٹے آج کل کیا کر رہے ہیں......"

"ٹھیکیداری کرتے ہیں پترا۔ ڈھوک نالیاں کے جنگل کا بہت بڑا علاقہ ان کی ملکیت ہے۔ ان کا مال پورے ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں تک جاتا تھا......"

"تھا۔ کیا اب نہیں جاتا......" میں چونک پڑا۔

"جاتا ہے۔ اب بھی جاتا ہے مگر' آٹے میں نمک کے برابر......"

"وہ کیوں خالو ابا......"

"او پترا مزدور جنگل میں کام کرنے سے کترانے لگے ہیں......"

"اس کی کوئی وجہ تو ہو گی......" میں اپنے خدشات کو دباتے ہوئے بولا۔ ریشم خان ہی نے بتلایا کہ تقریباً آٹھ مزدور لاپتا ہو چکے ہیں۔ پتہ نہیں انہیں آسمان کھا گیا یا زمین نے نگل لیا۔ اکثر مزدوروں کو سانپ ڈس لیتے ہیں۔ چند ایک مزدور کسی کھوہ یا کھڈ میں پائے گئے تھے ان کی لاشیں اس قدر ادھڑی ہوئی تھیں کہ ہڈیاں نظر آتی تھی۔ ریشم خان ہی نے بتلایا کہ جب سے پنڈت دھیراج اگھوری نامی کسی راکھشش نے جنگل میں ڈیرہ جمایا ہے' ہر ہفتے دو تین المناک واقعات ہو جاتے ہیں۔ پولیس نے بھی بہت چھان بین کی مگر کسی قسم کا کوئی سراغ نہیں مل سکا......"

"تو پھر پھوپھا آج کل کیا کر رہے ہیں......" میں خود کو نارمل رکھتے ہوئے بولا۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ میرے رگ و پے میں سنسناہٹ سی دوڑنے لگی تھی۔ "اچھی خاصی زمین

ہے ان کی۔ زمینداری بھی کر رہے ہیں اور کوئلے کا کاروبار بھی شروع کر رکھا ہے......"

"میں جاؤنگا ان سے ملنے۔ شاید دو چار روز ہی میں فوزیہ اور فرحین کو ساتھ لے کر اپنے گاؤں جاؤنگا بشرطیکہ آپ لوگوں کو اعتراض نہ ہو......"

"اعتراض کی کیا بات ہے' مگر تم وہاں جا کر کرو گے کیا۔ ایک حویلی ہی تو باقی رہ گئی ہے وہاں۔ وہ بھی دو ڈھائی برسوں سے بند پڑی ہے......"

"اسی کو تو آباد کرنا ہے خالو ابا اور چوہدری نظام سے اپنا تمام حساب بھی تو بے باک کرنا ہے......"

"اوہ۔ اگر یہ بات ہے تو پھر سلطان کو بھی اپنے ساتھ لے جانا ویسے بھی اس جھلے کا جسم تو یہاں ہے' روح تمہارے گاؤں میں ہے۔ یہ جھلیا نظام کی بڑی بیٹی شازیہ سے شادی رچانے کے خواب دیکھ رہا ہے......"

"اللہ نے چاہا تو ایسا ہی ہوگا خالو ابا......"

باتیں ہوتی رہیں اور رات گہری ہوتی گئی۔ تقریباً سبھی کو اونگھ آنے لگی۔ آہستہ آہستہ ایک ایک کر کے سبھی اجازت لے کر سونے چلے گئے۔ صرف میں اور میرے تینوں خالہ زاد بھائی بیٹھے رہے۔

"کیا پروگرام ہے وصی الدین سوؤ گے نہیں......"

سلطان بھائی ایک طویل جماہی لیتے ہوئے بولے۔

"نہیں لالا' تساں تنوں بے فکر ہو کر سو جاؤ۔ آج کی رات پہرہ میں دونگا......" میں فیصلہ کن لہجے میں بولا۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ گنزا نے بھل پیری کو مٹانے کے بعد مجھے ایک طویل ڈکٹیشن دی تھی۔ اس نے بتایا تھا کہ بھل پیری کو بھی پنڈت دھیراج اگھوری ہی نے بھیجا تھا۔ اسے اس کے شیطانی علم سے پتہ چل گیا ہے کہ اگر میں زندہ رہا تو وہ زندہ نہیں رہے گا۔ اس کا پاتال اور پاتال میں بسنے والی تمام دیو مالائی قوتیں میرے ہی ہاتھوں دار فنا پدھار ینگی اس لئے اس نے بہت سی شیطانی قوتوں کو میری موت کا حکم دے دیا ہے۔

گنزا ہی نے کہا تھا مجھے جو کچھ بھی کرنا ہے' اکیلے سر کرنا ہے۔ اگر میں نے کسی اور انسان کو ساتھ رکھا تو اس کی زندگی کی ضمانت نہیں ہو گی اور مجھے بھی ناقابل تلافی نقصان پہنچ سکتا ہے۔

میں نے جب گنزا سے جرح کی کہ آخر وہ کیا کر سکتی ہے تو اس نے یہ جواب دے کر مجھے خاموش کر دیا کہ وہ میرے وجود میں سمائی رہے گی اس لئے کہ پنڈت دھیراج کو علم ہو چکا ہے کہ میں کچھ بھی نہیں ہوں۔ میں گوشت پوست رکھنے والے انسانوں اور حیوانوں کا مقابلہ تو کر سکتا ہوں مگر شیطانی قوتیں رکھنے والی بدروحوں کا مقابلہ یقیناً کوئی مافوق الفطرت ہستی ہی کر سکتی ہے۔

اس لئے گنزا اب عالم وجود میں میرے سامنے نہیں آئے گی ورنہ ناممکن نہیں کہ پنڈت دھیراج گنزا کو بھی اپنا غلام بنا لے۔ اس کے علاوہ بھی گنزا نے مجھے بہت کچھ سمجھایا اور بتلایا تھا۔

"او نہیں او جھلیا۔ تو آرام کر' پہرہ میں ہی دوں گا......"

سلطان لالا سرزنش کرتے انداز میں مجھ سے بولا۔

"نہیں لالا۔ میں جنگ عظیم کا سپاہی ہوں' شاطر ترین فوجیوں کے ساتھ شب و روز گزارے ہیں میں نے' لہٰذا میں ہر قسم کے حالات سے نمٹنے کا فن جانتا ہوں......"

میں نے کچھ ایسے پیرائے میں تفصیل بیان کی کہ میرے تینوں خالہ زاد بھائی قائل ہو گئے۔



ہر طرح سے تیاری کے بعد جب میں حویلی کے گیٹ سے نکلا تو باوجود اس کے کہ میں سر سے پیروں تک ڈھکا ہوا تھا' سردی کے ایک تھپیڑے نے مجھے ملیریا کے طرح کپکپا کر رکھ دیا۔

میرا صرف چہرہ ہی کھلا تھا جو شدت ٹھنڈ سے بے جان سا ہو گیا تھا۔

حد نگاہ تک چاروں طرف اندھیرے اور سناٹے کی حکمرانی تھی۔ اگر سر پر ستاروں

پھر آسمان نہ نظر آتا تو قطعی یقین نہ ہوتا کہ میں زندہ انسانوں کی بستی میں ہوں۔

پرندوں کی خوابناک آوازیں' حشرات الارض کی سیٹیاں اور گاہے گاہے قرب وجوار سے ابھرنے والی کتوں کی بھونک' انسانی حواس کو خبط کرنے کے لئے کافی تھیں لیکن میں نہ تو ہراساں ہوا اور نہ ہی میرے ذہن نے اس بھیانک پن کو قبول کیا۔

ابتدائی کپکپاہٹ کے بعد آن واحد میں سردی کا احساس میرے تصور سے نکل گیا۔ میں نے ماحول پر ایک طائرانہ نظر ڈالی اور بے آواز مگر تیز تیز قدموں سے رستم سنگھ کے نیم پختہ وسیع وعریض مکان کی طرف بڑھ گیا۔

رستم سنگھ کے مکان کا رہائشی حصہ اندازاً پانچ مرلے سے کچھ زائد زمین پر مشتمل تھا اور باقی حصہ اوپن ایئر صحن پر مشتمل تھا۔ اسی اوپن ایئر حصے کی حد بندی دیوار کے ساتھ ساتھ طویل وگنجان درخت بھی تھے' خودرو بیلیں تھیں جن سے اٹھنے والی بھینی بھینی خوشبو دل ودماغ کو تقویت دے رہی تھی۔ درمیانی فاصلہ عبور کرکے میں حد بندی دیوار سے کوئی دو فرلانگ کے فاصلے پر ایک کھڈ میں دبک کر بیٹھ گیا۔

بیٹھنے سے پہلے میں نے ٹارچ کی روشنی میں کھڈ کا جائزہ پہلے ہی لے لیا تھا۔ کھڈ میں کچھ سوکھے اور کچھ ہرے پتے بکھرے ہوئے تھے۔ کھڈ میں دبک کر بیٹھ جانے کے بعد میں نے فوجی نوعیت کی اپنی کٹ بیگ سے دوربین نکال لی تھی۔

چونکہ موسم بہت ہی خشک تھا اور نظروں کے سامنے وہ تینوں کچے راستے تھے' جن سے بیرونی طور پر آنے والوں پر نظر رکھی جا سکتی تھی۔ کہر نہ ہونے کی وجہ سے تینوں رہ گزروں کا میں ذرا سی توجہ مرکوز رکھنے پر جائزہ لے سکتا تھا۔

ہوا میں بھی تیزی تھی۔ ہلکی ہلکی گرد کے ساتھ سوکھے سوکھے پتے اور تنکے وغیرہ اڑاڑ کر مجھ پر اور کھڈ میں گر رہے تھے۔

بمشکل دس منٹ گزرے ہونگے کہ میں نے ستاروں کی روشنی میں ہیولہ دوربین کی رینج میں دیکھ لیا۔ ہیولہ چونکہ بڑی تیزی سے قریب ہو رہا تھا اس لئے صاف محسوس ہوا کہ وہ گھوڑے پر سوار ہے۔ گو کہ بے پناہ سناٹا تھا۔ اس کے باوجود گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز

نرم زمین کی وجہ سے سنائی نہیں دی۔ میں محتاط ہو گیا' میرے اعصاب پر تناؤ سا طاری ہو گیا۔ اچانک 'اجنبی گھوڑ سوار رک گیا' رکا ہی تھا کہ دائیں بائیں قد آدم کھیتوں سے بیک وقت چار انسانی ہیولے نمودار ہوئے اور گھوڑے سوار کے قریب پہنچ گئے۔

بالکل واضح تو نہیں' تاہم میں نے صاف محسوس کیا کہ ان چار میں سے ایک نے گھوڑے کی لگام پکڑ لی ہے اور گھوڑ سوار گھوڑے سے اتر پڑا ہے۔

وہ پانچوں انسان گھوڑے سمیت ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ بعض متحرک سیاہ ہیولے تھے۔ میرا اندازہ تھا کہ گھوڑے سوار ان سب میں اہمیت رکھتا ہے اور یقیناً یہ گروپ ڈاکوؤں کا ہے۔

بے ساختہ میرے لبوں پر کشت و خون سے بھرپور مسکراہٹ چھا گئی۔ میں نے سامان کی کٹ' دوربین اور ٹارچ بتی زمین پر رکھ دی اور اس پر کمبل ڈال دیا۔

پھر 'لانگ چرمی شوز سے اڑسا ہوا خنجر نکال کر ایکشن کے لئے تیار ہو گیا۔

اتنی سی دیر میں چاروں انسانی ہیولے گھوڑے سمیت قد آدم کھیت میں روپوش ہو گئے اور گھوڑ سوار ہیولہ بڑے تیزی سے جھگی نما مکانوں کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ ایک ہلکی سی چمک سے میں نے محسوس کیا کہ اس کے ہاتھ میں چمکدار ارانی والا نیزہ بھی ہے۔

کچھ سوچ کر میں نے کھڈ سے نکلنے کا فیصلہ کر لیا۔ صرف اس لئے کہ سیاہ پوش نے میری توقع کے خلاف راستہ اختیار کیا تھا جو کچھ بھی تھا میں نے بڑی تیزی سے اپنا اوور کوٹ بھی اتار لیا اور خنجر کو دانتوں میں دبا کر 'کھڈ سے نکلا اور کسی تیز رفتار سانپ کی طرح گھٹنوں اور کہنیوں کے بل رینگتا ہوا نمبردار کے گھر کی طرف بڑھا۔

بہت جلد میں نمبردار کے مکان کے مین دروازے کے قریب پہنچ گیا۔ پہنچا ہی تھا کہ میں نے پراسرار سیاہ پوش کو نمبردار کے مکان کی مغربی سمت والی حدبندی دیوار سے صرف چند قدموں کے فاصلے والے نیم پختہ مکان کے سائے میں رکتے دیکھا۔

میرا ماتھا ٹھنکا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ پراسرار انسان نیم پختہ مکان کے قریب کیوں رکا ہے۔

جیسا کہ میرے اور پراسرار انسان کے درمیان صرف چند قدموں کا فاصلہ تھا اس لئے میں نے دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز صاف طور پر سن لی۔ مجھے اپنے دیکھ لئے جانے کا کوئی اندیشہ اس لئے نہ تھا کہ میں گنجان درخت کی سیاہ ترین چھاؤں میں تھا اس کے علاوہ میرے سامنے لکڑی کے وہ ٹب رکھے ہوئے تھے جن میں گائے بھینسوں کو چارہ دیا جاتا ہے۔

☆☆☆

"مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے چھوٹے سرکار......"

میں نے کسی مرد کی کپکپاتی سرگوشی سنی۔ یہاں یہ بتلانا ضروری ہے کہ پراسرار سیاہ پوش کے اندر داخل ہوتے ہی میں اٹھ کھڑا ہوا تھا اور آندھی کی طرح درمیانی فاصلہ عبور کر کے مخصوص مکان کے دروازے پر پہنچ چکا تھا۔ دروازہ صرف بھڑا ہوا تھا اس لئے سرگوشیانہ آواز بھی میں بخوبی سن سکتا تھا۔ ویسے میں اپنے گرد و پیش سے بے خبر بھی نہ تھا۔

"کیوں۔ کس لئے ڈر لگ رہا ہے......" دوسری غراہٹ بھری آواز میں نے سنی۔ گفتگو پنجابی زبان میں ہو رہی تھی۔

"وہ......وہ چھوٹے سرکار مجھے اس اجنبی سے ڈر لگ رہا ہے جو...... جو سلطان کے گھر مہمان بن کر آیا ہے......"

"بکومت' اس کا انتظام بھی میں نے کر دیا ہے۔ بتا تیری گھر والی کہاں ہے......"

"اسے میں نے آپ کا پیغام ملتے ہی پنڈ کھرپال میں اس کے باپ کے گھر بھیج دیا ہے......"

"بہت اچھا کیا' زنانیاں راز فاش کر دیا کرتی ہیں۔ اچھا اب تم باہر جاؤ میں سرنگ میں داخل ہوتا ہوں......"

"چھوٹے سرکار۔ یہ جو ٹوکرا رکھا ہے' یہیں سے سرنگ لگائی تھی۔ اس کا اختتام نمبردار کے گھر کے باورچی خانے کے قریب ہوتا ہے جہاں اختتام ہوتا ہے وہاں کاٹھ کباڑ پڑا رہتا ہے۔ اس لئے تین دن گزر جانے کے باوجود کسی کو علم نہیں ہو سکا......"

"میرے جانے کے بعد صبح تک سرنگ پاٹ دینا اچھا جاؤ......"

آواز بند ہو گئی اور میں ہوا کے بگولے کی طرح دروازے سے ہٹ کر موڑ کی آڑ میں ہو گیا۔

بمشکل چند سیکنڈ گزرنے پائے تھے کہ ہلکی سی چرچراہٹ کی آواز سن کر میں مستعد ہو گیا۔

حالانکہ برفانی ہوائیں چل رہی تھیں مگر مجھے رتی برابر بھی سردی کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔

کچھ کچھ فاصلے پر اور بھی بہت سے کچے پکے مکان تھے۔ بیلوں گائے بھینسوں کی گاہے گاہے ڈکاریں ماحول کو مزید خوفناک بنائے ہوئے تھیں اس پر ستم یہ کہ چمگادڑوں کی اڑان رونگٹے کھڑے کیے دے رہی تھی۔

بہر حال، میں ایکشن لینے کے لئے تیار ہو گیا۔ انتہائی احتیاط سے میں نے جھانکا، مکین اپنے دروازے سے چند قدم آگے بڑھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ وہ بھی ایک سیاہ ہیولے کی مانند ہی نظر آرہا تھا۔ اس لئے بھی کہ وہ پیروں تک جھولتے ہوئے سیاہ کمبل میں لپٹا ہوا تھا اور میرا اندازہ تھا کہ اس کی پیٹھ میری جانب تھی۔ میں نے بڑی تیزی سے ایک فیصلہ کیا اور آڑ سے نکل کر دبے قدموں مکین کے قریب پہنچ گیا۔

یقیناً مکین نے میری موجودگی کو محسوس کر لیا تھا۔ وہ ایک ہلکی سی کراہ کے ساتھ بڑی تیزی سے گھوما۔ گھوما ہی تھا کہ میں نے بھوکے شیر کی طرح اسے اپنے بازو میں دبوچ لیا اور خنجر کی دھار اس کے نرخرے پر رکھ دی۔

"خبردار۔ کوئی آواز نکالی تو گردن دھڑ سے الگ کر دونگا......"

میری سرگوشیانہ وارننگ اس قدر خوفناک تھی کہ قوی ہیکل و گرانڈیل مکین خشک پتے کی طرح تھر تھرانے لگا تھا۔ اس کی گھگھی بندھ چکی تھی۔ وہ کچھ بھی نہ بول سکا اور میں اسے بڑی آسانی سے کھینچتا ہوا موڑوالے اندھیرے میں لے گیا۔

"بتاؤ وہ کون تھا جسے تو نے سرنگ میں داخل کیا ہے......" میں کوبرا ناگ کی طرح پھنکارا، مگر وہ کوئی جواب دیئے بغیر میرے بازو پر جھول گیا۔ پتہ نہیں وہ بیہوش ہو گیا تھا یا

ہارٹ اٹیک کا شکار ہو گیا تھا۔

آن واحد میں ایک فیصلہ کر کے میں نے اسے زمین پر ڈال دیا اور اس کا کمبل کھینچ لیا۔

پھر' یہ اطمینان کر لینے کے بعد کہ وہ واقعی ساکت و جامد ہے اس کا کمبل اسی کے سے انداز میں اوڑھ کر بڑی تیزی سے وہاں پہنچ گیا' جہاں وہ خود کھڑا تھا۔

وقت گزرتا گیا' ماحول خوفناک سے خوفناک تر ہوتا گیا۔ میرا اندازہ ہے کہ نصف گھنٹے تک میں کھڑا رہا تھا' چونکا اس وقت جب سیاہ پوش کی بھرائی ہوئی سرگوشی میری سماعت سے ٹکرائی۔

''وکرم سنگھ...... میں...... میں کلپنا کو لئے جا رہا ہوں' سرنگ پاٹ دینا کہ میرے نیزے نے رستم سنگھ کا......''

وہ جملہ مکمل نہ کر سکا۔ اس لئے کہ میں کمبل پھینک کر آہنی چٹان کی طرح اس کے سامنے رکاوٹ بن کر کھڑا ہو گیا۔

''کک' کون ہو تم......'' فرط خوف سے وہ ہکلا گیا۔

اس کے ہاتھ میں نیزہ نہ تھا بلکہ اس کے کندھے پر کمبل میں لپٹی ہوئی بالیقین کلپنا تھی اس نے اپنے دونوں بازو کلپنا کی کمر کے گرد حائل کر دیئے تھے۔ ''وصی الدین چغتائی۔ سلیمہ اور نسیمہ کا بھائی......'' میری آواز میں خون پینے والے ویمپائر کی سی خرخراہٹ تھی اور یہ تبدیلی یقیناً میرے وجود میں سمائی ہوئی گزراجنی کے باعث ہوئی تھی۔

جملے کے اختتام تک میں نے نچے تلے انداز میں خنجر اس کے نرخرے پر چلا دیا۔ پھر اس سے پہلے کہ کلپنا اس کے کندھے سے گرتی' میں نے اسے اپنے بازوؤں میں سہار لیا۔

برعکس اس کے سیاہ پوش کے حلق سے کریہہ ترین خرخراہٹ نکلی اس کا جسم بید مجنوں کی طرح کپکپایا۔ میں اگر فوراً ہی ان کے سامنے سے نہ ہٹ جاتا تو اس کے حلق سے خرخراہٹ کے باعث نکلنے والے خون کی فوار میرا لباس آلودہ کر دیتی۔

وہ لہرا کر گرا اور ایڑیاں رگڑنے لگا۔ بن جل مچھلی کی طرح تڑپنے لگا۔ میں اس پر ایک اچٹتی سی نظر ڈال کر پوری لاپرواہی سے چلتا ہوا اسی گھر میں داخل ہو گیا جہاں سے مقتول

برآمد ہوا تھا۔

چونکہ میری آنکھیں اندھیرے کی عادی ہو چکی تھیں اس لئے ذرا سی کوشش سے چھوٹے سے صحن میں زمین پر پڑا ہوا ٹوکرا مجھے نظر آ گیا۔ ٹوکرے کے قریب ہی زمین میں ایک چوکور گڑھا بھی دیکھ لیا۔ گڑھے سے صرف چار قدموں کے فاصلے پر ایک ٹوٹی ہوئی چارپائی پڑی تھی۔ میں نے کلپنا کو اس چارپائی پر ڈال دیا۔

چند ہی لمحوں میں مکان سے باہر زمین پر پڑا ہوا کمبل اٹھا کر کلپنا پر ڈال دیا اور جیسے ہی باہر جانے کے لئے مڑا' ایک وقت سیاہ پوشوں کو اندر داخل ہوتے دیکھ کر ہوا کے بگولے کی طرح اکڑوں بیٹھ گیا۔

"یہاں...... یہاں تو کوئی بھی نہیں......" خوف سے کانپتی ہوئی آواز سن کر میرا ذہن بھک سے اڑ گیا۔

وجہ یہ تھی کہ یہ آواز چیک پوسٹ کے انچارج ڈیوڈ کی تھی۔

"وکرم سنگھ......" دوسرے سیاہ پوش کی بھرائی ہوئی آواز ابھری۔ لمحہ میں نے صرف ایک لمحہ کے لئے سوچا' دوسرے لمحے کے شروع ہونے سے پہلے ہی میرا خنجر والا ہاتھ بجلی کی سی تیزی سے حرکت میں آیا اور کھچ سے سب انسپکٹر ڈیوڈ کے حلق میں ڈوب گیا۔

وہ خرخرا بھی نہ سکا' صرف یہ ہوا کہ اس کے جسم کو ایک زبردست جھٹکا لگا اور وہ لہرانے لگا۔

"کیا ہوا سر' کیا ہوا آپ کو......" دوسرا بوکھلا گیا۔ اس مرتبہ اس کی آواز کچھ تیز ہو گئی تھی۔

کوئی لمحہ ضائع کئے بغیر' ڈیوڈ کے گرنے سے پہلے ہی میں اپنی جگہ سے اٹھ کر دوسرے شخص کی طرف بڑھ گیا۔

"کک' کون ہو...... کون ہو تم......" دوسرا سیاہ پوش کپکپاتی آواز میں بولا' ساتھ وہ کمبل پھینک کر کمر سے لٹکی ہوئی تلوار کی طرف ہاتھ بڑھانا ہی چاہتا تھا کہ قریب پہنچ کر میں

نے دائیں ہاتھ سے اس کا نرخرہ دبوچ لیا۔

دو ہی منٹ میں اس کی آنکھیں ابل پڑیں' منہ کھل کر رہ گیا۔ اور اس کے کھلے ہوئے منہ سے بالشت بھر زبان ابل پڑی تھی۔ وہ شدید جھٹکے لیتے ہوئے سرد پڑ گیا۔ میں نے اسے چھوڑ دیا اور اس کا مردہ جسم زوردار دھماکے سے گر پڑا۔

دوربین اور ٹارچ میں نے کٹ بیگ میں محفوظ کر لی اور کوٹ تو میں پہلے ہی پہن چکا تھا۔ کمبل اٹھا کر کندھے پر رکھا اور کھڈ سے نکل کر خالو کے گھر کی راہ لی۔

مجھے بے انتہا سکون مل چکا تھا۔ میری بے گناہ بہنوں سمیت کئی دیگر دوشیزاؤں کی عصمت اور زندگی کا قاتل میرے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچ چکا تھا۔ بھلا کریالہ گاؤں کا محافظ' چوہدری نظام کا پالتو کتا سب انسپکٹر ڈیوڈ عبرتناک موت مر چکا تھا۔ وہ اور اس کا کانسٹیبل دونوں ہی پولیس کی وردی میں تھے۔ وردی کو چھپانے کے لئے انہوں نے کمبل اوڑھ رکھے تھے۔ سب ہی لاشیں اپنی اپنی جگہ چھوڑ دی تھیں میں نے صرف کلپنا کو اٹھا کر بذریعہ سرنگ انتہائی دقتوں کے بعد اس کے کمرے میں پہنچا کر لوٹ آیا۔

کلپنا کی چارپائی کے قریب ہی رستم سنگھ کی چارپائی تھی اور وہ اپنی چارپائی پر مردہ پڑا ہوا تھا۔ ارسلان نے اس کے سینے پر اس شدت سے نیزہ مارا تھا کہ انی پیٹھ سے جھانکنے لگی تھی۔ اس کا لباس اور بستر خون سے لت پت تھا' خون جم چکا تھا۔

لالٹین چھت سے لٹکی ہوئی تھی البتہ انگیٹھی میں شعلے باقی نہیں رہے تھے۔

مجھے علم تھا کہ کلپنا کا بھائی رندھیر سنگھ کاروباری ضرورت کے تحت دوپہر ہی چکوال چلا گیا تھا۔ مجھے رستم سنگھ کی موت پر بہت ہی دکھ ہوا تھا۔

کھڈ سے اپنی اشیاء اٹھانے سے پہلے میں نے دوربین سے دو طرفہ کھیتوں کے درمیان کا جائزہ لے لیا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ دو ڈھائی گھنٹے انتظار کرنے کے بعد بقیہ بچ رہنے والے دونوں سیاہ پوش ارسلان کے گھوڑے سمیت لوٹ گئے ہوں گے اسی لئے میں نے فیصلہ کر لیا کہ گھر پہنچ کر آرام کروں۔

ہوا کی تیزی کے ساتھ ساتھ گرد و غبار کے مرغولے بھی اٹھنے لگے تھے۔ نہ جانے

کہاں سے نکل کر فضاؤں میں سینکڑوں نہیں ہزاروں چمگادڑیں غوطے لگانے لگی تھیں۔ قرب و جوار سے چند کتوں کے رونے کی آوازیں بھی ماحول کو بہت ہی خوفناک بنائے ہوئے تھیں۔ یوں لگ رہا تھا جیسے ہر طرف بد روحیں رقصاں ہیں۔

اور میں، ماحول کی تمام حشر سامانیوں سے لاپرواہ ایک روح کی طرح گھر کی طرف بڑھ رہا تھا۔ سرد ترین اور ہولناک شب کے ساڑھے بارہ بج چکے تھے۔

میں بے خبر بڑھتا رہا کہ اچانک ٹھٹک کر رہ گیا۔ میرے رکنے کی وجہ دو طرف سے اٹھنے والی وہ غیر انسانی آوازیں تھیں جو میرے پورے وجود میں سرسراہٹ سی پیدا کر گئیں۔

مگر، صرف ایک لمحے کے دسویں حصے میں نارمل ہو گیا۔ بالکل غیر ارادی طور پر مڑا، مڑتے ہی میری نظریں چھوٹے چوہدری ارسلان پر پڑیں۔

اس کا پورا جسم بہشتی روشنی سے دمک رہا تھا۔ اس کی گردن حلق کی جانب سے کٹی ہوئی تھی اور کٹے ہوئے حصے سے آتش فشاں کے لاوے کی طرح خون بہہ بہہ کر اس کے لباس اور زمین پر گر رہا تھا اس کے پیچھے پیچھے ہارٹ اٹیک سے مر جانے والا وکرم سنگھ بھی تھا۔ ان دونوں کی آنکھیں انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔ وہ مسکرا رہے تھے، اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ۔

بے ساختہ میرا دل اچھل کر میرے حلق میں آ اٹکا۔ صرف میرا ذہن ہی متحرک رہا تھا، بقیہ جسم بے جان ہو کر رہ گیا تھا۔ میں نے سوچا، ارسلان کو میں نے خود ذبح کیا تھا۔ وکرم سنگھ اور ارسلان کی موت کا یقین ہو جانے کے بعد ہی میں نے دوسری کارروائی کی تھی پھر یہ دونوں زندہ کیسے ہو گئے۔

ابھی میں کسی فیصلے پر پہنچنے بھی نہیں پایا تھا کہ میرے بائیں جانب سے اچانک ہی کسی کتے کے رونے کی روح لرزا دینے والی آواز ابھری۔ میں اس طرح اچھل پڑا جیسے میرے پیروں پر سانپ نے ڈنک مار دیا ہو جیسے ہی گردن موڑی، سب انسپکٹر ڈیوڈ اور اس کے ساتھی کو اپنی جانب بڑھتے دیکھا۔

ڈیوڈ کے حلق کا سوراخ اور اس سے بہنے والا سرخ لاوے کی طرح کا خون صاف نظر آیا۔

معاً میرے پورے وجود میں گرمی سا گئی' دل کی دھڑکنیں جاری ہو گئیں اور خطرے کا احساس جاگ اٹھا۔ میں پھر مڑا' مڑا ہی تھا کہ میں نے زبانیں لٹکائے' سلگتی آنکھوں والے دو بھیڑیوں کو دیکھا جو مجھ پر حملہ آور ہونے کے لئے زمین سے پنجے رگڑ رہے تھے۔

فی الفور مجھے یقین ہو گیا کہ ارواح خبیثہ نے مجھے گھیر لیا ہے۔ حیرت انگیز طور پر میں نے وہی خنجر لانگ شوز سے کھینچ لیا جو میں نے ڈیوڈ کے حلق سے کھینچا تا۔

"آؤ...... آؤ شیطانوں مجھ پر حملہ کرو......" میں خنجر دبوچ کر دونوں خوانخوار بھیڑیوں کی طرف لپکا مجھے ارسلان' کرم سنگھ اور ڈیوڈ وغیرہ کی ذرہ برابر تشویش نہ ہوئی۔

اچانک بھیڑیئے غرائے' ان کی غراہٹ ہر چہار سمت سے گونجتی محسوس ہوئی۔ میں یہ سمجھا کہ بیک وقت سینکڑوں بھیڑیوں نے مجھے گھیر لیا ہے۔

ہوا کی تیزی' آندھی کا رخ اختیار کر چکی تھی' گردو غبار کے مرغولوں نے مجھے پوری طرح اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ سیاہ چمگادڑوں کے غول کے غول سیاہ بدلیوں کی طرح مجھے اپنے حصار میں لے چکے تھے ماحول پر اس قدر دہشت طاری ہو چکی تھی کہ جنگ عظیم کی ہولناکیاں بھی اس کے سامنے پھیکی پڑ چکی تھیں۔

غراہٹ کے ساتھ ہی بیک وقت دونوں بھیڑیئے ہوا میں اڑتے ہوئے مجھ پر حملہ آور ہو گئے۔ وہ اس تیزی سے مجھ پر حملہ آور ہوئے کہ میں ان پر کوئی ضرب نہ لگا سکا بلکہ ان کے حملے سے بچنے کے لئے فوراً ہی ایک مشاق غوطہ خور کی طرح خود کو سینے کے بل زمین پر گرا دیا۔

دونوں غراتے ہوئے بھیڑیئے ہوا کے بگولے کی طرح میرے اوپر سے گزر گئے۔ گزرے ہی تھے کہ میں نے بیک وقت پھٹی ہوئی مردانہ کرہناک آوازیں سنیں۔ جیسے کسی گہرے کنویں سے کوئی ڈوبتا انسان مدد کے لئے چلا پڑا ہو۔

یہ آواز سنتے ہی میں گیس بھرے غبارے کی طرح اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ مڑا اور یہ

دیکھ کر میرے لبوں پر کشت و خون سے بھری ہوئی مسکراہٹ عود کر آئی کہ' دونوں بھیڑیئے مقتول ارسلان اور وکرم سنگھ سے لپٹے ہوئے ہیں۔

وہ دونوں پیٹھ کے بل زمین پر پڑے تھے اور دونوں بھیڑیئے ان کے نرخرے ادھیڑ رہے تھے۔ ساتھ ہی ایسی لرزہ بر اندام کر دینے والی آوازیں بھی ابھر رہی تھیں جیسے بیسیوں بد روحیں چلا رہی ہوں۔

اب چمگادڑوں کے غول بھیڑیوں کے جسموں کی بلندیوں پر جمع ہو چکے تھے آندھی اب طوفان کا روپ دھار چکی تھی۔ باوجود قبر کے سے اندھیرے کے مجھے ہر چیز واضح نظر آنے لگی تھی۔ میں محویت کے عالم میں اس قدر مگن ہو گیا تھا کہ ڈیوڈ اور اس کے ساتھ مردے کو نظر انداز کر دیا تھا ہوش تو مجھے اس وقت آیا جب اچانک ہی آنکھوں میں خیرگی پیدا کرنے والی قوس و قزح کے رنگ بکھیرتی باریک ترین لہروں نے مجھے حصار میں لے لیا۔ ڈیوڈ اور اس کا ساتھی مردہ میرے اس قدر قریب ہو چکے تھے کہ ہاتھ بڑھا کر مجھے باآسانی دبوچ لیں۔

مگر ان کے ہاتھ اٹھے رہ گئے۔ میرے گرد طواف کرنے والی باریک اور ہفت رنگی لہریں دونوں مردوں کے جسم سے بھی ٹکراتی رہیں۔ ہر ٹکراؤ کے وقت دونوں مردوں کے حلق سے ایسی بھیانک ترین آوازیں نکلتیں جیسے بھیڑیوں کے حلق میں ہڈیاں پھنس گئی ہوں۔

اس کے ساتھ ہی دونوں مردوں کی گردنیں' بازو اور جسم کا کوئی نہ کوئی حصہ کٹ کٹ کر زمین پر گرتا رہا۔ گرتے ہی حرف غلط کی طرح غائب بھی ہو جاتا نہ جانے کیوں مطمئن ہو کر میں نے بھیڑیوں کی جانب نظریں گھمائیں۔ دونوں بھیڑیئے اپنے شغل میں مصروف تھے۔ ان کی چپڑ چپڑ کی آوازیں ایک قیامت سی مچائے ہوئے تھیں۔

گو کہ تمام واقعات ناقابل یقین سے لگتے تھے' مگر حقیقت میری نظروں کے سامنے تھی۔ میں خود کو طلسم ہوشربا کی وادی میں محسوس کر رہا تھا۔ مجھے یقین کر لینا پڑا کہ نیکی اور بدی دونوں قوتیں دنیا میں موجود ہیں۔ مسلسل پندرہ منٹ تک موت و زیست کا خونی منظر

قائم رہااور پھر' اچانک ہی طوفان تھم گیا۔ چمگادڑوں کے غول' دونوں بھیڑ یئے اور چاروں مردے حرف غلط کی طرح غائب ہو گئے۔ قوس و قزح کی لکیروں کا رقص موقوف ہو گیا اور وہ لہریں میرے ہی وجود میں غائب ہوتی رہیں۔

ذرا سی دیر میں ماحول سازگار ہو گیا۔ روتے کتے خاموش ہو گئے اور مجھے گاؤں کے کچے پکے مکانات وبلند بالا درختوں کے جھومتے ہوئے ہیولے نظر آنے لگے۔

مویشیوں کی ڈکاریں' پرندوں کی خواہاک آوازیں اور حشرات الارض کی سیٹیاں سنائی دینے لگیں۔

بے ساختہ گنزا کا تصور میرے ذہن پر ابھر آیا۔ میں جھرجھرا کر رہ گیا۔ خوف سے نہیں بلکہ کڑاکے دار سردی سے۔

میں نے لپک کر اپنی کٹ بیگ اٹھائی' خنجر کو شوز میں اڑسا اور کمبل اٹھا کر تیز تیز قدموں سے خالو کی حویلی کی طرف بڑھ گیا۔

پراسرار' سرد ترین اور ہولناک شب کے ڈھائی بجنے والے تھے۔ میں نیم میدانی علاقہ عبور کر کے گاؤں کے کچے پکے مکانات کی تنگ و تاریک اور متعفن گلیوں کو عبور کرتا چلا گیا۔

چند موڑ مڑنے کے بعد میں ایک ایسے راستے پر پہنچ گیا جہاں میرے دائیں جانب پکی اینٹوں کی بنی ہوئی مسجد تھی اور بائیں جانب چھوٹے سے میدانی حصے میں مندر تھا۔

چمگادڑیں اب بھی غوطہ زن تھیں' مگر تعداد حسب معمول تھی۔ کبھی کبھار کتوں کے بھونکنے کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔

چونکہ مسجد کا موڑ مڑنے کے بعد میں خالو کی حویلی تک پہنچ سکتا تھا اس لئے میری رفتار میں اچانک ہی تیزی آگئی۔ آئی ہی تھی کہ...... "وصی الدین......" اچانک ایک مشفقانہ مردانہ آواز سن کر میں ٹھٹک کر رک گیا۔

فوراً ہی آواز کی طرف مڑا۔ دیکھا تو ایک دراز قد بزرگ کھڑے ہیں سر سے لے کر پاؤں تک سفید لباس میں ملبوس میری ہی طرف تک رہے تھے۔ باوجود سیاہ رات کے ان کا

سراپا دودھ کی طرح چمک رہا تھا۔ ''اسے اٹھالو...... '' سفید پوش بزرگ نے زمین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور غائب ہو گئے۔

میں گو مگو میں مبتلا ہو گیا۔ ذہن کہتا کہ یہ سب کچھ میرا وہم ہے اور دل کہتا کہ جو کچھ میں نے دیکھا یا سنا' وہ ایک حقیقت ہے۔ بالآخر دل کی بات مان کر میں اسی طرف بڑھ گیا جہاں سفید پوش بزرگ کھڑے تھے۔ قریب پہنچ کر دیکھا تو زمین پر لپٹا لپٹایا ایک سنہرا ہنٹر پڑا ہے۔ کوئی تغافل کئے بغیر میں نے ہنٹر اٹھالیا اور یہ فیصلہ بھی کر لیا کہ گھر پہنچ کر ہنٹر کا جائزہ لوں گا۔

بہر حال مسجد عبور کر کے جیسے ہی میں ایک تنگ و تاریک گلی میں پہنچا' ایک شیر خوار بچے کی بلبلاتی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ اگر میدانی علاقہ ہوتا تو شاید میں سمت کا تعین نہ کر سکتا۔ مجھے یقین کر لینا پڑا کہ بلبلاتا بچہ گلی ہی میں کہیں ہے جو اندھیرے کے باعث نظر نہیں آ رہا گلی بھی کوئی خاص لمبی نہیں تھی' دائیں بائیں بمشکل پانچ پانچ جھگیاں بنی ہوئی تھیں۔ جن کے صحن میں بندھے بیل بکریوں کی آوازیں با آسانی میں سن رہا تھا۔

میں بمشکل چار پانچ قدم آگے بڑھا ہی تھا کہ وسط گلی میں ایک معصوم شیر خوار بچہ اواں...... اواں کی آواز سے رو رہا ہے۔

فرط محبت سے بیخود ہو کر میں اکڑوں بیٹھ گیا۔ بچہ صرف چڈی پہنے تھا۔ بچے کے دونوں بازو اٹھے ہوئے تھے' جیسے وہ کہہ رہا ہو کہ مجھے اٹھالو۔

رحم کے جذبات میرے دل و دماغ پر مسلط ہو گئے۔ میں نے فوراً ہی بچے کو اٹھالیا اور بچہ ایک دم سے خاموش ہو گیا۔

''ارے بھئی گاؤں والو...... '' میں اونچی آواز میں پکارا۔

''کس کا ہے یہ بچہ...... '' میں نے جملہ مکمل کر دیا۔

کوئی جواب نہ ملا۔ کسی جھونپڑے کا دروازہ نہ کھلا۔ سناٹا اور اندھیرا میرا منہ چڑاتا رہا۔ تین آوازیں لگانے کے باوجود جب کوئی عورت یا مرد دروازے سے نہ نکلا تو میں سر جھٹک کر آگے بڑھ گیا۔ یہ سوچ کر کہ بچے کو خالہ ماں کے سپرد کر دوں گا۔ اور صبح کو اعلان

کروادوں گا۔

گلی میں نے عبور کرلی' سامنے ہی بیس پچیس قدموں کے بعد خالو کی حویلی تھی۔ میں تیز تیز قدموں سے بڑھنے لگا۔ میں جوں جوں آگے بڑھتا گیا' بچے کا وزن بھی بڑھتا گیا اور اس قدر بڑھ گیا کہ میں قدم نہ اٹھا سکا۔ میری سانس پھول گئی اور میں درخت کے نیچے رک گیا۔

اب جو میں نے مڑ کر دیکھا تو...... یکبارگی میرا دل اچھل کر میرے حلق میں آ اٹکا۔ میرا سر اس شدت سے چکرایا کہ میرا کمر سے اوپری جسم جھومنے لگا۔

وجہ بھی معقول تھی' میں نے دیکھا کہ جس اندھیری گلی کے مقام سے بچے کو گود لیا تھا' بچے کے پیر وہیں چپکے ہوئے تھے' اس کی ٹانگیں لمبوتری ہو چکی تھیں۔

فرط حیرت سے میری آنکھیں پتھرا کر رہ گئیں' لیکن ایک لمحہ کے دسویں حصے میں میرے اوسان بحال ہو گئے۔

میں نے خوف' وحشت اور دہشت کے عالم میں دیکھا' وہ بلبلاتا ہوا معصوم صورت بچہ آن واحد میں عفریت بن چکا تھا۔ اس کی آنکھیں کٹوروں کی طرح پھیل چکی تھیں اور آنکھوں میں انگارے سے بھڑکنے لگے تھے۔

اس کا دہانہ بھیڑیئے کے دہانے سے مختلف نہ تھا۔ اس کی بالشت بھر زبان باؤلے کتے کی زبان کی طرح لٹکی ہوئی تھی' اور اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے میری ٹھوڑی اور کنپٹی کو اس شدت سے دبادیا کہ سیدھا نہ کر سکا اور میں نے اندازہ لگایا کہ وہ میری گردن والی شہہ رگ میں اپنے خونخوار دانت گاڑ دینا چاہتا ہے۔

اچانک میں نے اپنا وہ بازو گرادیا جس پر بچے کو اٹھایا ہوا تھا۔ وہ میرے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر پڑا۔ گرا تو میں بھی' اس لئے میری کنپٹی اور ٹھوڑی سے عفریت بچے کی گرفت ختم نہ ہو سکی تھی۔۔

اگر میں فوری طور پر اپنے دونوں ہاتھ زمین سے نہ ٹیک دیتا تو میرا چہرہ بالضرور زخمی

ہو جاتا' اس کے باوجود مجھے اس قدر شدید چوٹ لگی کہ میرا جوڑ جوڑ مواد بھرے پھوڑے کی طرح دکھنے لگا۔

مگر' یہ وقت درد سہلانے کا نہیں بلکہ جان بچانے کا تھا۔ پھر' اس سے پہلے کہ عفریت بچہ میری گردن والی شہہ رگ پر منہ مارتا' میں نے آن واحد میں اپنے لانگ چرمی شوز سے خنجر کھینچ کر بھرپور قوت سے خنجر اس کے پیٹ میں گھسیڑ دیا۔

''اف...... اف۔'' عفریت بچے کے منہ سے ایک ہولناک مگر غیر انسانی آواز نکلی۔ میرا اندازہ تھا کہ اس کی ڈراؤنی آواز پورے گاؤں کے طول و ارض میں گونج کر رہ گئی ہو گی۔

خنجر سے حملے کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ عفریت بچے کے دونوں ہاتھ جو میری کنپٹی اور ٹھوڑی پہ جمے ہوئے تھے' جھک گئے اور میں گیند کی طرح اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

اچانک میرے ذہن پر ایک خیال بجلی کے کوندے کی طرح ابھرا اور معدوم ہو گیا۔ وہ یہ کہ میں کیوں نہ وہ ہنٹر استعمال کروں جو تھوڑی دیر پہلے ایک سفید پوش بزرگ نے مجھے دیا تھا جو میرے گرنے کے باعث میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا۔

پلک جھپکنے کی دیر میں فی الوقت میں نے کوڑا اٹھا لیا۔ میں جانتا تھا کہ خنجر کی کاری ضرب پڑنے سے میں عفریت بچے کی گرفت سے آزاد تو ہو گیا ہوں مگر آناً فاناً میں اس کا زخم بھر جائے گا اور وہ اپنی شیطانی قوتوں کے استعمال سے مجھے بالیقین نقصان پہنچائے گا۔

لٰہذا میں نے کوڑے کو دستے سے پکڑ کر کھول دیا۔ اندازہ تھا کوڑے کی لمبائی تین گز ضرور ہو گی۔ جیسے ہی میں نے کوڑا لہرایا' کوڑے کا پورا جسم آگ کی طرح سرخ ہو گیا۔ شڑاپ سے میرا لہرایا ہوا کوڑا آگ بن کر عفریت بچے کی گردن سے لپٹ گیا۔ ایسا ہوتے ہی عفریت بچے کے حلق سے نکلنے والی خرخراتی اور کھوکھلی آواز نے زمین و زمان پر ہیبت طاری کر دی۔ '...... چیخ ...... چز'' کی ایک کریہہ آواز بھی ابھری' جیسے میں نے زندہ مچھلی کو کھولتے ہوئے تیل میں ڈال دیا ہو۔

چمڑی و گوشت جلنے کی ناقابل برداشت بدبو بھی اٹھی۔ اس کے ساتھ ہی چاروں

طرف سے سینکڑوں روتی آوازیں گونجنے لگی تھیں۔ عفریت بچے کی دونوں ٹانگیں سمٹ چکی تھیں۔

ایک لمحہ کی تاخیر کے بغیر میں نے کوڑا کھینچ لیا۔ جس تیزی سے کھینچا اس سے کہیں زیادہ تیزی سے دوبارہ عفریت بچے کے ننگے جسم پر رسید کر دیا۔

مجھ پر گویا جنون سا سوار ہو چکا تھا۔ شڑاپ شڑاپ سے میں اس پر کوڑے برساتا رہا۔ اس کی دلدوز چیخیں گونجتی رہیں' جسم جلتا رہا اور اس کے تڑپنے سے زمین میں گڑھے پڑتے رہے۔

صرف دو منٹ کے اندر پورے ماحول پر ابدی سناٹا چھا گیا۔ عفریت بچے کا نام و نشان تک مٹ گیا۔ پتہ نہیں اسے زمین نگل گئی یا وہ آسمان کی ہولنا کیوں میں تحلیل ہو گیا۔

بے ساختہ میرے لبوں سے اطمینان کی طویل سانس نکل گئی۔ میں نے بے انتہا مسرت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہنٹر کو لپیٹ لیا اور فرط عقیدت سے اسے چوم بھی لیا۔

ہر طرح سے مطمئن ہو جانے کے بعد مجھے اپنی بے وقوفی پر شدید ندامت محسوس ہوئی۔ اس لئے کہ ہر طرف' ہر ذرہ برف بنا ہوا تھا۔ اس قدر گرم لباس ہونے کے باوجود سردی مجھے بچھو کے سے لگا رہی تھی' میرے ہونٹ کٹتے محسوس ہو رہے تھے۔ ایسے میں ایک ایسا بچہ جو صرف چڈی پہنے ہوئے تھا' کیسے زندہ رہ سکتا ہے۔

ہے ناں حماقت کہ بن سوچے سمجھے میں نے اسے گود میں اٹھا لیا اور اس کے ننگے جسم پر کمبل تک نہ ڈالا تھا۔ اپنی حماقت پر افسوس کرتے ہوئے میں حویلی کے بڑے گیٹ پر پہنچ گیا۔

گیٹ کے ساتھ والے گنجان درخت پر ایک نظر ڈالتے ہوئے میں نے آہستہ سے سلطان لالا کو آواز دی۔ مجھے شبہ ہوا کہ سلطان بھائی کہیں درخت پر ہی نہ دبکا بیٹھا ہو۔

مگر کوئی جواب نہ پا کر میں نے ذیلی دروازے کا تالا کھولا اور ہر ممکن احتیاط کا مظاہرہ کرتے ہوئے اندر داخل ہو گیا۔

"شکر ہے رب دا کہ توں آ گیا......"

جانی پہچانی آواز سن کر میں گہری سانس خارج کرتا رہ گیا۔ یہ سلطان ہی تھا جو صحن کے کسی حصے سے اٹھ کر میری طرف بڑھا چلا آرہا تھا۔



"وصی پترا بہت تھکے ہوئے لگتے ہو......" میرے خالو نے مشفقانہ لہجے میں کہا۔

خالو ابا میرے ہی کمرے میں آگئے تھے۔ سلطان بھائی لالٹین کو ٹیبل پر رکھنے کے بعد دونوں بھائیوں سمیت ایک طرف کھڑے ہو گئے تھے۔ میری دونوں بہنیں میری چارپائی سے قریب ایک پلنگ پر لحافوں میں لپٹی ہوئی گہری نیند سو رہی تھیں۔

"ابا جی......" سلطان بھائی میرے خالو سے مخاطب ہوئے۔ "وصی نوں سونے دو۔ سویرے گلاں کراں گے......"

جملہ مکمل ہوا اور میرے خالو سر پر پدرانہ شفقت سے ہاتھ پھیر کر بیٹوں سمیت کمرے سے نکل گئے۔

میرے عزیزوں کی مجھ سے بے پناہ محبت کا یہ ایک اور ثبوت تھا کہ چاروں مرد میری واپسی تک جاگتے رہے تھے۔ ویسے سلطان بھائی کو مختصر طور پر میں نے بہت کچھ سمجھا دیا تھا۔

چونکہ لالٹین کی لو نیچی تھی اس لئے کمرے میں بہت ہی مدھم روشنی تھی۔ میں نے دونوں سوتی بہنوں پر اچٹتی نظر ڈالی اور لباس بدلنے کی غرض سے ملحقہ باتھ روم میں داخل ہو گیا۔

یوں محسوس ہوا جیسے میں کسی تاریک اور بھیانک غار میں داخل ہو گیا ہوں۔ تاہم میں نے اندھے کی طرح ٹٹول ٹٹول کر ٹب پر سے ماچس اٹھالی اور تیلی جلا کر موم بتی جلالی۔

پانچ منٹ میں، میں نے نہ صرف یہ کہ سلیپنگ لباس پہن لیا تھا بلکہ سوٹ وغیرہ کو تولیے سے اس قدر صاف کر دیا کہ جیسے میں نے استعمال ہی نہیں کیا ہو۔

ابھی میں نے دروازہ کھولا بھی نہ تھا کہ موم بتی کے بہت قریب مجھے گنزا کھڑی ہوئی نظر آئی۔ اس کے سر کے بال بری طرح بکھرے ہوئے تھے۔ وہ اپنے دوپٹے سے

اپنے گلاب کے پھول کی طرح دمکتے ہوئے چہرے سے پسینہ پونچھ رہی تھی۔ اس کی سانس بھی تیز تیز چل رہی تھی۔

گنزا کو دیکھتے ہی میرا ذہن سینکڑوں فٹ کی بلندیوں پر قلابازیاں سی لگاتا محسوس ہوا۔

"پیاری گنزا......" میں انتہائی سرگوشیانہ لہجے میں بولا۔ "کک کیا ہوا تمہیں...... ؟"

"مرتے مرتے بچی ہوں وصی صاحب......" اسکے معصوم سے لہجے میں تھکاوٹ تھی۔

"کیوں بھئی۔ تم تو آتشی مخلوق سے ہو۔ تمہاری پشت پر بہت ہی زبردست قوت ہے......"

"ہے۔ بے شک ہے مگر، جس عفریت بچے نے آپ کو دبوچا تھا، وہ بھی جنات ہی کی اولاد تھا۔ اس نے دوال پا کی طرح سب سے پہلے، تمہارے وجود میں مجھ ہی کو دبوچا تھا۔ وہ مجھ ہی کو بے بس کرنے میں مصروف تھا ورنہ آپ کی گردن کو فوراً ہی ادھیڑ لیتا۔ میں نے ہی اسے آپ کی شہ رگ سے الگ رکھا تھا۔

وصی الدین صاحب، اس قدر چوٹیں کھانے کے باوجود آپ کی عقل ٹھکانے نہیں آئی۔ کیا ضرورت تھی بچے کو گود میں اٹھانے کی؟ آپ اتنا بھی نہ سوچ پائے کہ اس غضب کی سردی میں ننگا انسانی بچہ کیسے زندہ رہ سکتا ہے؟......"

"مم، مجھ، مجھ سے واقعی حماقت ہو گئی تھی گنزا......" میں بدقت تمام کہہ پایا تھا کہ......

"ہوشیار۔ کوڑا اٹھاؤ اور جلدی سے باہر نکلو......" نہ جانے گنزا کے جملے میں کیسی مقناطیسیت تھی کہ میں نے فی الفور ہاتھ بڑھا کر کھونٹی سے ہنٹر اٹھا لیا۔ جب کہ گنزا کا وجود قوس قزح کے باریک شعلے کا روپ دھار کر میرے جسم میں غائب ہو چکا تھا۔

آن واحد میں دروازہ کھول کر میں جیسے ہی باتھ روم سے نکلا، ایک انوکھا اور عقل خبط کر دینے والا منظر دیکھتے ہی میرا دل دھک سے ہو کر رہ گیا۔

میں نے دیکھا، جس پلنگ پر فوزیہ اور فرحین سوئی ہوئی تھیں، وہ چھت اور فرش کے درمیان معلق ہے اور پلنگ کے سرہانے جانب ایک قد آدم آگ دہک رہی ہے۔ آگ کی

بناوٹ یا عکس بالکل انسانی عکس کی طرح تھا۔ شکل و صورت اور جسم قطعی نظر نہیں آیا۔ پورا کمرہ آگ کی طرح سرخ روشنی میں نہایا ہوا تھا اور ایسی بھیانک آوازیں بلند ہو رہی تھیں جیسے کئی بھیڑیئے مل کر اپنے کسی مرغوب شکار کو دبوچ رہے ہوں۔ آن واحد میں میرے سر تاپا بجلیاں سی کوند گئیں۔ میری آنکھیں شعلے بن گئیں اور وجود شعلہ جوالا سا بن گیا۔

نہ جانے' میرے لبوں سے کیسی آواز نکلی میں اس لئے سمجھ نہیں پایا کہ میرے اوسان میرا ضبط اور میرا صبر ساتھ چھوڑ چکے تھے جو کچھ بھی تھا' آسمانی بجلی کی طرح میرا کوزے والا ہاتھ حرکت میں آگیا۔

اف میرے خدا' جیسے ہی میرا کوزا سلگتے وجود سے ٹکرایا' ایک ہیبت ناک ترین آواز پیدا ہوئی۔ بالکل یوں لگا جیسے کوئی آتش فشاں پھٹ پڑا ہو۔

کھٹاک سے معلق پلنگ فرش سے ٹکرا گیا اور سلگتا وجود مرغولے کی طرح گھومتا ہوا آن واحد میں چھت والے ہوادان میں غائب ہو گیا۔

''لالا جی...... ''میری دونوں بہنیں شدید گھبراہٹ میں مبتلا لحاف جھٹک کر اٹھ بیٹھیں۔ ان کے چہرے فرط خوف سے زرد پڑ چکے تھے اور آنکھیں پتھرا گئی تھیں۔

قطع نظر ان کے کمرے پر وہی ابدی سکوت چھا گیا تھا جو باتھ روم میں جانے سے پہلے میں نے دیکھا تھا۔ لالٹین کی بہت ہی مدھم روشنی بکھری ہوئی تھی۔

ٹھیک اسی لمحے میں نے دوڑتے قدموں کی آوازیں سنیں' بالیقین سلطان بھائی وغیرہ انہونی آوزیں سن کر دوڑ پڑے ہوں گے۔

یہ سب کچھ چند لمحوں میں ہو چکا تھا۔ پھر' اس سے پہلے کہ میں اپنی دونوں بہنوں کو مطمئن کرتا...... ''وصی الدین...... وصی الدین۔ کی ہویا' دروازہ تے کھول......'' میرے خالو اور بھائیوں کی آوازیں میری سماعت سے ٹکرائیں۔

میں نے تشفی آمیز انداز میں دونوں بہنوں کو ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا اور آگے بڑھ کر دروازے کی چٹخنی گرا دی۔

پورا گھر جاگ چکا تھا' خالہ ماں اور خالہ زاد بہنیں بھی میرے خالو اور بھائیوں سمیت

کمرے میں داخل ہو چکے تھے اور متوحش نظروں سے کمرے کا جائزہ لے رہے تھے۔

"کچھ وی نہیں ہویا خالہ ماں......" میں مسکراتے ہوئے بولا۔ اصلیت بھی یہ تھی کہ آناً فاناً میں' نہ صرف یہ کہ نارمل ہو چکا تھا بلکہ کمرے کی ہر چیز اپنی جگہ بے حس و حرکت موجود تھی۔ "میں ڈگ پیا سی' گرتے گرتے پلنگ تھام لیا تھا اس لئے پلنگ کو تیز جھٹکا لگا اور اے دووئیں گھبرا کر اٹھ بیٹھی ہیں......"

غرضیکہ میں نے انہیں ہر طرح مطمئن کر دیا۔ میری بہنیں تو دوبارہ لحافوں میں دبک گئیں' باقی سب لوگ بھی اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے مگر' میں نے صاف محسوس کیا کہ سلطان بھائی غیر مطمئن ہو کر گئے ہیں۔



صبح سورج طلوع ہونے سے پہلے ہی بھلا کریالہ گاؤں میں کہرام سا مچ گیا۔

ابتداء نمبردار رستم سنگھ کے مکان سے ہوئی جب کہ کلپنا روتی چلاتی ہوئی باہر نکل آئی تھی۔ لوگ جیسے ہی اپنے گھروں سے گھبرائے ہوئے باہر نکلے' انہیں گلی میں منشی کی لاش' منشی کے گھر کے باہر ایک سیاہ پوش کی لاش اور اندر صحن میں دو مزید سیاہ پوشوں کی لاشیں نظر آئیں۔

پورے گاؤں پر گویا موت کا سکوت چھا گیا۔ عورتیں' مرد' بچے بوڑھے' ہندو مسلم اور سکھ عیسائی سب ہی جوق در جوق گلیوں میں جمع ہو گئے تھے۔

کلپنا اپنے بالوں پر خاک اڑاتی' روتی اور چلاتی ہوئی خالو ابا کی حویلی میں آگئی اور میری خالہ سے چمٹ کر پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی اور اپنے مقتول باپ رستم سنگھ کی لاش کا تذکرہ کرتی رہی۔ میں نے اور سلطان بھائی نے اسے لاکھ تسلیاں دیں مگر کوئی تسلی اس کے لئے کارگر ثابت نہ ہو سکی اور وہ روتے روتے بے ہوش ہو گئی۔

دوپہر کے دو بجے تک چکوال کے ایس پی سمیت پولیس کی بھاری نفری بھی پہنچ گئی اور جب لاشوں کے چہروں پر سے ان کی سیاہ پگڑیوں کے پلو جیسے ہی ہٹائے گئے تو سب سے پہلے ایس پی عبدالسلام کا چہرہ سفید پڑ گیا' کیونکہ اس کے سامنے اس کے سگے بھائی ارسلان

ی' بھلا کریالہ گاؤں کی چیک پوسٹ کے انچارج ڈیوڈ اور دو کانسٹیبلوں کی لاشیں پڑی تھیں۔

نمبردار کے سینے میں جو نیزہ پیوست تھا' وہ ارسلان کا تھا' البتہ اس کے منشی وکرم سنگھ کے جسم پر زخم کا کوئی نشان تک نہ تھا۔

گو کہ میں ساری کارروائی کے دوران عبدالسلام کے ساتھ ساتھ تھا۔ وہ بھی ہر بار مجھ سے مخاطب ہونا چاہتا تھا مگر' منہ سے کچھ کہے بغیر پھر لاشوں کے معائنے میں مصروف ہو جاتا۔

وہ یقیناً قوی اعصاب کا مالک تھا۔ اس نے اپنے آنسوؤں کو اپنی آنکھوں تک نہیں آنے دیا۔ میں نے یہی وقت مناسب سمجھ کر عبدالسلام کے زخموں پر نمک پاشی کی۔

''چوہدری صاحب' پنڈدادن خان سے جگوالی تک جو ڈاکہ زنی اغواء اور قتل کی وارداتیں ہوتی رہی ہیں' میرے خیال میں ان سب کا ذمہ دار آپ کا بھائی ارسلان ہی تھا......''

''کیا بک رہے ہو؟......'' یک بیک عبدالسلام کا پارہ چڑھ گیا۔

''لینگوئج پلیز لینگوئج' میں آپ کا ملازم یا مزارعہ نہیں ہوں......'' میرا لہجہ بھی اچانک ہی بدل گیا۔

''اوہ۔ سوری یار اسوری۔ دراصل ارسلان کی عبرتناک موت نے مجھے...... دیوانہ سا بنا دیا ہے......''

اطراف میں جتنے بھی لوگ کھڑے تھے' میری جی دارانہ باتیں سن کر ان کے چہرے فق پڑ چکے تھے۔ وہ سب ہی چوہدری نظام اور اس کے بیٹوں کے ظلم و ستم سے واقف تھے' خوفزدہ تھے اور عاجز بھی۔

قطع نظر ہر ایک کے میرے خالو ابا اور تینوں بھائی ایسے کھڑے تھے جیسے بکریوں کے ریوڑ میں شیر۔

''صرف ارسلان کی موت نے......'' میرے لہجے میں شدید طنز محسوس کر کے وہ اپنی

ہتھیلیاں ملتا رہ گیا۔

''کلپنا یتیم ہو گئی' ڈیوڈ اور دیگر لوگ قتل ہو گئے' ان کا آپ کو کوئی غم نہیں۔ سوچیں' جب کلپنا کا بھائی رندھیر سنگھ چکوال سے آئے گا اور اپنے باپ کی خون میں نت پت لاش دیکھے گا تو اس پر کیا گزرے گی؟......''

''میں' الجھ گیا ہوں وصی الدین۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ رستم سنگھ کو کس نے قتل کیا اور کیوں کیا؟......'' عبدالسلام بات کا رخ بدلتے ہوئے بولا۔

''آپ کے ساتھ آنے والے پولیس افسران بے ساختگی میں کہہ چکے ہیں کہ رستم سنگھ کے سینے میں ڈوبا ہوا نیزہ مقتول ارسلان کا ہے......''

''میں بھی کہتا ہوں کہ نیزہ ارسلان ہی کا ہے' مگر' سوال یہ اٹھتا ہے کہ ارسلان رستم سنگھ کو کیوں قتل کرے گا؟ دوم یہ کہ رستم سنگھ کا مکان منشی کے گھر سے بیس پچیس قدم دور ہے اگر ارسلان نے ہی نمبردار کو قتل کیا ہے تو پھر ارسلان کو منشی کو اور ڈیوڈ وغیرہ کو کس نے قتل کیا اور سب سے اہم یہ کہ منشی ہی کے گھر کو مقتل گاہ کیوں بنایا گیا؟......''

ہمارے درمیان گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ میری نظریں رندھیر سنگھ پر پڑیں۔ نہ جانے وہ کب سے آچکا تھا۔ اس کی ہچکیاں بندھی ہوئی تھیں سلطان لالا اسے اپنے بازوؤں میں لے کر تسلی دے رہا تھا۔

''میں دسانگا تہانوں......'' رندھیر سنگھ بھرائی ہوئی جذباتی آواز میں دھاڑا اور سلطان لالا سے الگ ہو کر ہمارے قریب پہنچ گیا۔

''میں دسانگا تہانوں ایس پی صاحب۔ گزشتہ روز ارسلان نے میری بہن کلپنا کو کنویں پر روک دیا تھا' بدتمیزی کی تھی میری بہن کے ساتھ' اغواء کر لینے کی دھمکی دی تھی اس نے' میرا ابا تے میں محض بدنامی کی وجہ سے خاموش رہ گئے تھے وہ...... وہ یقیناً رات میں میری بہن کو اغواء کرنے پہنچا ہو گا......'' رندھیر سنگھ پر ایک طرح کا جنون سا سوار ہو رہا تھا۔ ''اور یہ کتا......'' رندھیر سنگھ منشی کی لاش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دھاڑا۔ ''ملا ہوا تھا ارسلان کے ساتھ......'' اس نے جملہ مکمل کر دیا۔

''اوئے رندھیر' تم میت کی بے حرمتی کر رہے ہو' میرے بھائی پر بھی الزام لگا رہے ہو' جانتے ہو اس کا انجام......'' عبدالسلام نکتی آواز میں بولا۔ پھر' اس سے پہلے کہ رندھیر سنگھ مزید کچھ کہنا چاہتا تھا کہ میں نے ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

''آپ کو طیش میں آنے کی ضرورت نہیں ہے آفیسر۔ رندھیر سنگھ جو کچھ کہہ رہا ہے بالکل سچ ہے۔ میں خود گزشتہ شب اس کے گھر گیا تھا۔ کلپنا نے مجھے وہ سب کچھ بتلایا تھا جو آپ رندھیر سنگھ سے سن چکے ہیں۔

مقتول رستم سنگھ نے پورے وثوق سے کہا تھا کہ منشی ارسلان سے ملا ہوا ہے۔ اب آپ خود دیکھ لیں' ارسلان اور ڈیوڈ وغیرہ کی لاشیں منشی ہی کے گھر کے اندر اور باہر سے ملی ہیں۔

میرے خیال میں سوالات جوابات سے بہتر ہے کہ آپ منشی کے گھر کی تلاشی لیں مقتول رستم سنگھ کے کمرے سے نشانات وغیرہ حاصل کریں۔ کوئی نہ کوئی کلیو مل ہی جائے گا......''

وہی ہوا جو میں چاہتا تھا۔ منشی کے گھر سے نمبردار کے گھر تک سرنگ تلاش کر لی گئی۔ رستم سنگھ کی خواب گاہ سے ارسلان کے قدموں کے نشانات بھی حاصل کر لئے گئے اور نیزے کے دستے پر بھی ارسلان کی انگلیوں کے نشانات حاصل ہوئے۔

میرے الفاظ اور زوردار جملوں کا یہ اثر ہوا کہ دس بارہ عزت دار ضعیف العمر لوگ لاوے کی طرح پھٹ پڑے۔ ہر ایک نے شور مچانا شروع کر دیا کہ ان کی بیٹیوں کو اغواء کرنے' ان کی عزت لوٹنے اور انہیں قتل کرنے والے ارسلان اور اس کے ساتھی تھے اور تھانہ انچارج ڈیوڈ اور اس کے ماتحت ارسلان کی بھرپور مدد کرتے رہے تھے۔

وہ سب اپنی زبانیں اس لئے بند رکھے ہوئے تھے کہ انہیں اپنی دوسری بیٹیوں اور جوان بیٹوں کی عزت و زندگی پیاری تھی' چوہدری نظام اس کے بیٹوں کے ظلم و اثر رسوخ کا خوف تھا۔

غرضیکہ ایسے ایسے رازہائے سربستہ کھلے کہ چودھری عبدالسلام دم دبا کر پولیس

فورس اور لاشوں سمیت بھاگ نکلا۔ صرف نمبردار رستم سنگھ ہی کی لاش چھوڑ دی گئی۔ اس لئے کہ رندھیر سنگھ نے پوسٹ مارٹم کروانے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ میں نے اور سارے گاؤں والوں نے اس کی بھرپور حمایت بھی کی تھی۔

بقیہ پورا دن اور نصف رات رستم سنگھ کی آخری رسومات کی نذر ہو گئے۔ کلپنا' خالو کے گھر پر ہی رہی اور میں رندھیر سنگھ کے ساتھ اس کے گھر پر رہا۔

اس رات کوئی قابل ذکر واقعہ بھی رونما نہیں ہوا بلکہ مزید تین دن اور راتیں خیر و عافیت گزر گئیں۔ لوگوں کا خوف بھی بڑی حد تک ختم ہو گیا تھا اور لوگ مغرب سے تھوڑی دیر پہلے کام کاج سے فارغ ہو کر گاؤں میں جگہ جگہ آگ کے الاؤ سلگا کر خوش گپیوں میں مصروف ہونا شروع ہو گئے۔ ان کے درمیان اب کھلے بندھوں چوہدری نظام کے تذکرے ہونے لگے تھے۔

چوتھے روز صبح کے ناشتے سے فارغ ہو کر جب ہم بیٹھک میں جمع ہوئے تو......

"خالو ابا' میں آج اپنے گاؤں جانا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ حویلی کو صاف ستھرا کرواؤں' جو حصے مرمت طلب ہیں ان کی مرمت کرواؤں اس کے بعد اپنی بہنوں کو ساتھ لے جاؤں گا......" میرے انکشاف پر گاؤں کے چند معززین کے چہرے لٹک گئے تھے۔ میرا وجود ان کی نظروں میں کچھ اس قدر اہمیت اختیار کر گیا تھا کہ وہ غمزدہ ہو گئے تھے۔

"آہو پترا' شوق سے جاؤ' سلطان کو بھی ساتھ لے جاؤ اور اپنے باپ دادا کی حویلی کو بارونق بنا دو۔ پر پترا' دشمنوں سے ہوشیار رہنا۔ چوہدری نظام اور اس کے بیٹے تیرے خون کے پیاسے ہو گئے ہوں گے......" خالو ابا پوری چاہت سے بولے۔

"سلطان لالا کا فی الحال میرے ساتھ جانا مناسب نہیں ہے خالو ابا اگر میں نے ضرورت محسوس کی تو ضرور لالا کو بلوا لوں گا......"

میری رائے سے کسی نے بھی اختلاف نہیں کیا۔ اس لئے بھی کہ ان کی نظروں میں میں ایک بہت بڑا اور ذہین آفیسر تھا۔

جو کچھ بھی تھا' میں بہنوں بھائیوں سے رخصت حاصل کرنے کے بعد' ضرورت کا

سامان جیپ میں لاد کر صبح دس بجے بھلا کریالہ گاؤں سے روانہ ہو گیا۔ جیپ میرے خالو ہی کی تھی۔ میری جیپ جہاں سے بھی گزری' لوگ مجھے سلام کرتے' مجھے دعاؤں سے نوازتے رہے۔

چیک پوسٹ پر ڈیوڈ کی جگہ کوئی دوسرا انچارج آگیا تھا۔ نفری میں بھی کچھ اضافہ ہو چکا تھا۔ مجھے بہت سے پولیس والوں نے دیکھا مگر روکنے کی حماقت نہیں کی ورنہ ہر آنے جانے والی سواری کا اندراج کیا جاتا' وقت روانگی اور آمد کا وقت وغیرہ درج رجسٹر کیا جاتا تھا۔

مین راستے پر پہنچ کر میں نے جیپ کی رفتار بڑھا دی۔ سورج اپنی پوری آب و تاب سے چمک رہا تا۔ سردی تھی' بہت ہی شدید مگر دھوپ اور خشک موسم ہونے کی وجہ سے سردی میں بڑی حد تک فرق آچکا تھا۔

بیل گاڑیوں' گھوڑے سواروں اور پیدل جانے آنے والوں کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ ہزاروں پرندے فضاؤں میں تیر رہے تھے۔ چونکہ ہوا کے جھکڑ چل رہے تھے اس لئے لہلہاتے ہوئے کھیت اور ہرے بھرے درخت آنکھوں میں سرور سا طاری کئے ہوئے تھے۔

ابھی میں نے تھوڑا ہی فاصلہ طے کیا تھا کہ اچانک میرے وجود کو ایک ہلکا سا جھٹکا لگا اور گنزا کا سدا بہار سراپا نمودار ہو گیا۔ ''السلام علیکم چغتائی صاحب......'' وہ ادائے جاناں سے لکھنوی انداز میں بولی۔

وہ اب بھی بھڑکدار لباس زیب تن کئے ہوئے تھی۔ اس کی جسامت چھ انچ سے نکلتی ہوئی تھی۔

''وعلیکم السلام جان من۔ کیسی ہو؟......'' میں نے شرارت بھرے لہجے میں کہا۔

''دیکھ لیں' جیسی تھی ویسی ہی ہوں۔ آپ کی پہلی عظیم کامیابی پر آپ کو مبارک باد کہنے آئی ہوں......''

''شکریہ گنزا۔ ویسے یہ سب کچھ تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم

میرے قریب پوری جسامت سے آن بیٹھو......"

"نہیں صاحب جی۔ میں نہیں چاہتی کہ کوئی راہ گزر مجھے آپ کے ساتھ بیٹھا ہوا دیکھ لے....."

"کوئی راہ گزر تمہیں تب دیکھ سکتا ہے جب تم چاہو......"

"آپ غلط سمجھے صاحب جی۔ راہ گزر سے مراد صرف انسان ہی نہیں ہیں۔ آپ نہیں جانتے جو کچھ میں جانتی ہوں۔ بمشکل دس منٹ بعد آپ کے کھرپال گاؤں کے قریب سے گزریں گے' اس کے بعد کنگر گاؤں کی حد شروع ہوگی اور وہیں سے ڈھوک ٹالیاں کی بدروحوں اور شریر جنات کی حد بھی شروع ہو جائے گی۔ میں آپ کے جسم سے نکل کر انسانی نظروں سے تو خود کو محفوظ رکھ سکتی ہوں مگر بدروحوں چڑیلوں اور جنات سے نہیں رکھ سکتی۔

آپ کھرپال اور کنگر گاؤں کی آبادی میں داخل نہیں ہوں گے بلکہ ڈھوک ٹالیاں کی جانب بڑھتے رہئے گا یہ مت سمجھئے گا کہ دن ہے اور آپ بدروحوں کو چکمہ دے کر نکل جائیں گے۔ آپ کا آئندہ کا ہر ہر لمحہ نازک ہے' ہوش سے کام لیجئے گا۔ خدا حافظ......" مجھ سے کچھ بھی سنے بغیر گنزا میری نظروں سے غائب ہوگئی۔

چالیس منٹ بعد میں کنگر گاؤں کے کھیتوں اور کھلیانوں پر اچٹتی سی نظر ڈالتا ہوا ڈھوک ٹالیاں کی طرف بڑھتا رہا۔ نیم گنجان اور لمبے درختوں کا دو طرفہ سلسلہ شروع ہو گیا۔

گزرگاہ پر اب کوئی پیدل چلنے والا انسان نظر نہیں آیا۔ کبھی کبھار کوئی تانگہ یا بیل گاڑی نظر آ جاتے۔ میری جیپ جونہی ان کے قریب سے گزرتی' سادہ لوح دیہاتی ہاتھ اٹھا اٹھا کر مجھے سلام کرتے اور میں مسکرا مسکرا کر ان کے سلام کا جواب دیتا رہتا۔

مزید پندرہ منٹ کی تیز رفتاری کے بعد مجھے جیپ کی رفتار گھٹانی پڑی۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ میں نے بائیں جانب یعنی مشرقی سمت دور ہی سے دو خواتین کو راہ گزر سے چند فٹ نیچے کچے میں ایک بڑے سے پتھر پر بیٹھے دیکھ لیا تھا۔

پھر جوں جوں میری جیپ ان سے قریب ہوتی گئی' دونوں عورتوں کی جسامت بھی واضح ہوتی گئی۔ ایک عورت تو ادھیڑ عمر ہی تھی جب کہ دوسری جوان تھی۔

"کتھے جاڑاں اے تہاں نوں ماں جی ؟......" میں نے ان کے قریب جیپ روکتے ہوئے پوچھا۔

"چلی جاؤں گی پترا' تیری وڈی مہربانی......" بڑھیا نے شفقت بھرا لہجہ استعمال کیا مگر اس کے لہجے میں دلی ہوئی خرخراہٹ مجھ سے پوشیدہ نہ رہ سکی میں محتاط ہو گیا۔

میرے محتاط ہونے کی دوسری وجہ جوان لڑکی تھی۔ میں نے صاف محسوس کیا کہ وہ مسلسل مجھے تک رہی ہے' اس کی پلک تک نہیں جھپکتی اور بار بار اس کی زبان منہ سے نکلتی اور منہ ہی میں غائب ہو جاتی۔

گزرگاہ کے دائیں بائیں بالکل سناٹا تھا۔ تیز ہواؤں کے جھکڑ سے چل رہے تھے۔ کانٹے دار جھاڑیاں اور چھوٹے بڑے نیم کے ہرے درخت کسی بیوہ کے اجڑے ہوئے بالوں کی طرح جھوم رہے تھے۔

چونکہ میں نے انجن بند نہیں کیا تھا اس لئے اچانک ہی ایکسیلیٹر پر پیر کا دباؤ بڑھا دیا۔ میری جیپ کمان سے نکلے ہوئے تیر کی طرح بڑھی۔ گرد کا بہت بڑا مرغولہ بھی اٹھا تھا' اسی کے ساتھ میں نے بڑھیا کی آواز بھی سنی۔

"کتھے نسدا جانائیں چھوکرے' کڑی نوں تے لے جا......"

میرے لبوں پر از خود مسکراہٹ کی سفاک ترین لکیر کھنچ گئی۔

"بہت اچھے صاحب جی......" میرے ہی لبوں سے گنزا کی آواز نکلی۔ "بہت اچھا ہوا بڑھیا کی بات نہ مانی آپ نے۔ بڑھیا اصل میں چڑیل ہے اور اس کی حدو ہیں تک ہے جہاں وہ بیٹھی تھی......"

"پیاری گنزا....." میرے لبوں سے جیسے ہی گنزا کی آوز معدوم ہوئی میں فوراً بول اٹھا۔

"مجھے میری بہوؤں کی بڑی فکر ہے' گزشتہ شب ان پر اٹیک ہو چکا ہے......"

''کوئی فکر نہ کریں صاحب جی......'' میرے ہی لبوں سے گنزا کی آواز نکلی اور میں غریقِ حیرت ہوتا گیا کیونکہ اس سے پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔

''شرجیل کو' افراہیم اور دیجور کو تو آپ جانتے ہی ہیں۔ دیجور وہ جس نے ایئرپورٹ پر آپ کے لئے شیور لیٹ کار کا انتظام کیا تھا۔ افراہیم نے کوچوان بن کر آپ کو اسٹیشن پہنچایا تھا اور شرجیل وہ جو قلی کے روپ میں تھا۔

بڑی طاقت کے حکم سے شرجیل آپ کے خالو کے گھر پہنچ چکا ہے۔ دیجور اور افراہیم سے بہت جلد آپ کی ملاقات ہو گی۔ اس کے علاوہ ایک جنی یعنی صابرہ بھی انسانی روپ میں آپ کی بہوں سے ملنے والی ہے۔ آپ کو بتلا دوں کہ آپ کی بہوں پر عفریت بچے کے باپ نے حملہ کیا تھا۔ اگر آپ سے ذرا سی چوک ہو جاتی تو وہ فوزیہ کے وجود میں داخل ہو جاتا۔

بہر حال' ہوشیار ہو جائیں۔ بڑھیا کے ساتھ والی لڑکی ناگن تھی اور وہ آپ کو مٹانے کی پوری کوشش کرے گی اس لئے کہ آپ نے ٹرین میں اس کے شوہر کو مار ڈالا تھا......''

فی الفور میں نے منہ بند کر دیا اور جیسے ہی مڑ کر دیکھا' میری جیپ سے کچھ فاصلے پر ایک لمبی سی ناگن بہت تیزی سے رینگتی ہوئی میرا تعاقب کر رہی ہے......



ڈھوک ٹالیاں آ گیا۔ میں نے جیپ کی رفتار اس لئے بھی ہلکی کر دی تھی کہ ناگن جیپ کے تعاقب میں نہ تھی۔ ہو سکتا ہے کسی مناسب وقت کے انتظار میں وہ ادھر ادھر ہو گئی ہو۔ ظاہر ہے' گزرگاہ سے صرف چند قدموں کے فاصلے پر سینکڑوں عورتیں مرد اور بچے کھیتوں میں کام کر رہے تھے۔ اکثر میری جیپ کی طرف متوجہ ہو گئے تھے اور کافی بچے اونی سوئٹروں میں ملبوس گزرگاہ پر مختلف کھیلوں میں مصروف تھے' ایسے میں ناگن کو کون زندہ چھوڑتا۔

جو کچھ بھی تھا' میں نے جیپ کو مخصوص زاویے پر گھما کر گاؤں کے اندرونی حصے میں

جانے والی گزرگاہ پر ڈال دیا۔ سامنے سے پکی اینٹوں کی بنی ہوئی پولیس چیک پوسٹ تھی۔ چند ڈنڈے بردار پولیس مین دھوپ میں کرسیاں ڈالے بیٹھے ہوئے دھوپ سینک رہے تھے۔ میری جیپ کی آواز پر متوجہ ہو گئے اور میری وضع قطع دیکھ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

"سلام صاحب جی......" ایک کانسٹیبل قریب پہنچ گیا۔ میں نے جیپ روک دی تھی۔

"سلام بھئی' کون ہے انچارج آپ لوگوں کا؟......"

"سر۔ گورا ہے' البرٹ ہیکل نام ہے اس کا......" کانسٹیبل نے مؤدبانہ جواب دیا۔ اس دوران بقیہ تین کانسٹیبل بھی قریب پہنچ گئے تھے۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے ان کے سلام کا جواب دے دیا۔

"ہوں۔ کہاں ہے وہ؟......" میں نے ہنکارتے ہوئے پوچھا۔

"اوپر کمرے میں ہے۔ چوہدری نظام نے ان کے لئے لنچ بھجا تھا۔ شاید کھانے میں مصروف ہو......"

"کون لایا تھا لنچ؟......"

"وہ......وہ صاحب کوئی جوان سی عورت ہے......"

"ہوں۔ کیا وہ چلی گئی؟......"

"نہیں سر......" مخاطب اپنے ساتھیوں کو عجیب سی نظروں سے تکتے ہوئے بولا۔ "جو عورت بھی لنچ لاتی ہے وہ چار پانچ بجے سے پہلے جا ہی نہیں سکتی......"

میں کانسٹیبل کی پراسرار گفتگو کا مطلب سمجھ چکا تھا مگر' ان سنی اس لئے کر گیا کہ جب قوم کے بڑے ہی بے غیرت ہوں تو احتجاج کون کر سکتا ہے۔

"مجھ سے کیا پوچھنا ہے؟......" میں مقصد پر آگیا۔

"یہی کہ آپ کون ہیں' کہاں سے آئے اور کیوں آئے ہیں اور یہ کہ گاؤں میں کس سے ملنا ہے' قیام کتنا ہو گا آپ کا؟......"

میں نے پوری تفصیل بتا دی۔ محرر نے کتابچے پر لکھ کر میرے دستخط بھی لے لئے لیکن مجھے یقین تھا کہ محرر اپنی لکھائی خود بھی نہیں پڑھ سکے گا۔

مزید وقت ضائع کئے بغیر میں کھیتوں کے درمیان جیپ دوڑاتا گرد و غبار کے بادل اڑاتا ہوا اپنے پھوپھا ریشم خان کی حویلی تک پہنچ گیا۔ میرے پھوپھازاد بھائی علاؤالدین اور امیر جان بیٹھک ہی میں موجود تھے اور چند دیگر لوگ لنچ لینے میں مصروف تھے۔



شام پانچ بجے تک ڈھوک ٹالیاں کے تقریباً ہر شخص کو میری آمد کی اطلاع ہو گئی۔ لوگ پوری محبت و شفقت سے مجھ سے ملتے رہے اگر میں یہ کہہ دوں کہ میری آمد سے ڈھوک ٹالیاں کی رونقیں لوٹ آئی تھیں تو بے جا نہ ہو گا۔

چونکہ بھلا کریالہ کے واقعات چودہ سیدن شاہ تک پھیل چکے تھے اس لئے ہر شخص میرے نام سے نہ سہی میرے کام سے واقف ہو چکا تھا۔

"میری پھوپھی تو مجھ پر واری گھوری ہو رہی تھیں کیونکہ میری شکل' قد کاٹھ میرے دادا کی ٹرو کاپی تھا۔

قارئین کرام' میں نے بچھڑوں کے ملاپ کے مناظر محض اس لئے خذف کر دیئے ہیں کہ آتشی تخلوق طویل نہ ہونے پائے۔ اس کے لئے میں قارئین سے معذرت خواہ ہوں (ایم۔ ایس قادری)

شام پانچ بجے اس لئے ملاقاتوں کا سلسلہ موقوف ہوا کہ ڈھوک کا تھانہ انچارج چار کانسٹیبلوں سمیت پہنچ گیا تھا۔ اس کی جیپ عین بیٹھک کے دروازے پر پہنچ کر رک گئی تھی۔

وہ دراز قد قوی ہیکل تھا۔ سرخ و سفید بھی تھا اور بہترین تراش کی وردی میں ملبوس تھا۔ اس کے چہرے پر غرور و خشونت سوار تھی۔ لیکن' وہ جیسے ہی بیٹھک میں داخل ہوا' مجھ پر نظریں پڑتے ہی اس کے چہرے کی خشونت غائب ہو گئی۔ مجھ سمیت میرے پھوپھا ریشم خان اور دونوں علاؤالدین و امیر جان اخلاقاً اٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ دیہاتی لباسوں میں تھے اور میں فل جنٹلمین بنا ہوا تھا۔

''آپ مسٹر وصی الدین ؟.....'' وہ میری طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔ زبان خالص برطانوی تھی۔

''یس آفیسر اور میرے خیال سے آپ البرٹ ہیکل ہیں......'' میں نے خوش دلی کا مظاہرہ کیا۔

رسمی سی علیک سلیک کے بعد میں نے ہی گفتگو آگے بڑھائی۔

''کیسے آنا ہوا مسٹر البرٹ ؟......''

''صرف آپ سے ملاقات کرنے......'' وہ جھینپتی آواز میں بولا۔

''شکریہ مسٹر البرٹ' میرا آئڈنٹی کارڈ......'' کہتے ہوئے میں نے وہ کارڈ جیب سے نکالا جسے اب تک محفوظ رکھا تھا۔ اب بھی ظاہر نہ کرتا اگر میرے سامنے کوئی غیر ملکی آفیسر نہ ہوتا۔

میرے کارڈ کو پڑھتے ہی البرٹ ہیکل کے چہرے پر ہوائیاں سی اڑنے لگیں وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا اور فوجی انداز میں مجھے سیلوٹ کیا۔

''او کے او کے مسٹر البرٹ' آپ تشریف رکھیں......'' میں نے البرٹ کے کندھے پر ہاتھ جما کر اسے بیٹھنے کو کہا۔

''مسٹر البرٹ چووہ سیدن سے چکوال تک چوہدری نظام اور اس کے بیٹوں کے ظلم کی داستانیں گونج رہی ہیں۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ جنوبی ایشیاء میں آزادی کی تحریکیں زور پکڑتی جا رہی ہیں۔ کوئی ایسا کام نہ کرنا کہ یہاں وہاں کے لوگ تمہیں گھسیٹ کر ماریں......''

میں نے البرٹ سے اور بھی بہت کچھ کہا۔ ایک انگریز پولیس افسر کو میرے سامنے بھیگی بلی بنے دیکھ کر میرے عزیزوں کے سر تو فخر سے بلند ہوئے ہی تھے گاؤں والوں میں بھی اعتماد کی فضا دوڑ گئی۔

البرٹ چلا گیا۔ اندھیرا بڑھتا رہا' بیٹھک میں پیٹرومیکس لیمپ روشن کر دیا گیا تھا۔ جیسا کہ سردی بہت بڑھ چکی تھی اس لئے لوگوں کی اکثریت اپنے اپنے گھروں کو چل دی

تھی۔

کچھ دیر کے بعد ہم بھی حویلی کے اندرونی حصے کی طرف بڑھ گئے میری پھوپھی نے اپنی تینوں ملازماؤں کے ساتھ مل کر میرے لئے عمدہ قسم کی ڈشیں تیار کرلی تھیں۔

گو کہ میرا فوراً روانہ ہو جانے کا ارادہ تھا مگر میرے عزیزوں کے بے حد اصرار پر مجھے ٹھہرنا پڑ گیا۔

آٹھ بڑے اور سجے سجائے کمروں میں فانوس روشن کر دیئے گئے تھے۔ شب کے نو بجے تک ہم کھانے وغیرہ سے فارغ ہو گئے۔ مجھے پھوپھا ریشم خان اور ان کے دونوں بیٹوں سے ٹالیاں کے جنگل پنڈت دھیراج اگھوری اور دیگر خوفناک کارروائیوں کے متعلق بہت کچھ معلومات حاصل ہوئیں۔

میں نے جب انہیں ٹرین میں اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعات بتلائے تو وہ بھونچکاں رہ گئے اور مجھے پنڈت دھیراج سے دور رہنے کی تاکید کی گئی۔

دوران گفتگو مجھے یہ بھی پتہ چلا کہ پنڈت دھیراج ہر پیر کو گاؤں میں آتا ہے اور منگل والے دن چلا جاتا ہے۔ گاؤں کے جنوب کی طرف تالاب کے کنارے اس کا ڈیرہ ہے' وہ برگد کے بوڑھے درخت کے سائے میں سورج ڈھلے تک اپنی چوکی پر بیٹھا رہتا ہے۔ کیا عورتیں کیا مرد' اس کے گرد عقیدت مندوں کا جم غفیر رہتا ہے۔ ان میں ہندو سکھ عیسائی اور خانہ بدوشوں کی اکثریت ہوتی ہے۔ مسلمان بھی ہوتے ہیں اور جو اس کی مخالفت کرتا ہے' اس پر پاگل پن کے دورے پڑتے ہیں' بالآخر وہ ہلاک ہو جاتا ہے۔ دوسری اہم اطلاع یہ تھی کہ پنڈت دھیراج جس گاؤں میں جاتا ہے' وہاں سے دو تین صحت مند بچے ضرور غائب ہو جاتے ہیں اور پھر ان کا کوئی پتہ نہیں چلتا۔

غرضیکہ معلومات کا بہت بڑا ذخیرہ لئے شب کے گیارہ بجے تک میں اپنے کمرے میں داخل ہو گیا۔ دروازے کے چٹخنی لگا کر میں جیسے ہی گھوما' لیمپ ٹیبل کے ساتھ کھڑی ہوئی جواں سالہ لڑکی کو کھڑے پا کر میرا ذہن بھک سے اڑ گیا لیکن صرف ایک لمحہ کے لئے' دوسرے لمحے میں نہ صرف نارمل ہو گیا بلکہ فوراً ہی اپنے کندھے سے لپٹا ہوا کوڑا ہاتھ میں

نے کھینچ لیا۔

وہ زیادہ خوبصورت تو نہ تھی' تاہم سینکڑوں میں ایک تھی۔ اس کے سر کے بال گھنے' کھلے ہوئے اور کافی نیچے تک جھولتے ہوئے تھے۔ اس کے چہرے کے نقوش اس قدر پرکشش تھے کہ اس کے وصال کی خواہش ٹھاٹھیں مارنے لگی۔

اس کے جسم پر صرف چست ریشمی پاجامہ اور چست ہاف آستین اسکرٹ تھا۔ وہ گردن سے پیروں تک زیورات سے لدی پھندی تھی اور اس قدر آتشی جسم رکھتی تھی کہ میں نے اپنے پورے وجود میں چیونٹیاں سی رینگتی محسوس کیں۔ اس کی بڑی بڑی کجلے دار آنکھیں مجھ پر ہی جمی ہوئی تھیں۔ "کون ہو تم' کیا چاہتی ہو؟......" میں نے سرگوشیانہ انداز اختیار کر لیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میری آواز مکینوں تک پہنچے۔

"انسان نہیں ہوں۔ انسان ہوتی تو برف کی طرح اکڑ گئی ہوتی۔ میں وہی ہوں جو تمہاری جیپ کا تعاقب کر رہی تھی......"

"آہم......" میں ہنکارا...... "کیا چاہتی ہو تم؟......"

"انتقام...... میں نے تمہاری ساری گفتگو سن لی ہے' اس کی صداقت کا یقین ہو جانے کے بعد میں تمہاری غلام بن جاؤں گی۔ اگر تمہاری کہانی جھوٹ ثابت ہوئی تو دنیا کی کوئی طاقت تمہیں میرے بدلے سے نہیں بچا سکے گی......"

حقیقتاً دوشیزہ کی آواز میں ایک خونخوار ناگن کی سی پھنکار تھی۔

"کیا نام ہے تمہارا؟......" میں نے شانے اچکاتے ہوئے پوچھا۔

"ناگن۔ ویسے تم جو چاہو تو مجھے کوئی نام دے سکتے ہو......"

"میں...... میں تمہیں سلیمہ نام دیتا ہوں۔ یہ میری آپا کا نام ہے جس کی اذیتناک موت کا انتقام لینے آیا ہوں۔ سنو سلیمہ' تمہارے ناگ کو میں نے ہی گولی ماری تھی' صرف اس لئے کہ وہ مجھے ڈسنے آیا تھا' پنڈت دھیراج اگھوری کے حکم سے۔ تم میری بے گناہی جاننا چاہتی ہو ناں...... تو پھر ایک دو گھنٹے مزید انتظار کرو۔ پنڈت دھیراج اسی گاؤں میں اپنے ڈیرے پر پہنچ گیا ہوگا۔ آج پیر ہے اور میں اس کے ڈیرے پر جاؤں گا۔ اپنی آنکھوں سے

دیکھ لینا' اپنے کانوں سے سن لینا۔

اس کے بعد بھی تمہیں یقین نہ آئے تو اس خیال خام میں مت رہنا کہ تم مجھے ڈس لو گی۔ میرے ایمان کی پختگی کا تم نے غلط اندازہ لگایا ہے۔ مارنے والے سے بچانے والا بہت ہی زبردست ہے......" میرے الفاظ ختم ہو گئے اور ناگن یعنی سلیمہ کسی مومی مجسمے کی طرح پگھلتی ہوئی اپنے اصلی روپ میں آ گئی۔

وہ ناگن بن چکی تھی اور میرے دیکھتے ہی دیکھتے رینگتی ہوئی الماری کے ذیلی خلاء میں داخل ہو گئی۔ میں بالکل مطمئن تھا۔ میرے دل و دماغ پر کوئی خوف نہ تھا' کوئی پریشانی نہ تھی۔ میں نے کوڑا لپیٹ لیا اور ہیٹ سر سے اتار کر اپنے بستر پر دراز ہو گیا۔ میں نے اوور کوٹ اور اس کے نیچے پہنا ہوا دبیز اونی سوئٹر نہیں اتارا تھا۔ اس لئے کہ میں اپنے لائحہ عمل کا جائزہ لے کر اپنے مشن پر روانہ ہونے والا تھا۔

نہ جانے کتنی دیر تک میں آنکھیں بند کئے پڑا رہا اور جب مجھے یقین ہو گیا کہ میرا پلان جامع ہے تو میں نے آنکھیں کھول دیں' رسٹ واچ میں وقت دیکھا۔ شب کے سوا بارہ بج رہے تھے۔

میں آہستگی سے اٹھا اور فانوس کی روشنی ایک دم سے مدھم کر دی اور ہر ممکن احتیاط سے دبے قدموں دروازے سے نکل گیا۔ تاریک ترین برآمدے میں دبے قدموں چلتے ہوئے میں ٹھٹک کر رک گیا۔ رکنے کی وجہ یہ تھی کہ میری چھٹی حس کسی دوسرے وجود کی موجودگی کا احساس دلا رہی تھی۔ میں فوراً ہی گھوما مگر اندھیرے میں ابدی سکوت کے علاوہ مجھے کچھ بھی محسوس نہیں ہوا۔ میں لاپرواہی سے سر جھٹک کر برآمدہ عبور کر کے اس ٹرک کی طرف بڑھ گیا جو صحن میں دیوار کے قریب پارک کیا ہوا تھا۔

زمین سے آسمان تک ایک محسوساتی سکوت چھایا ہوا تھا۔ چاند کی بالکل آخری تاریخیں ہونے کی وجہ سے اس قدر تاریکی مسلط تھی کہ میں خود کو بھی محض ایک سایہ سمجھنے لگا۔ حشرات الارض کی آوازیں ہی احساس دلا رہی تھیں کہ میں زندوں کی آبادی میں ہوں۔

پانچویں منٹ پر میں ٹرک پر چڑھ کر حد بندی دیوار پھلانگ کر کھلی مگر ہولناک

فضاؤں میں پہنچ چکا تھا۔ میں نے وہ رسہ بھی لٹکتا چھوڑ دیا جس کا دوسرا سرا ٹرک سے بندھا
موسم بہت ہی سرد اور خشک تھا۔ سر سے پیروں تک دبیز گرم لباس میں ملبوس ہونے
کے باوجود میرا جسم کپکپا رہا تھا' دانتوں سے دانت ٹکرا رہے تھے۔

پھر' میں نے جنوبی سمت بڑھنا شروع کر دیا۔ چونکہ بچپن ہی سے یہ گاؤں میرا دیکھا بھالا تھا میں یہ بھی جانتا تھا کہ تالاب کہاں اور کتنے فاصلے پر ہے' اس لئے مجھے کسی رہبر کی ضرورت نہ تھی۔

پانچویں منٹ پر ہی میں کچے پکے مکانات سے نکل کر نیم میدانی حصے میں پہنچ گیا۔ یہ وہ میدان تھا جہاں گاؤں کے بچے اور جوان والی بال اور کبڈی سمیت مختلف کھیل کھیلتے تھے۔

میدانی حصے میں سردی مزید شدت اختیار کر گئی تھی۔ احتیاطاً میں نے کوڑا ہاتھ میں پکڑ لیا تھا۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ مجھے کسی دوسرے ان دیکھے وجود کی موجودگی کا احساس کچوکے سے لگا رہا تھا۔

ابھی میں نے نصف فاصلہ ہی عبور کیا تھا کہ زمین پر دھماکے سے محسوس کر کے میں ٹھٹک کر رک گیا۔

ہوا میں تیزی نہ تھی تاہم ہوا چل رہی تھی اور چمگادڑوں کے غوطے جاری تھے۔

دھماکوں کی آواز ایسی ہی تھی جیسے کوئی بھاری بھر کم وجود دوڑ رہا ہو۔ میں پھرکی کی طرح گھوما اور یہ دیکھ کر میرے لہو میں انگارے سے دوڑ گئے کہ ایک انسانی سایہ دوڑتے ہوئے میرے قریب ہو رہا تھا۔ قریب' اور قریب اور پھر' اس قدر قریب کہ میں اسے پہچان گیا۔ وہ علاؤالدین تھا۔ میرا ہم عمر پھوپھی زاد بھائی علاؤالدین۔

''اوھر اتوتے تھکادتا ہے میں نوں......'' قریب پہنچ کر وہ ہانپتی آواز میں بولا۔

میرا ماتھا ٹھنکا' اس لئے کہ وہ صرف ریشمی کپڑے کی تہمد اور کرتا پہنے تھا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ گوشت پوست رکھنے والا کوئی انسان اس کچوکے ڈالتی سردی میں صرف کرتا اور تہمد پہنے جب کہ میں گرم اور دبیز کپڑوں میں بھی کانپ رہا تھا۔

شبہ یقین میں بدلتے ہی میں نے کوڑے کی لمبی زبان زمین پر چھوڑ دی تھی اور قبضے پر

گرفت مضبوط کردی تھی۔

"کی ضرورت سی میرے پیچھے آوُن دی ؟......" جملہ مکمل ہونے تک میں نہ صرف ایک دم پیچھے ہٹ گیا تھا بلکہ بجلی کی سی تیزی سے کوڑا بھی لہرا دیا۔ شپاک کی آواز سے آگ کی مانند سلگتا ہوا کوڑا علاؤالدین کی پیٹھ پر پڑا۔ پڑا ہی تھا کہ علاؤالدین کے لبوں سے نکلنے والی چیخ نے ویران میدان کو ہیبت ناک بنا کر رکھ دیا۔ وہ ماہیٔ بے آپ کی طرح تڑپ کر دونوں ہاتھوں سے اپنی کمر تھام کر گھوما اور جب اس کا رخ میری طرف ہوا تو میرے لبوں پر کشت و خون سے بھرپور مسکراہٹ عود کر آئی۔

وہ کولتار کی طرح سیاہ رنگت والا کوئی عفریت تھا۔ اس کی سیاہ رنگت کولتار ہی کی طرح چمکدار تھی۔ اس کے نتھنے سور کے نتھنوں سے مختلف نہ تھے اور آنکھیں انگاروں کی طرح دہکتی ہوئی تھیں۔ وہ بہت ہی موٹا تھا اور اس کا قد دس فٹ سے بھی نکل گیا تھا۔ ایک لمحے کی تاخیر کے بغیر میں نے اس پر دوسرا وار کیا۔ گو کہ وہ مجھے اپنی بانہوں میں دبوچنے کی پوری کوشش کرنے لگا تھا مگر میں حیرت انگیز طور پر چھلاوہ بنا ہوا تھا۔ زاویے بدل بدل کر اس پر کوڑے برساتا رہا۔ میرے کوڑے کی ضرب اس کے جسم پر جہاں بھی پڑتی وہاں سے آتش فشاں کے سرخ لاوے کی طرح سیال سا نکل نکل کر زمین پر گرتا رہا۔

بالآخر وہ دسویں کوڑے کی ضرب پر دھب سے زمین پر گر پڑا۔ اس کے بھیانک ترین منہ سے نکلنے والی مسلسل چیخیں ہر طرف سے گونجتی ہوئی محسوس ہوئیں۔

زمین پر گرنے کے بعد وہ بسمل کی طرح تڑپنے لگا۔ اس کے پیر جہاں بھی پڑتے' زمین میں گڑھے سے پڑ جاتے۔ دو ہی منٹ گزرنے پائے تھے کہ اس کا سیاہ ترین جسم یک بیک آگ کا الاؤ بن گیا اور یہ الاؤ اس تیزی سے ابھر کر تاریک فضاء میں بلند ہوتا چلا گیا کہ میں گنگ ہو کر رہ گیا۔

پھر' سینکڑوں فٹ کی بلندی پر پہنچنے کے بعد وہ حرف غلط کی طرح مٹ گیا۔ بے ساختہ میرے لبوں سے اطمینان کی سانس نکل گئی اور میں تیزی سے تالاب کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

مزید دو تین منٹ بعد میں تالاب کے قریب بنے ہوئے بڑے سے جھونپڑے کے قریب پہنچ گیا۔

تالاب کی جانب سے مینڈکوں کے ٹرٹرانے کی آوازیں ماحول پر اک خوف سا طاری کیئے ہوئے تھیں۔ یہاں چمگادڑوں کی تعداد کچھ زیادہ ہی تھی۔ جھونپڑے کی دیوار سے قریب ہو کر میں نے چند لمحے اندرونی سن گن لی۔ مکمل سکوت طاری تھا۔ ویسے صاف محسوس ہوا کہ اندرونی جانب کچھ نہ کچھ روشنی ہے۔

ہر طرح کا اطمینان کر لینے کے بعد میں گھوم کر دروازے کے قریب پہنچ گیا۔ دروازے کے کواڑ نہیں تھے بلکہ کسی موٹے ٹاٹ کا پردہ پڑا ہوا تھا۔ پردہ اس قدر وزنی تھا کہ ہوا کے ہلکے جھکڑ اسے ہلانے میں ناکام لگ رہے تھے۔

میں نے اطراف کا بغور جائزہ لینے کے بعد آہستگی سے پردہ ذرا سا ہٹایا اور اندرونی جائزہ لیا۔

سامنے انگیٹھی کی دوسری سمت وہی ٹرین والا مد قوق' مکروہ صورت غلیظ بوڑھا ننگا جسم آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ یقیناً وہ گیان دھیان کی دنیا میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس کے گلے میں موٹے دانوں کی مالا پڑی تھی اور وہ اپنی دونوں کہنیاں اپنے گھٹنوں سے ٹکائے بیٹھا تھا۔ اس کے دائیں بائیں چار موٹے موٹے آدمی بوریوں کے لحاف اوڑھے سوئے ہوئے تھے۔

''آجاؤ نوجوان باہر بہت سردی ہے...... '' غلیظ بوڑھے کی آواز گونج اٹھی اور میرا دل ایک لمحہ کے لئے اچھل کر میرے حلق میں آ اٹکا۔ ''چوکی پر بیٹھ جاؤ نوجوان...... '' وہ بدستور آنکھیں بند کیئے ہوئے تھا' اس کے چاروں چیلے بے خبر سوئے ہوئے تھے یا پھر یہ کہ سونے کی ایکٹنگ کیئے ہوئے تھے۔

میں' غلیظ پنڈت کے تیسرے بلاوے پر پردہ ہٹا کر اندر داخل ہو گیا تھا۔

''تم نے مجھے اپنے ڈبے سے ذلیل کر کے نکالا تھا مگر میں نے تمہیں عزت دے کر اندر بلایا ہے......''

میں بے خوف سا ہو کر تختے کی چوکی پر بیٹھ چکا تھا اور پلکیں جھپکائے بغیر پنڈت اگھوناتھ کو تک رہا تھا۔ ''جو جس سلوک کے لائق ہوتا ہے' اسے وہی مرتبہ ملتا ہے۔'' میں نے بلا خوف کہا ویسے میں اپنے گردوپیش سے پوری طرح باخبر تھا۔

''مجھے صرف اتنا بتلا دو کہ تم کسی پیر فقیر اولیاء یا پیغمبر کے نظر کردہ ہو' جادوگر ہو یا میری طرح کوئی پہنچے ہوئے پنڈت ہو......'' پنڈت دھیراج صرف بول رہا تھا۔ اس کے صرف ہونٹ ہل رہے تھے۔

''بتلادوں گا پنڈت جی۔ پہلے مجھے میرے ایک سوال کا جواب دو......''

''پوچھو' میں تمہیں مایوس نہیں کروں گا......''

''تم نے ٹرین میں مجھ پر شیش ناگ ہی کو کیوں چھوڑا تھا جب کہ تم دیگر شیطانی قوتوں سے بھی کام لے سکتے تھے؟......''

''بہت اہم سوال کیا ہے تم نے...... سنو میں کالی مائی کا پجاری ہوں' سینکڑوں بدروحوں' چڑیلوں اور عفریت جنات پر حکومت کرتا ہوں۔ وہ سب مل کر بھی مجھے اس مدفن خزانے کا پتہ نہیں بتلا سکے جو شیش ناگ بتلا سکتا تھا۔ وہی ناگ مجھے اس خزانے کا مالک بھی بنا سکتا تھا' اس میں کچھ ایسی شکتیاں بھی تھیں جو میری تمام شکتیوں پر بھاری تھیں۔

خزانے کا راز جاننے کے لئے ہی میں نے اسے اس کی پاتالی سے اغواء کیا اور جب میری تمام شکتیاں بے کار ہو گئیں تو میں نے اسے مروا دینے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے ناگ سے کہا کہ اگر وہ تمہیں ختم کر دے گا تو میں اسے آزاد کر دوں گا۔ مجھے پہلے سے معلوم تھا کہ تمہارے پاس بھرا ہوا پستول ہے۔ وہی ہوا بھی۔ تم نے اسے مار ڈالا۔ اب اگر میں اس خزانے کو نہیں پا سکتا تو دوسرا کوئی بھی نہ پا سکے گا......''

''بالفرض اس کی کوئی مادہ بھی ہو گی' تو کیا وہ تم سے انتقام نہیں لے گی؟......'' میں نے سفاکانہ مسکراہٹ سے پوچھا۔ قطع نظر اس کے میں نے محسوس کیا کہ بوریوں میں دبے ہوئے پنڈت کے چاروں چیلوں کو حرکت ہونے لگی ہے۔

''نہیں۔ میں نے ایک تیر سے دو شکار کئے ہیں۔ ایک تو یہ کہ شیش ناگ سے میرا پیچھا

چھوٹ گیا۔ دوسرے یہ کہ اس کی مادہ تمہارے پیچھے پڑ گئی۔ میری ہی خادمہ نے ناگن کو تمہاری ...... امی ...... امی ......" جملے کے آخری الفاظ اس کی کریہہ چیخ میں بدل گئے۔ ایک جھٹکے سے اس کی آنکھیں کھل گئیں' اس کا پورا وجود شاخ بریدہ کی طرح تھر تھرانے لگا اور وہ الٹ کر گر پڑا۔

آن واحد میں اس کے ہونٹوں کے گوشے جھاگ اگلنے لگے تھے۔ وہ تڑپ رہا تھا کہ اس کی چوکی کے نیچے سے وہی ناگن لہراتی ہوئی نکلی جو مجھے کمرے میں وارننگ کر چکی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ ناگن سے عورت بن گئی۔ پیروں سے سر تک شکل و صورت کچھ دیر پہلے کی سی تھی' صرف لباس بدلا ہوا تھا۔ وہ جواہرات سے مرصع لاچہ پہنے تھی۔ اس کے پیروں میں گولڈن تلے کے سلیم شاہی جوتے تھے۔

"میں ...... آپ سے معافی کی طلبگار ہوں ......" وہ ہندوؤں کے سے انداز میں ہاتھ جوڑ کر بولی اور بڑی تیزی سے میرے پیر چھونا چاہتی تھی کہ ......

"کیا کر رہی ہیں آپ ......" میں لرز سا گیا' اس کے بازو پکڑ کر سیدھا کر دیا۔ میں بھی ناگن کے الفاظ کی طرح مؤدبانہ الفاظ ادا کرنے لگا۔

"میں نے' میں نے آپ کو اپنی بڑی بہن سلیمہ کا نام دیا تھا' جسے میں ...... میں آپا کہتا تھا ...... جس کی گود میں سر رکھے بغیر مجھے نیند ...... نہیں ...... آتی تھی ......" میری آواز رندھ گئی۔ آج پھر میری آنکھوں میں آنسو امڈ آئے تھے۔ میرا رواں رواں سسک کر رہ گیا تھا۔

"تو ...... کیا آپ کی بہن زندہ نہیں ہے؟ ......" اب ناگن نے میرے شانوں پر اپنا بازو حائل کر کے مجھے گویا بھینچ لیا۔ محبت کا یہ انداز ملتے ہی میرا بند ٹوٹ گیا' میں ہچکیاں بھر کر رو پڑا۔

"نہیں ...... سلیمہ آپا کے ساتھ میری دوسری بہن نسیمہ بھی اس دنیا میں نہیں ہے۔ وہ ...... وہ طبعی موت نہیں مریں بلکہ ...... بلکہ انہیں قتل کر دیا گیا تا ...... کھیتوں سے ان کی ادھڑی ہوئی لاشیں ملی تھیں ......" میں دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔

"کس نے قتل کیا تھا انہیں ؟...... "ناگن کی آواز میں حد درجہ بھیانک پھنکاریں شامل ہو گئیں ؟......

"ان ہی لوگوں نے جنہوں نے میرے دادا اور میرے ابا کو قتل کیا تھا۔ میری تمام موروثی جائیداد ہتھیالی تھی......"

"ناں...... ناں رو میرے ویرا۔ میں...... میں ہوں ناں آپ کے ساتھ میں سلیمہ ہوں ناں میرے بھائی۔ آپ کے سب ہی دکھ سمیٹ لوں گی۔ اپنے بھائی کے سر پر اپنے ہاتھوں سے سہرا سجاؤں گی......"



"چچا جی۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ مجھے ٹالیاں جنگلات کا جائزہ لینے کی اجازت دے دیں ؟......" میں نے پھوپھا کو مخاطب کیا۔

ہم سب ناشتے سے فارغ ہو کر بیٹھک میں آن بیٹھے تھے۔ میں صوفے پر بیٹھ گیا تھا اور میرے بھائی ایک ہی چارپائی پر بیٹھے تھے جب کہ پھوپھا الگ چارپائی پر گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے حقہ پھونکنے میں مشغول تھے۔ میں انہیں چچا اس لئے کہہ رہا تھا کہ وہ میرے ابا کے چچازاد بھائی تھے۔

"ہاں ہاں۔ شوق سے جاؤ مگر دو چار مزدوروں کو بھی ساتھ لے جاؤ......" میرے چچا نے دھواں اگلتے ہوئے جواب دیا۔

"نہیں چچا جی۔ میں تفریح کے لئے بغرض معائنہ کرنے نہیں جا رہا۔ میں اصل میں مزدوروں کے قتل اور غائب ہو جانے کا راز جاننے کے لئے جانا چاہتا ہوں۔ اگر مزدور میرے ساتھ ہوں گے تو میرا خیال دو طرف بٹ جائے گا......"

"اوئے پترا۔ کیا تم تحقیقاتی آفیسر لگے ہوئے ہو ؟ اوئے جھلیا' پولیس بھی بہت کوشش کر چکی ہے۔ اگر آٹھ پولیسئے جنگل میں جاتے تھے تو بمشکل چار ہی زندہ واپس آتے تھے۔ وہ بھی پاگل بن کر۔ نہیں پترا تم اکیلے نہیں جاؤ گے......"

"میں اکیلا نہیں ہوں چچا جی۔ میرے ساتھ دو ایسی طاقتور ہستیاں بھی ہیں کہ ان سے

انسان تو کجا جن بھوت بھی پناہ مانگتے ہیں۔ پلیز مجھے اجازت دیجئے......"

میں نے کچھ ایسی گول مٹول باتیں کیں' ایسے ایسے پینترے بدلے کہ میرے سادہ لوح چچا نے اجازت دے ہی دی۔

لہٰذا ٹھیک ساڑھے نو بجے' جب سورج نے پوری طرح اپنی حکمرانی قائم کر دی تھی' میں جیپ میں سوار ہو کر منزل کی طرف بڑھ گیا۔ پنڈت دھیراج اور اس کے چاروں چیلوں کا تصور میرے ذہن سے نکل چکا تھا۔

میری ناگن بہن ہی نے مجھے بتلایا تھا کہ پنڈت جب آنکھیں بند کئے پوری طرح میرے ساتھ محو گفتگو تھا تو سب سے پہلے اس نے پنڈت کے چیلوں کو ڈسا تھا۔

میری ناگن بہن نے یہ بھی بتلایا تھا کہ پنڈت دھیراج کے ڈیرے کی کھدائی کرنے سے چند معصوم بچوں کے پنجر بھی دستیاب ہوں گے۔

میں نے اس انکشاف کو بھی اس لئے نظر انداز کر دیا کہ' دو تین روز بعد جب پنڈت اور اس کے چیلوں کی لاشوں سے تعفن اٹھے گا تو گاؤں میں رہنے والے اس کے عقیدت مند از خود متوجہ ہو جائیں گے۔ مجھے معلوم تھا کہ جب تک پنڈت دھیراج اگھوری برگد کے بوڑھے درخت کے سائے میں اپنی چوکی پر نہیں بیٹھے گا' کوئی عقیدت مند اس کے جھونپڑے کے قریب بھی نہیں جائے گا۔

یہی کچھ سوچ کر میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ ٹالیاں کے جنگل میں بسنے والی بلاؤں کا حتی المقدور خاتمہ کر دوں تاکہ پھوپھا کا کاروبار چل نکلے اور سینکڑوں مزدوروں کے گھروں کے چولہے بھی روشن ہو جائیں۔

میں پنڈت دھیراج کا پاتال بھی تلاش کرنا چاہتا تھا جہاں بیٹھ کر وہ سانپوں' بھیڑیوں' چڑیلوں اور بد روحوں پر حکمرانی کرتا تھا۔

انہی خیالات میں غلطاں پیچاں میں ڈھوک ٹالیاں کی چیک پوسٹ پر پہنچ گیا۔

البرٹ ہیکل اپنے چند کانسٹیبلوں کے ساتھ تھانے سے باہر ہی بیٹھا ہوا دھوپ سینک رہا تھا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی اٹھ کھڑا ہوا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا میری طرف بڑھا۔ میں

نے اس کے قریب ہی جیپ روک دی۔ رسمی علیک سلیک کے بعد البرٹ کے پوچھنے پر میں نے واضح الفاظ میں بتلا دیا کہ میں ٹالیوں کے جنگل میں کیوں جانا چاہتا ہوں۔

"ویل میجر سر۔ ویسے میرا خیال ہے کہ آپ پنڈت دھیراج سے اسی گاؤں میں مل سکتے ہیں......" البرٹ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"نہیں مسٹر البرٹ، مجھے پنڈت سے ملنے کا کوئی شوق نہیں ہے میں تو صرف اس کی پراسرار حرکتوں کا راز جاننا چاہتا ہوں......"

"اوہ...... تو کیا پنڈت دھیراج مشکوک آدمی ہے؟......" البرٹ نے چہرہ سنجیدہ بناتے ہوئے پوچھا۔

"تو کیا آپ کو معلوم نہیں ہے......" میں نے اس کے چہرے کا بغور جائزہ لیتے ہوئے جواب دیا۔ مجھے یقین کر لینا پڑا کہ البرٹ واقعی کچھ نہیں جانتا۔ "نو میجر مجھے تو وائسرائے پنجاب نے سارے گاؤں کا خود مختار آفیسر بنا کے بھیجا ہے۔ مجھے صرف یہ ہدایات دی گئی ہیں کہ کسی بھی صورت حال میں زمیندار چوہدری نظام کی دل شکنی نہ کروں......"

"مسٹر البرٹ، اگر ایسا وقت پڑ جائے، جب آپ کو وائسرائے کے زبانی احکامات کی خلاف ورزی کرنی پڑے تو......؟"

"اگر آپ میرا ساتھ دینے کا وعدہ کریں تو میں وائسراء کے کسی ناجائز حکم کو ماننے سے صاف انکار کر دوں گا......"

"ویل مسٹر البرٹ، وعدہ رہا......" کہتے ہوئے میں نے پوری گرمجوشی سے البرٹ کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا۔

اس کے بعد چوہدری نظام سے متعلق اسے چند ضروری ہدایات دے کر میں نے جیپ آگے بڑھا دی۔

گزرگاہ پر پہنچ کر میں نے چار فرلانگ کا فاصلہ ہی عبور کیا تھا کہ ایکسیلیٹر کی جانب سے خوفناک پھنکار سن کر میں بری طرح چونک پڑا۔ ممکن ہے اس طرح چونک پڑنے سے میری جیپ صرف چند گز آگے جاتی ہوئی بیل گاڑی سے ٹکرا جاتی، پوری حاضر دماغی سے

میں نے اسٹیئرنگ کنٹرول کرتے ہوئے بریک دبا دیئے' جیپ رک گئی اور میری نظریں پھن کاڑھے ناگن پر پڑیں جو میرے برابر والی سیٹ پر پھن نکلے سرسراتی رہی۔

چند ہی لمحوں بعد وہ دودھیائی دھواں بن کر انسانی روپ میں آگئی۔

''السلام علیکم آپا......''

''وعلیکم السلام ویرا کیسے ہو؟''

''ٹھیک ہوں آپا۔ آپ کو کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟......'' میں نے جیپ آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''نہیں میرے بھائی مجھے کیا تکلیف ہو سکتی ہے؟......''

ہمارے درمیان باتیں ہوتی رہیں اور فاصلہ گھٹتا گیا۔ بہت جلد میری جیپ ٹالیوں کے جنگل میں داخل ہو گئی۔ یہ جنگل قدرتی اور گنجان تھا اور چھوٹے بڑے پرندوں سے بھرا ہوا تھا۔ کہیں نشیب تھے تو کہیں فراز۔ گڑھے بھی تھے اور ہموار زمین بھی۔ یقیناً یہاں بے تحاشہ سانپ بھی ہوں گے۔

کافی دیر تک مختلف موڑ مڑتے رہنے کے بعد ایک نیم میدانی حصے میں پہنچ کر مجھے جیپ روک دینی پڑی اور ایسا کرنے کو مجھے میری ناگن بہن ہی نے کہا تھا۔

''کیا اندازہ لگایا تم نے''؟...... سلیمہ نے جیپ سے اترتے ہوئے پوچھا۔

''بہت کچھ آپا۔ جگہ جگہ درخت کٹے ہوئے تھے۔ زمین پر سینکڑوں پیروں کے نشانات بھی نظر آئے۔ بڑے چھوٹے آرے اور کلہاڑے بھی پڑے تھے جو گرد آلود بھی نہ تھے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جنگل میں درخت کاٹنے کا سلسلہ باقاعدہ جاری ہے جب کہ میرے پھوپھا کے مطابق گزشتہ چار ماہ سے کام بند ہے' ڈھوک ٹالیاں کے مزدور جنگل میں جانے سے ڈرتے ہیں......''

''دیکھو ویرا' ہم اس وقت سطح زمین سے اس قدر ترائی میں کھڑے ہیں کہ یہاں سے ہمیں درختوں کے اختتامی حصے ہی نظر آ رہے ہیں یا پھر پھڑ پھڑاتے ہوئے پرندے۔ یہ ایک وسیع و عریض کھڈ ہے اور تم دیکھ رہے ہو کہ یہاں کی زمین اس قدر گیلی ہے

کہ مٹی کے لوتھڑے ہمارے جوتوں کے تلووں سے چپکے ہوئے ہیں......"

"آپ کہنا کیا چاہتی ہیں آپا؟......" میں الجھ کر رہ گیا۔

"یہی کہ درختوں کی کٹائی کا سلسلہ جاری ہے۔ جگہ جگہ ہم نے درخت کاٹنے کے اوزار بھی دیکھے ہیں۔ میں ارادتاً تمہیں اس مقام تک لائی ہوں کہ یہاں تم جنگل میں کام کرنے والوں کی نظروں سے محفوظ ہو۔

کوئی ہے جو تمہارے پھوپھا کے مزدوروں کو خوفزدہ کرنے کے بعد اس جنگل کی قیمتی لکڑی حاصل کر رہا ہے۔ ٹائم بتلاؤ؟......"

میں نے پر تشویش نظروں سے ناگن بہن کو تکتے ہوئے رسٹ واچ میں وقت دیکھا۔

"دس بج کر دس منٹ ہوئے ہیں......"

"ٹھیک ہے' اہم ضرورت کے بغیر یہاں سے نہ نکلنا۔ میں ناگن ہوں' سارے راز جان کر ہی لوٹوں گی......"

اس سے پہلے کہ میں ناگن بہن کو روکتا یا اس سے کوئی سوال کرتا' اس کا جسم یک بیک ہی دودھیائی دھواں بن گیا۔

☆☆☆

"اوئے پترا توں......

غیر متوقع آواز سن کر میں چونکے بغیر آواز کی سمت گھوما' وہ وہی ادھیڑ عمر عورت تھی جس نے میری ناگن بہن کو میرے تعاقب میں لگایا تھا۔

وہ مجھ سے صرف چند گز دور کی بلندی پر جھاڑیوں کے درمیان کھڑی تھی۔ اس کا لباس سیاہ' گھیر دار اور زمین کو چھوتا ہوا تھا۔ اس کے سر کے بال کھلے اور بکھرے ہوئے تھے۔

'جیوندا ئیں......" اس نے جملہ مکمل کر دیا۔

"آہو مائی ویکھ لے......"

"تے پھر چلیں......" کہنے کے ساتھ ہی وہ اپنے دونوں بازو پھیلا کر کسی بہت بڑے

پرندے کی طرح اڑتی ہوئی سی مجھ پر حملہ آور ہو گئی۔

کوئی لمحہ ضائع کئے بغیر میں نے جیپ کی سیٹ سے کوڑا اٹھا کر زائیں سے لہرا دیا۔

کوڑے کی لمبی زبان حملہ آور کی پیٹ سے لپٹ گئی۔

حملہ آور عورت کی کریہہ طویل اور کرہناک چیخ سے کھنڈ نما اطراف اور اس کا طول و ارض گونج اٹھا۔ بلندیوں پر پرواز کرتے ہوئے بے شمار پرندے اپنی اپنی زبان میں چیخ پڑے' ہوا میں ایکا ایکی تیزی آگئی اور حملہ آور عورت ایک دھماکے سے زمین پر آن گری۔

گرتے ہی اس کا اصل روپ ظاہر ہو گیا۔ وہ اس قدر بھیانک تھی کہ ایک نظر دیکھتے ہی رگوں میں دوڑنے والا خون جم کر رہ جائے۔

وہ کولتار کی طرح سیاہ تھی' اس کا سر دچہرہ محض ایک ڈھانچہ تھا۔ آنکھ' ناک اور منہ کی جگہ لرزہ خیز گڑھے تھے جن سے بل کھاتے سیاہ ترین دھوئیں کے مرغولے سے نکلنے لگے تھے۔

اس کے دھانے سے ایسی آوازیں نکل رہی تھیں جیسے کئی بلیاں باہم الجھ گئی ہوں۔

چونکہ وہ میرے کوڑے میں پھنسی ہوئی تھی' زمین پر کسی زخمی یا دم توڑتی کتیا کی طرح تڑپ رہی تھی اس طرح اس کے تڑپنے سے مجھے بھی شدید جھٹکے لگنے لگے تھے۔

وہ بلبلا کر مجھے پیروں سے پکڑنے کے لئے بار بار لپک رہی تھی مگر اچھل اچھل کر میں ہر بار خود کو بچاتا رہا۔

''چھوڑ دو' چھوڑ دو مجھے' تمہیں لات و منات کا واسطہ دیتی ہوں مجھے چھوڑ دو......''

کافی دیر تک تڑپنے کے بعد وہ چت پڑی ہوئی گڑگڑائی اس کے بھیانک منہ سے دھوئیں کے سیاہ مرغولوں کے ساتھ جو آواز نکل رہی تھی وہ کسی طرح ریلوے انجن کی چھک چھک سے کم نہ تھی۔ ''چھوڑ دوں تجھے'' حیرت انگیز طور پر میرے لبوں سے غیر ارادی جملے نکلنے لگے۔ ''تاکہ تو بے گناہ انسانوں کے خون سے اپنی پیاس بجھاتی رہے۔ بھولے بھٹکے مسافروں کی زندگی سے کھیلتی رہے.....''

''مجھے چھوڑ دو میں اس علاقے سے چلی جاؤں گی۔ تم نے...... تم نے میرے گرو کو مار

ڈالا ہے' وہی مجھے صحرائے تھر سے غلام بنا کر لایا تھا۔ اب وہ نہیں ہے' اس کا حصار بھی ٹوٹ چکا ہے اس لئے...... میں' میں یہاں سے چلی جاؤں گی......"

وہ میرے سوال کو نظر انداز کر کے اپنی ہی ہانکتی رہی اور اس کا جواب مکمل ہونے تک میں نے جیپ سے وہ ٹین اٹھا لیا تھا جس میں پیٹرول بھرا ہوا تھا۔ پھر میں نے ہر ممکن احتیاط کا مظاہرہ کرتے ہوئے چڑیل پر کافی سارا پیٹرول اُچھال دیا۔

"یہ...... یہ تم کیا کرنے لگے ہو؟......" وہ چلاتے ہوئے لوٹیں لگانے لگی۔

"تمہیں مکتی کر رہا ہوں جانِ من۔ تم رہائی چاہتی ہو نا......" پراسرار لہجے میں کہتے ہوئے میں نے اوور کوٹ کی جیب سے چھوٹا سا گن ٹائپ لائٹر نکال لیا اور پھر جیسے ہی وہ میری رینج میں آئی' میں نے اسے شعلہ دکھا دیا۔

ماچس بھی میری جیب میں تھا لیکن چونکہ ماورائی ہوائیں مرغولے بنتی ہوئی تھیں اس لئے تیلی کا استعمال بیکار ثابت ہوتا۔

اچانک بہت ہی کریہہ آواز ہوئی' جیسے کھولتے ہوئے تیل کے کڑاہے پر پانی کا گھڑا انڈیل دیا گیا ہو۔ اس کے ساتھ ہی آگ کا بڑا سا الاؤ روشن ہوا اور میں ہنٹر کھینچ کر فوراً ہی جیپ کی طرف ہٹتا چلا گیا' پھر اتفاقاً ہی میری نظر جیپ کی سیٹ کی طرف اٹھ گئی۔ میری ناگن بہن گھٹنے سے اپنی کہنی ٹیکے اور ہتھیلی سے ٹھوڑی ٹکائے بیٹھی ہوئی مسکرا رہی تھی۔

☆☆☆

بغیر کسی تشویش کے میں جیپ کی رفتار بڑھاتا اور گھٹاتا رہا۔ میرے ذہن پر ہنوز چڑیل کی عبرتناک موت کا تصور چھایا ہوا تھا۔ وہ چیختی چلاتی جل کر بالکل راکھ بن چکی تھی۔

مجھے خاموش پا کر ناگن بہن بھی تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہو گئی تھی' وہ صرف مجھے راستہ بتلاتی رہی۔

"کیا سوچ رہے ہو ویرا؟......"

"آں...... ہاں کچھ نہیں بہنا......" میں نے چونکتے ہوئے جواب دیا۔

"ہوں۔ تم پوچھ نہیں رہے مجھ سے ......

"مم' میں یہ سمجھا کہ آپ خود بتلائیں گی۔ چلئے اب بتلا دیجئے۔ آپ نے کیا کچھ معلوم کیا......"

"اس جنگل میں تین چار روز سے کام بند ہے......" ناگن بہن نے بتلانا شروع کیا۔ "اور شاید مزید چند روز کام بند رہے گا۔ لوگ کہہ رہے تھے کہ جنگل کی کٹائی کا کام کسی چوہدری ارسلان کی سربراہی میں ہوتا تھا۔ اسے کسی نے قتل کر دیا ہے' شاید اس کے دسویں کے بعد کام پھر شروع ہو جائے گا۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اب کام بالکل بھی نہیں ہو گا۔ جنگل کی کٹائی کا کام باہر کے لوگ کرتے رہے ہیں۔ اب ایسے ہی لوگ باقی رہ گئے ہیں جو مجرمانہ زندگی گزارنے کے عادی ہیں۔ شراب کشید کرتے ہیں' ڈاکے ڈالتے ہیں اور عورتوں کو اغواء کرتے ہیں......"

"وہ' وہ کہاں ہیں بہنا؟......" میں نے اطمینان سے پوچھا۔

"دریا کے کنارے چند اونچے اونچے ٹیلے ہیں۔ وہ سب انہی ٹیلوں کے غار میں رہتے ہیں۔ ان کی تعداد بیس سے زیادہ اور پچیس سے کم ہے۔ چند جوان و خوبصورت عورتیں بھی ان کی قید میں ہیں اور یہ عورتیں اطراف کے پنڈوں سے اغواء کی گئی تھیں۔ کئی ایسی عورتوں کو ارسلان کے حکم سے قتل بھی کر دیا گیا ہے جو ان زانی مردوں کی ناجائز اولاد کے قابل ہو گئی تھیں......"

"اوہ......" میرے ہاتھوں کی گرفت اسٹیئرنگ پر بہت سخت ہو چکی تھی۔

"مگر میں تمہیں پنڈت دھیراج کے پاتال کی طرف لئے جا رہی ہوں......"

"اوہ۔ تو آپ نے گویا......" میں یہیں تک کہنے پایا تھا کہ میری ناگن بہن میرا مقصد سمجھتے ہوئے بول اٹھی۔

"ہاں۔ میں پنڈت دھیراج کے پاتال کا پتہ لگا چکی ہوں۔ اس کے چند چیلے پاتال میں موجود ہیں مگر ان میں سے کسی ایک کو بھی پنڈت کی موت کا علم نہیں ہے۔

ایک بات کا خیال رکھنا ویرا' پنڈت کے پاتال کے گرد اور پاتال میں کچھ شیطانی قوتیں بھی موجود ہیں' میں ہزار دقتوں کے بعد پاتال میں اترنے میں کامیاب ہوئی تھی......"

میری ناگن بہن یہیں تک کہنے پائی تھی کہ اچانک جیپ کے انجن میں خرابی پیدا ہو گئی اور جیپ جھٹکے لینے لگی۔

''شاید پانی ختم ہو گیا ہے......'' ناگن بہن سے کہتے ہوئے میں جیپ روک کر اتر پڑا' پھر جب انجن کا ڈھکن اٹھایا بھی نہ تھا کہ دیکھا' ناگن بہن سیٹ پر نہیں تھی۔

میرا ماتھا ٹھنکا۔ میرے پورے وجود میں ٹھنڈی لہریں سی دوڑنے لگیں اور چھٹی حس نے کسی انجانے خطرے کا احساس بڑھا دیا۔ میں نے دونوں ہتھیلیاں بونٹ پر ٹیک دیں اور اطراف کا جائزہ لینے لگا۔

جس مقام پر میری جیپ از خود رک گئی تھی' وہ گنجان اور لمبے لمبے درختوں سے اس طرح گھرا ہوا تھا کہ بلندی سے دھوپ زمین کو نہیں چھو سکتی تھی البتہ تنوں کے درمیان سے دھوپ ماحول کو روشن رکھے ہوئے تھی۔

اصولاً یہاں پرندوں کی بہتات ہونی چاہئے تھی لیکن کسی قسم کے کسی ایک پرندے کی آواز بھی سنائی نہ دی البتہ اتنا محسوس ہوا جیسے موٹے موٹے تنوں کی اوٹ سے کراہیں سی اٹھ رہی ہوں۔ مکمل جائزہ لینے کے بعد میں بونٹ سے ہتھیلیاں ہٹا کر تن کر کھڑا ہو گیا اور کندھے سے لپٹا ہوا ہنٹر کھینچ کر دستے کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔

مسلسل دو منٹ تک ساکت و جامد کھڑے رہنے کے بعد بھی جب کوئی قابل ذکر واقع رونما نہ ہوا تو میں نے بالکل غیر ارادی طور پر بائیں جانب قدم بڑھا دیئے یا پھر یوں سمجھئے کہ میرے وجود سے کسی پوشیدہ قوت نے مجھے بائیں سمت دھکیلنا شروع کر دیا تھا۔ چند ہی قدم بڑھنے پایا تھا کہ سرکنڈے کی جھاڑیوں کے پیچھے سے کسی عورت کے کراہنے کی آوازیں ابھرنے لگیں۔ میں ٹھٹک کر رک گیا۔ رکا ہی تھا کہ میرے پورے جسم میں تھرتھراہٹ اٹھی۔ ساتھ ہی مجھے ایک شدید جھٹکا بھی لگا اور ...... میری ناک کے نتھنوں سے قوس و قزح کے رنگ بکھیرتی باریک لہریں نکل کر انسانی روپ پا گئیں۔

یہ گنزا تھی' حسین نسوانیت کا شاہکار گنزا۔ میری خفیہ مددگار گنزا۔ وہ مجھے دیکھ کر رہی مسکرا رہی تھی اور اس کی مسکراہٹ میرے لئے آب حیات کا درجہ رکھتی تھی۔

''بہن کا ملنا مبارک ہو صاحب جی......'' وہ جب بولی تو نہ جانے کیوں مجھے یوں محسوس ہوا جیسے قدیم یونان کی تصوراتی دیوی کے مندر کی گھنٹیاں بج اٹھی ہوں۔

''شکریہ گنزا...... وہ مجھے بہت پیار کرتی ہے اور میں...... میں تم سے پیار کرتا ہوں......''

''اف اللہ یہ پیار۔ او میاں مجنوں' پیار کے تالاب سے نکل آیئے۔ گنزا آپ کو ضرور ملے گی فی الحال اپنے آپ کو سنبھالیں۔ آپ چاروں طرف سے بدروحوں میں گھر چکے ہیں۔ یہاں بگڑے ہوئے جنات نہیں بلکہ صرف بدروحیں ہیں۔ آپ کا ہر اگلا قدم پنڈت کے پاتال کی طرف اٹھ رہا ہے۔ اسی لئے میں نے آپ کے جسم کو چھوڑا ہے۔ یقین رکھیں' مجھے نہ تو کوئی بدروح دیکھ پائے گی اور نہ ہی آپ کی ناگن بہن مجھے دیکھ سکے گی۔

جایئے' ایک حسین و جمیل بدروح آپ کی امداد کی توقع پر کراہ رہی ہے' اپنے جذبات پر قابو رکھئے گا......''

میں نے سرکنڈے کی جھاڑیوں کی طرف قدم بڑھا دیئے۔ گو کہ گنزا میرے ساتھ ساتھ تھی لیکن' مجھے محسوس یوں ہوا جیسے محض ایک چمکدار انسانی ہیولہ ہو اکہ دوش پر میرے ساتھ ہے۔ جیسے ہی درمیانی فاصلہ اور جھاڑیاں عبور کر کے میں دوسری سمت پہنچا میری نظریں ایک حسین و جمیل اور جوان سی عورت پر پڑیں اور وہ زمین پر چت پڑی ہوئی کراہ رہی تھی۔ اس کی دونوں ٹانگیں پھیلی ہوئی اور کلائیوں و ٹخنوں سے آہنی زنجیر میں جکڑی ہوئی تھیں اور آہنی زنجیریں زمین میں گڑی ہوئی کھونٹیوں سے بندھی تھیں۔

وہ گھاگھرا اور اسکرٹ پہنے تھی۔ اس کی گھاگھرا ایک ٹانگ سے اس قدر اٹھی ہوئی تھی کہ اس کی ٹانگ' سرخ و سفید ٹانگ ران سے اوپر تک برہنہ تھی اور اسکرٹ اس قدر اٹھا ہوا تھا کہ اس کا سینہ تک برہنہ تھا۔ وہ کراہ رہی تھی' شاید اس لئے کہ اس کے دودھیائی پیٹ سینے تک لاتعداد بڑے بڑے چیونٹے چمٹے ہوئے تھے۔

بے بس لڑکی پر ایک نظر ڈالتے ہی میرے رگ و پے میں ہزاروں چیونٹیاں سی رینگ اٹھیں۔ میرا پورا جسم جھرجھرا کر رہ گیا۔ اس کا جسم اس کے نقوش اور حسن و جمال اس

قدر پرکشش تھے کہ میری سانس اکھڑنے سی لگی۔

پھر اس سے پہلے کہ میرے جذبات مزید برانگیختہ ہوں' اچانک میرے ذہن نے پلٹا کھایا۔ مجھے یہ دیکھ کر انتہائی تعجب ہوا کہ لاتعداد چیونٹے اس کے جسم سے چمٹے ہوئے ہیں مگر نہ تو کہیں زخم نظر آیا تھا اور نہ خون۔

پھر یہ کہ وہ بہت ہی یخ بستہ زمین پر پڑی تھی مگر اس کے ٹھنڈک نہیں پکڑ رہی تھی۔

کچھ بھی تھا' مجھ پر نظریں پڑتے ہی وہ گڑگڑائی۔ "بابو جی مجھے اس اذیت سے نجات دلاؤ۔ میری بندشیں کھول دو بابو جی......"

"......اچھا مائی۔ ذرا ٹھہرو......" میں لبوں پر مسکراہٹ لئے اس کی طرف بڑھا اور قریب پہنچ کر رک گیا۔

"بھئی واہ۔ کس قدر حسین ہو تم۔ تمہارا جسم کس قدر پرکشش ہے۔ کہاں کی رہنے والی ہو؟......" میرے لب و لہجے میں عیاشی چھلکنے لگی تھی۔

"پہلے مجھے آزاد تو کردو بابو جی' پھر تعریف کرتے رہنا......"

"لو ہاں......" کہتے ہوئے میں نے جھک کر زمین پر بکھرے ہوئے اس کے سیاہ بال مٹھی میں جکڑ لئے۔ جکڑے ہی تھے کہ اس کے حلق سے ایک طویل اور کریہہ چیخ یک بیک ہی اس کا چہرہ بھیانک ہو گیا' اس کی آنکھیں سلگ اٹھیں اور کررٹ کررٹ کی ہولناک آواز سے اس کے دانت باہم ٹکرانے لگے۔

پلک جھپکتے کی دیر میں اس کا پورا جسم چتکبرے' موٹے اور لمبے اژدہے کا جسم بن گیا۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس کا اژدہے نما جسم فرفراہٹ کی تیز آواز میں گیس بھرے غبارے کی طرح بلند ہوا اور میری کمر کے گرد لپٹنا ہی چاہتا تھا کہ محض چمک بنتی ہوئی گنزا نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا۔

شوں شوں کی کریہہ ترین آواز ابھری' جیسے توے کے کھولتے ہوئے تیل میں مچھلی ڈال دی گئی ہو...... بہت ہی بھیانک بدبو بھی اٹھی' ہواؤں میں اس قدر تیزی آگئی' اس قدر گرد کے مرغولے اٹھے کہ مجھے آنکھیں کھلی رکھنا دوبھر محسوس ہوا۔

''اس کے بال چھوڑ دیں وصی الدین اور پیچھے دیکھیں...... ''گنزا کی آواز سنائی دی۔
اس کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی میں نے چڑیل کے بال چھوڑ دیئے اور' جیسے ہی مڑا' یکبارگی میرا دل اچھل کر میرے حلق میں آاٹکا۔

وجہ بھی معقول تھی۔ بیک وقت چھ بچے' جن کی عمریں مشکل تین تین برس رہی ہوں گی' مگر ان کے سر بڑے بڑے مٹکوں کی طرح پھیلے ہوئے تھے۔ ان کی آنکھوں کی جگہ دو گہرے' گول اور سیاہ گڑھے سے پڑے ہوئے تھے اور ان گڑھوں سے سنہرے دھوئیں کی لمبی لمبی اور چوڑی دھاریں سی نکل کر میرے سینے سے ٹکرانے ہی والی تھیں۔

چھ کے چھ بچوں کے منہ مگرمچھ کے دہانے کی طرح کھلے ہوئے تھے اور نوکیلے دانت بھی مگرمچھ کے دانتوں کی طرح تھے۔

ایک لمحے کے دسویں حصے میں میرے ذہن اور آنکھوں سے اندھیرے چھٹ گئے اور میں بجلی کے کوندے کی طرف جمپ لگا کر دوسری طرف ہٹ گیا۔ ہٹتے ہٹتے میں نے بائیں ہاتھ میں دبوچا ہوا ہنٹر بھی گھما دیا نتیجتاً ان کی آنکھوں سے نکلنے والی سنہری لپٹیں اس اژدہے نما چڑیل سے لپٹ گئیں جو زمین سے معلق اور گنزا کی گرفت میں تھی۔

اف...... اف' جنگل میں گویا بھونچال سا آ گیا۔ اژدہے نما چڑیل کے پورے وجود سے شعلے لپٹ گئے۔ اس کی بھیانک ترین چیخوں سے پورا جنگل گونج اٹھا۔

بیک وقت میرا گھمایا ہوا کوڑا چھ بچوں کی ننگی ٹانگوں سے چمٹتا ہوا گزر گیا تھا' ایسا ہوتے ہی چھ کے چھ بچے منہ کے بل زمین پر گر پڑے۔ گرتے ہی ان کے دہانوں سے خوفناک ترین خرخراہٹیں نکلیں جو آن واحد میں معدوم بھی ہو گئیں۔ معدوم اس لئے کہ ان کے مٹکے نما سر زمین سے ٹکراتے ہی پاش پاش ہو گئے تھے اور وہ پاشے لاتعداد سیاہ پھوہن کر میری طرف لپکے یہ سب کچھ چند لمحوں میں ہو گیا۔ قطعی نہیں لگتا تھا کہ میں انسانوں سے بسی ہوئی دنیا میں ہوں۔

''پیٹرول' صاحب جی پیٹرول...... ''سراب کی سی چمک رکھنے والی گنزا کی آواز سنتے ہی میرے گویا پر نکل آئے۔ میں کوڑے کو اپنے سر کے اوپر گھماتا ہوا ہوا کے بگولے کی طرح

درمیانی فاصلہ عبور کر کے جیپ کے قریب پہنچ گیا۔ فی الفور پیٹرول کا ٹین اٹھا کر مڑا۔ مڑا ہی تھا کہ میرے دل کی دھڑکن رک گئی۔ وجہ وہی بڑے بڑے لاتعداد سیاہ بچھو تھے جو سرکنڈے کی جھاڑیوں سے نکل نکل کر میری طرف بڑی تیزی سے لپک رہے تھے۔ ان کے اٹھے ہوئے ڈنک گویا میں اپنے جسم میں چبھتے ہوئے محسوس کر رہا تھا۔

"جلدی کرو صاحب جی......" گنزا کی آواز مجھے بہت دور سے آتی محسوس ہوئی حالانکہ وہ میری نظروں کے سامنے فضاء میں معلق کھڑی ہوئی تھی۔ لیکن یہ حقیقت تھی کہ خوف کی زیادتی نے مجھے مجسم پتھر بنا دیا تھا۔ میں ایک ہاتھ میں کوڑا اور دوسرے ہاتھ میں پیٹرول کا ٹین لئے گم صم کھڑا تھا۔ سیاہ بچھوؤں کے روپ میں اذیتناک موت اور میرے درمیان صرف چھ انچ کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ اچانک پھنکار گونجی۔ پھنکار کے ساتھ ہی آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی آگ کا بہت بڑا الاؤ نکل کر بچھوؤں سے جا ٹکرایا۔

ٹھیک اسی لمحے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے میرے بازو پکڑ کر مجھے زمین سے اٹھا کر جیپ کی ڈرائیونگ سیٹ پر کھڑا کر دیا تھا۔

آج...... آج جب میں سوچتا ہوں کہ سراب کی چمک رکھنے والی گنزا جنی مجھے اٹھا نہ لیتی اور میری ناگن بہن شعلے نہ اگلتی تو میرا کیا حشر ہوتا؟ سوچ کر آج بھی میں بید مجنوں کی طرح کپکپا جاتا ہوں۔

بہر حال جیپ کے نیچے سے پھنکاریں ابھرتی رہیں' آگ کے الاؤ سیاہ بچھوؤں سے چمٹتے رہے اور شوں اوں کی دلدوز آوازوں سے بچھو راکھ بنتے رہے۔ یہ کھیل اس وقت تک جاری رہا' جب تک آخری بچھوؤں کی قطار پھنک نہ گئی۔



"بھائی۔ میرے پیارے بھائی۔ کیا ہوا تمہیں' تم بولتے کیوں نہیں؟......" ناگن بہن کی آواز مجھے کوسوں دور سے آتی محسوس ہوئی لیکن میں ٹس سے مس نہ ہوا۔ معاً میرے وجود کو ایک جھٹکا لگا۔ یقیناً گنزا میرے وجود میں داخل ہو گئی تھی۔

"وصی الدین......" یک بیک ناگن بہن نے مجھے اوور کوٹ کے کالرز سے پکڑ کر

جنجھوڑ کر رکھ دیا۔

"آں......" میں ایسے چونکا جیسے گہری نیند میں ڈراؤنا خواب دیکھ کر بیدار ہوا ہوں۔

سلیمہ' یعنی میری ناگن بہن اپنی سیٹ پر کھڑی ہوئی تھی اس کے چہرے پر پسینے کے موٹے موٹے قطروں کے ساتھ فکر و تشویش کے آثار چھائے ہوئے تھے۔

"تم۔ تم بولتے کیوں نہیں ہو۔ بتاؤ مجھے بتاؤ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ کیا محسوس کر رہے ہو تم؟......" مجھے اپنی طرف متوجہ پا کر ناگن بہن شدید الجھے ہوئے لہجے میں بولی۔

"آپا......" میں گویا چلا سا پڑا۔ ناگن بہن کی بے پناہ محبت نے میرے سینے میں بھی محبت کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر بھر دیا تھا۔ میں نے بے خود ہو کر ناگن بہن کو اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔

سارا محیر العقول ماحول اپنے قدرتی رنگ میں بدل چکا تھا۔

"میری پیاری آپا۔ میں ٹھیک ہوں۔ ٹھیک ہوں آپا۔ بس' نہ جانے کیوں بچھوؤں کو دیکھ کر میرا ذہن ماؤف ہو گیا تھا......"

"ناں ویراناں۔ میں ہوں ناں تیرے ساتھ' جان دے دوں گی مگر اپنے ویر پر آنچ نہیں آنے دوں گی۔ مت گھبرائیں ویرا۔ بہن تیرے صدقے۔ مجھ سے تیری تکلیف نہیں دیکھی جا سکتی......"

"چنگا میری ماں ورگی بھیڑاں۔ اب بیٹھ جاؤ......" میں نے روہانسی آواز میں کہتے ہوئے ناگن بہن کو سیٹ پر بٹھلا دیا اور اپنا کوڑا کندھے سے ٹکا کر' اپنی دونوں ٹانگوں کے درمیان سیٹ پر رکھا ہوا پیٹرول کا ٹین اٹھا کر پشتی جانب رکھ دیا۔

"کھانا کھا لو بھائی۔ دن کے تین بج چکے ہیں۔ ابھی تمہیں بہت کچھ کرنا ہے......" ناگن بہن بڑے ہی پیار سے بولی۔

"کھانا......" میں چونکا اور بے ارادہ جیپ کی پشتی جانب دیکھا۔ بڑی سی ٹرے کسی ریشمی کپڑے سے ڈھکی ہوئی پڑی تھی۔ ٹرے کے برابر ہی مٹی کا کوزہ اس پر قلعی شدہ تانبے کا گلاس بھی پڑا تھا۔

فی الفور مجھے خیال ہوا کہ میرے کھانے پینے کا انتظام گنزا ہی نے کیا ہوگا۔

میں نے کوزہ اٹھایا ہاتھ دھوئے اور پشتی سیٹ پر بیٹھ کر ٹرے سے کپڑا ہٹادیا۔ مرغی کی بھنی ہوئی دورانیں تھیں۔ سلاد تھی زائتہ بھی تھا اور خالص گھی میں پکائے پراٹھے تھے۔

"ایک بات بتلاؤ وصی؟ ....." ناگن بہن پراسرار مسکراہٹ سے بولی۔ "پوچھیے آپا" میں کھاتے ہوئے بولا۔

"ہم جب دھوک ٹالیاں چیک پوسٹ سے چلے تھے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ ہم جب حویلی سے روانہ ہوئے تھے' سیٹ پر کچھ بھی نہ تھا۔ نہ کھانا اور نہ پانی بھرا کوزہ۔ پھر یہ سب یہ کہاں سے آگیا؟"

"آپا۔ مثل مشہور ہے کہ اللہ بھوکا اٹھاتا ہے بھوکا سلاتا نہیں ہے......"

"بکواس مت کرو...." آپا نے پیار سے ڈانٹا۔ "تم کیا سمجھتے ہو کہ مجھے کچھ پتا نہیں ہے—

"کیا پتہ نہیں ہے آپا؟ پہیلیاں کیوں بجھا رہی ہیں آپ؟......"

"سن چھوٹے۔ میں ناگن ہوں میں نے زبردست طاقتیں رکھنے والے بزرگوں سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ کیا یہ غلط ہے کہ ایک جنی تمہاری درپردہ مدد کر رہی ہے؟......"

"نہیں آپا آپ بالکل صحیح کہہ رہی ہیں۔ جنی کے ساتھ ساتھ چند جن بھی میری مدد پہ مامور ہیں" میں نے کچھ بھی نہ چھپایا۔ ویسے بھی میں کب تک چھپاتا۔ مجھے شبہ ہی نہیں بلکہ یقین تھا کہ جون بدلنے والی میری ناگن بہن بھی شکتی رکھتی ہے۔

"پتہ ہے ویرا میں نے یہ سب کچھ کیوں پوچھا ہے؟......"

"مجھے بھلا کیا پتہ آپا؟ آپ بتلائیں گی تو پتہ چلے گا ناں......"

"تو سنو۔ تم جب پنڈت دھیراج کے گاؤں والے ڈیرے پر جا رہے تھے جہاں تمہارے بھائی کے روپ میں ایک خوفناک جن سے تمہارا واسطہ پڑا تھا' اس وقت میں نے تمہارے وجود سے قوس و قزح کی لہریں پھوٹتی ہوئی دیکھی تھیں۔

دوسری بار جب تم جیپ ڈرائیو کرتے ہوئے پسل کا لبادہ لئے

تیسری بار جب میں یہاں تم سے جدا ہوئی تو میں نے اسے اپنی آنکھوں سے دیکھا گو کہ میں اسے محض ایک چمکتے سراپا ہی کی صورت میں دیکھ سکی تھی‘ مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی ندامت محسوس نہیں ہو رہی کہ اپنی پوری ماورائی قوت استعمال کرنے کے باوجود اسے نہیں دیکھ سکی۔ شاید اس لئے کہ اس کے پیچھے بھی کوئی لافانی قوت کا ہاتھ ہے۔

چوتھی بار تب دیکھا جب چڑیل اژدہان کر تم سے لپٹنے والی تھی اور میرا شبہ یقین میں تب بدلا جب تم زمین سے اٹھا کر جیپ پر کھڑے کر دیئے گئے۔ تم پر بچھوؤں کا خوف اسی لئے اعصاب شکن ثابت ہوا کہ وہ‘ جسے تم آتشی مخلوق میں سے سمجھ رہے ہو‘ تمہارے وجود میں نہ تھی۔ تمہارا سکتہ اسی وقت ٹوٹا جب وہ تمہارے وجود میں داخل ہو کر تمہارے دل و دماغ پر چھا گئی۔ اور اب گو کہ ہنوز سورج موجود ہے‘ تمہارے لئے گرما گرم کھانا اسی کا لایا ہوا ہے......“

”آپا......“ میں کھانے سے فارغ ہوتے ہوئے بولا۔ ”اب تو مجھے بھی یقین ہو گیا کہ میری ناگن بہن بھی بہت ہی طاقتور ہے۔ خیر ہٹایئے اس بحث کو‘ اب آپ میری رہنمائی کریں کہ پنڈت دھیراج کی پاتال کہاں ہے......“

”اوکے میرے بھائی۔ جیپ کو یہیں رہنے دیں اور میرے ساتھ چلیں۔ دھیراج کی پاتال یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے......“ کہتے ہوئے میری ناگن بہن ناگن ہی کی طرح بل کھاتی ہوئی جیپ سے اتر پڑی اور میں بھی اپنا کوڑا اٹھا کر جیپ سے اتر پڑا۔



شام کے سرمئی سائے تیزی سے سیاہی پانے میں مصروف ہو گئے تھے۔ گو کہ دائیں بائیں اور آگے پیچھے درختوں کا سلسلہ برقرار تھا مگر گنجان نہیں تھا۔ آسمان پر تیرتے پرندے اپنے آشیانوں کی جانب لوٹ رہے تھے اور سردی میں بے پناہ اضافہ ہو چکا تھا۔ آہستہ آہستہ کہر بھی اٹھنے لگی تھی۔ گویا خنکی پر بھیگا موسم حاوی ہو رہا تھا۔

میری ناگن بہن میرے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ اسے رتی برابر بھی سردی نہیں لگ رہی تھی جب کہ میرے جبڑے بھنچے جا رہے تھے۔ پھر خاور مشرق کے مغرب میں

روپوش ہونے تک ہم ایک ایسے مقام پر پہنچ کر رک گئے جہاں زمین پر حد نظر تک چھوٹے بڑے کنکر بکھرے ہوئے تھے اور نظروں کے سامنے پن چکی نما ایک بڑی سی چرخی لگی ہوئی تھی۔ چرخی کا ستون زمین میں دھنسا ہوا تھا اور ستون سے منسلک چرخی زمین سے تقریباً چار فٹ اونچی تھی۔

"وصی بھائی' آگے بڑھو اور اس چرخی کو زمین کی طرف گھماؤ حالانکہ یہ چرخی آٹھ آدمی مل کر بدقت تمام گھماتے ہیں لیکن چونکہ آتشی مخلوق تمہارے ساتھ ہے' اس لئے تم اکیلے ہی اسے بڑی آسانی سے گھما سکو گے۔

چرخی کے قریب تم جو سوراخ دیکھ رہے ہو یہ میرا بنایا ہوا ہے میں اس سوراخ کے ذریعے پاتال میں پہنچوں گی......"

ناگن بہن کی آواز کے بند ہوتے ہی میں چرخی کے قریب پہنچ گیا اور چرخی چھونے سے پہلے مڑ کر دیکھا تو ناگن بہن غائب ہو چکی تھی۔ وہ یقیناً اپنا اصل روپ دھار کر سوراخ کی طرف بڑھ گئی ہوگی۔

بہر حال میں نے کوڑا اپنی کمر کے گرد لپیٹ لیا اور دونوں ہاتھوں سے چرخی کا ایک پر تھام کر زمین کی طرف جھکانا شروع کر دیا۔

حقیقتاً مجھے زیادہ زور نہیں لگانا پڑا تھا۔ جوں جوں میں چرخی گھماتا رہا' مجھے یہ دیکھ کر انتہائی تعجب ہوا کہ چرخی سے صرف چند فٹ دائیں جانب کی زمین کا کچھ حصہ کسی بہت بڑے صندوق کے ڈھکن کی طرح اٹھنا شروع ہو گیا۔

چونکہ اندھیرا بالکل ہی گہرا نہیں ہوا تھا' اس لئے میں اٹھتے ہوئے زمینی ڈھکن کو باآسانی دیکھ سکتا تھا۔

دوسری وجہ یہ کہ جوں جوں ڈھکن اٹھتا رہا' آگ کی سی سرخی سے سامنے والا حصہ روشن ہوتا چلا گیا۔

جب میں نے محسوس کیا کہ زمین کا ڈھکن اس قدر اٹھ چکا ہے کہ میں رکوع کے بل جھکا ہوا باآسانی اندر داخل ہو سکتا ہوں تو میں نے چرخی گھمانی چھوڑ دی اور بڑی تیزی سے

خلاء کی طرف بڑھ گیا۔

جونہی میں خلاء کے قریب پہنچا' سرخ روشنی میں نہا گیا اور اندرونی منظر دیکھتے ہی انگشت بدنداں رہ گیا۔

زمین سے اوپر تک کوئی چار فٹ کی خلاء پڑ چکی تھی۔ لمبان اتنی تھی کہ ایک فوجی ٹرک دائیں بائیں ٹکرائے بغیر باآسانی اندر داخل ہو جائے۔

ایک حیرت انگیز واقعہ یہ بھی تھا کہ جوں جوں زمین کا ایک مخصوص حصہ صندوق کے ڈھکن کی طرح اٹھا تھا' ڈھکن کے اوپر سے تمام چھوٹے بڑے کنکر لڑھکتے ہوئے گر جانے چاہئیں تھے لیکن ایک کنکر بھی نہ تو لڑھکا اور نہ ہی اپنی جگہ سے ہٹا تھا۔

خلاء کے اندر معمولی سی ڈھلان کے بعد ایک وسیع و عریض گودام سا نظر آیا۔ وہاں ایک طرف اوپر تلے آٹھ دس بوریاں رکھی ہوئی تھیں۔ میرا اندازہ تھا کہ ان بوریوں میں اناج ہی ہوگا۔

گودام کے وسط میں ایک ہینگر نما ستون سا بنا ہوا تھا جس کی کھونٹیوں سے چار بڑے فانوس روشن تھے اور انہی فانوسوں کی روشنی باہری حصے کو روشن رکھے ہوئے تھی۔

ہال نما کمرہ بالکل خالی تھا للذا میں کسی تشویش کے بغیر اندرونی ڈھلان پر پہنچ گیا۔ ڈھلان ایسی نہ تھی کہ ڈس بیلنس ہو جائے۔ دو چار قدم اترنے کے بعد سطح زمین پر پہنچا جا سکتا تھا اور میں پہنچ گیا۔ ساتھ ہی میرے ذہن پر خطرے کا احساس بھی بڑھ گیا۔ میں نے نہ صرف یہ کہ کمر کے گرد لپٹا ہوا ہنٹر کھول لیا بلکہ دوسرے ہاتھ میں ریوالور بھی پکڑ لیا تھا۔

ابھی مجھے ہال کا جائزہ لیتے ہوئے چند ہی لمحے گزرے تھے کہ میں نے فانوسوں والے قد آدم ستون کو الٹا گھومتے ہوئے دیکھا۔ میں سمجھ ہی نہیں پایا تھا کہ اچانک میرے پیروں تلے کی زمین نہ جانے کہاں نکل گئی۔

بے ساختہ میرے لبوں سے زوردار کراہ نکل گئی اور میں حقیر سے کنکر کی طرح گہرائی میں ڈوبتا چلا گیا۔ خلاء کی صرف ایک جھلک دیکھ سکا تھا۔ خلا از خود بند ہو چکی تھی۔

میں نے اپنے بچاؤ کے لئے یا خود کو گرنے سے روکنے کے لئے دائیں بائیں خوب ہاتھ

مارے' اس غیر ارادی کوشش میں میرے ہاتھ سے ریوالور بھی چھوٹ چکا تھا۔ اب میرے ہاتھ میں صرف کوڑا تھا اور میرے اطراف میں قبر کا سا اندھیرا تھا۔

اچانک اندھیرے چھٹ گئے اور میرا گہرائی میں گرنا موقوف ہو گیا میں معلق کا معلق رہ گیا۔

اب میں حیرت بھری نظروں سے صرف چار فٹ نیچے کے مناظر دیکھتا رہ گیا۔ یہ بھی ایک بڑا سا ہال تھا' میرے عین قدموں کے نیچے ایک چوڑے سے گول کھڈ میں سلگتے ہوئے لبالب بھرے کوئلے تھے۔ ہال میں چاروں طرف بڑے بڑے روشن فانوس لٹکے ہوئے تھے۔ ایک طرف کولتار کی طرح سیاہ کالی مائی کا بڑا سا مجسمہ نصب تھا۔ وہ ایک ٹانگ اٹھائے کھڑی تھی اس کی لمبی چوڑی زبان منہ سے باہر نکلی ہوئی تھی جو تازہ خون کی طرح سرخ تھی۔ ایسی ہی سرخی اس کی آنکھوں سے ٹپک رہی تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں تیز کرانتی اور دوسرے ہاتھ میں کسی انسان کا پتھریلا کٹا ہوا سر تھا۔ اس کے تیسرے ہاتھ میں کوئی مہیب سا جانور تھا جو نہ کتا لگا اور نہ ہی بھیڑیا' ویسے اس کی بناوٹ کسی طرح لگڑ بھگے سے مختلف نہ تھی اور اس کے چوتھے ہاتھ میں ترشول تھا۔

حیرت انگیز منظر یہ تھا کہ اس کے ناک کے نتھنوں سے مختلف رنگ کے چھوٹے بڑے سانپ نکل نکل کر اسی کے منہ میں داخل ہو رہے تھے۔ کالی کا مجسمہ پتھر کی جس چوکی پر نصب تھا اس پر انسانی یا حیوانی خون کے لوتھڑے سے جمے ہوئے تھے۔

اس کے علاوہ ہال کی روشن وسعتوں میں سوائے خوف کے کچھ بھی دکھائی نہ دیا۔

اصولاً ایسا ہیبت ناک منظر دیکھ کر فرط خوف سے میری گھگھی بندھ جانی چاہیئے تھی مگر میرے دل و دماغ پر دور دور تک خوف کا شائبہ تک نہ تھا بر عکس اس کے میں صرف حیرت زدہ تھا۔

میری حیرت کی انتہا یہ بھی تھی کہ میں سلگتے کوئلوں سے صرف چار فٹ کی بلندی پر لٹکا ہوا تھا۔ اب ضروری ہو گیا تھا کہ میں اپنا جائزہ لوں۔ یہی سوچ کر میں نے جیسے ہی اپنے سراپے پر نظر ڈالی' بے ساختہ میرے لبوں سے اطمینان کی سانس نکل گئی۔ میں نے گردن

موڑ کر دیکھا تو دروازے نما خلاء میں میری ناگن بہن کھڑی ہوئی مسکرا رہی تھی' حالانکہ درمیانی فاصلہ کسی طرح بیس فٹ سے کم نہ تھا۔ اس کا دایاں ہاتھ بلند تھا اور وہی ہاتھ بے تحاشا لمبا ہو کر میری کمر کے گرد حائل تھا۔ گویا ناگن بہن ہی نے مجھے آگ میں گرنے سے بچا لیا تھا۔ مسکراتی ناگن بہن کو دیکھتے ہی میں کچھ کہنا چاہتا تھا کہ میرا مقصد جانتے ہوئے اس نے فوراً ہی اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ لی۔ خاموش رہنے کا اشارہ کر دیا۔

چند ہی لمحوں بعد میری بہن کا بازو سکڑ گیا اور میں ہوا کے جھونکے کی طرح اس کے قریب جا کھڑا ہوا۔ اس وقت میں نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ ناگن بہن نے اپنا ہاتھ میرے سامنے کر دیا۔ اس کی ہتھیلی پر جلی حروف لکھے تھے۔

''میرے بھائی۔ جب تک میں آواز سے نہ بولوں' تم کو خاموش ہی رہنا ہے۔ آؤ میرے ساتھ ......''

وہ اپنا ہاتھ کھینچ کر دروازے نما خلاء میں داخل ہو گئی اور میں اس کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ یہ ایک لمبی سرنگ تھی جس کے بائیں جانب فاصلہ در فاصلہ دروازے بنے ہوئے تھے جو بند تھے' کہیں کوئی دراڑ اور خلاء بھی نہ تھی کہ اندرونی مناظر دیکھے جائیں۔

پوری سرنگ روشن تھی۔ دروازوں کے سامنے دیواروں سے روشن فانوس اڑسے ہوئے تھے۔

پہلے دروازے پر ہی ناگن بہن رک گئی اور میری طرف تکتے ہوئے مجھے دروازے پر پیر سے شدید ضرب لگانے کا اشارہ دیا۔

چونکہ سرنگ کی چوڑان محض چار فٹ تھی اس لئے میں جیسے ہی پیچھے ہٹا' میری پیٹھ فانوس والی دیوار سے جا لگی۔ یہاں یہ بتلانا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ تین چار منٹ گزرتے ہی میرا جسم پسینے سے شرابور ہو چکا تھا۔ میری سانس بھی گھٹنے لگی تھی' فانوسوں کے تیل کی بو اور بودار دھوئیں کے باعث سانس لینا دوبھر محسوس ہونے لگا۔ میں نے سوچا اگر مزید چند منٹ بھی گھٹن آمیز سرنگ میں رہا تو بالضرور بے ہوش ہو جاؤں گا۔ یہ بھی خالی از امکان نہ تھا کہ کبھی ہوش ہی نہ آئے۔

حاصل کلام میں نے پیچھے ہٹ کر دروازے پر ایک زوردار ٹھوکر رسید کر دی' بہت ہی تیز قسم کا کڑاکا ہوا اور کواڑ ٹوٹ کر زوردار دھماکے سے اندرونی جانب جا گرا۔ میری نظروں کے سامنے ایک عبرتناک شیطانی منظر ظاہر ہو گیا جسے دیکھتے ہی میرے حلق سے بھیڑیئے کی سی غراہٹ نکل گئی۔ فرط غضب سے میں اس قدر مدہوش ہو گیا کہ مجھے یہ بھی احساس نہ ہو سکا کہ ناگن بہن ناگن کا روپ دھار کر کسی طرف رینگ گئی ہے۔

تین بھاری بھرکم مرد' جن کے سر منڈھے ہوئے تھے مگر ان کے سر کے پشتی جانب گوندھے ہوئے بالوں کی لمبی لمبی چوٹیاں تھیں' وہ مادر زاد برہنہ تھے' ان کے نیچے تین جوان العمر عورتیں وہ بھی مادر زاد برہنہ تھیں' کڑاکے دار آواز سن کر' شیطانی کھیل میں مصروف تینوں موٹے افراد شدید خوف سے کراہتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ میں بھیڑیا بن چکا تھا للذا بھیڑیئے ہی کی طرح غراتے ہوئے اپنے لانگ چرمی شوز سے خنجر کھینچ کر جھپٹ پڑا۔

فرط خوف سے تھر تھر کانپتے ہوئے موٹے کو اس کی چٹیا سے پکڑا' ایک جھٹکے سے اس کا سر پیٹھ کر طرف جھکا کر اس کے ابھر جانے والے نرخرے پر خنجر پھیر دیا۔

فی الفور اسے خرخراتا چھوڑ کر میں دوسرے کی طرف لپکا ہی تھا کہ میرے بڑھتے قدم رک گئے۔ وجہ یہ تھی کہ بقیہ دونوں ننگے موٹے اکھڑی ہوئی سانسیں لے رہے تھے۔ بڑے ہی کربناک طریقے پر اپنے نرخرے اور سینے سہلا رہے تھے' ان کے ہونٹوں کے گوشوں سے جھاگ نکل رہی تھی اور چہرے اندرونی شدید کرب کی نشاندہی کر رہے تھے' ان دونوں اجل رسیدہ گنجوں کے درمیان پھن کاڑھے' کنڈلی لگائے میری ناگن بہن بیٹھی تھی۔

''کی ناں ہے تہاڈا......'' سکوت پاتے ہی میں نے عورتوں سے پوچھا۔ تینوں موٹے تڑپ تڑپ کر ٹھنڈے پڑ چکے تھے جسے میں نے ذبح کر دیا تھا' اس کا خون زمین پر بچھی ہوئی چٹائی پر پھیلا ہوا تھا۔ تینوں عورتیں لباس پہن چکی تھیں۔ لباس بالکل سادہ سے تھے۔ تہمد' کرتا' دوپٹہ اور فل آستین کے اونی سوئٹرز پر مشتمل۔

ناگن بہن غائب ہو چکی تھی۔ تینوں عورتوں کے چہروں پر تینوں زانی لوگوں کے لئے نفرت' شرم و حیا اور ندامت کی ملی جلی کیفیات رقصاں تھی۔

سلوچنا' معصومہ' سادھنا۔ تینوں نے اپنے نام ہتلا دیئے اور میرے پوچھنے پر اپنی اپنی ولدیت گاؤں کے نام اور اغواء کی داستان سنادی۔ سب کچھ جان لینے کے بعد میں نے اپنے تئیں ایک خوفناک فیصلہ کر لیا مگر اس پر عمل کرنے سے پہلے مجھے تعجب ہوا کہ دروازہ ٹوٹنے کی آواز پر اور میری گفتگو پر ہنوز کوئی ردعمل ظاہر کیوں نہیں ہوا جب کہ ناگن بہن مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کرتی رہی تھی۔

ابھی میں اپنے سوال کا جواب بھی نہیں ڈھونڈھ پایا تھا کہ اچانک انسانی روپ میں ناگن بہن دروازے سے اندر داخل ہوئی۔ تینوں لڑکیاں ناگن بہن پر نظر پڑتے ہی متاثر کن انداز میں چونک پڑیں۔

"یہ میری بہن سلیمہ ہے۔ بہت بہادر بہن......" میں نے تعارف کروا کر تینوں کی حیرت ختم کر دی۔

"وصی الدین ویرا' مزید کچھ کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ ان تینوں لڑکیوں کو یہاں سے نکال لیا جائے......"

"میں بھی یہی کچھ سوچ رہا تھا آپا جی......" میں نے بظاہر مسکرا کر جواب دیا حالانکہ میرا ذہن الجھ کر رہ گیا تھا۔ میری سمجھ ہی میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں۔

"تو پھر وقت کیوں ضائع کر رہے ہو؟ آگے بڑھو اور دائیں کونے میں رکھے ہوئے صندوق کو کھول کر چرخی گھما دو......"

بے ساختہ میرے لبوں سے اطمینان کی طویل سانس نکل گئی۔ میری ناگن بہن نے میری بہت بڑی مشکل حل کر دی تھی۔

اس موقع پر وضاحت کر دوں کہ زیر قدم کمرے میں نہ حبس تھا اور نہ ہی گھٹن تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ کمرے میں تین طرف زمین سے کوئی دس فٹ کی بلندی پر فاصلہ در فاصلہ چھ روشندان سائز کی خلائیں بنی ہوئی تھیں اور حیرت انگیز طور پر یہ خلائیں ایئر

کنڈیشنر کا نعم البدل ثابت ہوئی تھیں۔

ہاں تو میں صندوق کے قریب پہنچ گیا۔ ڈھکن اٹھا کر دیکھا تو جیپ یا کار سائز کا اسٹرنگ وہیل نظر آیا۔ میں نے جیسے ہی اسے گھمایا' دیوار میں دروازے نما ایک خلاء پڑ گئی۔ خلاء روشن تھی اور اس میں زینے نظر آئے۔

''چلو لڑکیو' سردی سے بچنے کے لئے ایک ایک کمبل اٹھالو......'' میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی ناگن بہن ان سے مخاطب ہو گئی۔

ذرا سی دیر میں ہم زینے چڑھتے ہوئے اسی ہال کمرے میں پہنچ گئے جہاں اناج کی بوریاں رکھی تھیں جہاں سے میں گہرائی میں گرا تھا۔

''سنو لڑکیو۔ ہماری واپسی تک یہیں رہو گی۔ سو جانا چاہو تو بے خطر سو جاؤ لیکن خبردار' یہ جو سرخ لکیر سی زمین پر دیکھ رہی ہو' اسے پار کرنے کی حماقت نہ کرنا ورنہ جل کر کوئلہ بن جاؤ گی......'' ناگن اس طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی جہاں سے ہال کا واحد خارجی و داخلی راستہ تھا جہاں سے میں گرا تھا۔

تینوں لڑکیوں کو ہر طرح کا اطمینان دلانے کے بعد ہم خلاء سے زینوں پر اترتے چلے گئے ناگن بہن میرے پیچھے پیچھے تھی۔

ابھی میں نے نصف زینے ہی عبور کئے تھے کہ میرے دماغ پر خطرے کی گھنٹی بج اٹھی۔ میں فی الفور مڑا مگر ناگن بہن غائب ہو چکی تھی خود کو بالکل تنہا پا کر میں ضرورت سے زیادہ محتاط ہو گیا اور ہر قسم کے خطرے کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہو گیا۔

ابھی میں تین چار زینے مزید اترنے پایا تھا کہ میری سماعت سے گہری گہری سانسوں کے ساتھ چپڑ چپڑ کی آوازیں بھی ٹکرائیں۔ مجھے کوئی خوف محسوس نہیں ہوا' تاہم کوڑے کو کمر سے کھینچ کر میں لاپرواہی سے زینے عبور کر کے نیچے پہنچ گیا۔

کمرے کا منظر دیکھتے ہی میرے دل و دماغ پر آندھیاں سی اٹھ کھڑی ہوئیں میرا پورا وجود ایک لمحہ کے لئے بید مجنوں کی طرح تھر تھرا کر رہ گیا۔

ظالم و جابر چوہدری نظام اینڈ سنز نے اطراف کے تمام پنڈوں سے چکوال تک بربریت کی ان مٹ داستانیں قائم کر رکھی تھیں۔ لوگوں کی جائیدادیں ہتھیا لینا' جوان عورتوں کی عزت و زندگی کی بھینٹ چڑھانا اور احتجاج کرنے والوں کو ان کے خاندان سے غائب کر دینا اس کی پہچان بن چکا تھا۔ اسی طرح اس نے وصی الدین چغتائی کے قابل احتجاج افراد کو قتل کروادیا اور اس کی منقولہ و غیر منقولہ جائیداد پر قابض ہو گیا۔

جرات مند' بہادر اور غیور نوجوان جب جنگ عظیم کے خاتمے کے بعد وطن لوٹا تو اسے اپنے پیاروں کی مظلومیت کا علم ہوا۔ وہ بھوکے شیر کی طرح دہاڑتا ہوا' انسانوں اور غیر انسانی قوموں کو روندتا ہوا ڈھوک تالیاں پہنچ گیا اور ڈھوک تالیاں کے جنگلات پر قابض زندہ انسانوں اور بدروحوں سے ٹکراتا ہوا پنڈت دھیراج اگھوری کی پاتال میں داخل ہو گیا۔ گنز انامی ایک جنی اور ایک شیش ناگن اس کی بھرپور رہنمائی اور مدد کرتی رہیں۔



پنڈت دھیراج کے پاتال سے تین اگھوریوں کو قتل کر کے اس نے تین معصوم لڑکیوں کو رہائی دلادی اور انہیں محفوظ مقام پر چھوڑ کر جب وہ دوبارہ پاتال میں پہنچا تو ایک روح فرسا منظر اس کا منتظر تھا۔ اب آپ آگے پڑھئے......

☆☆☆

وہ تین تھیں' بالکل ہی برہنہ۔ ان کے جسم تپے ہوئے تانبے کی طرح سرخ تھے۔ وہ ایک گھٹنا زمین سے ٹیکے اور دوسری ٹانگ موڑے لاپرواہی سے بیٹھی تھیں۔ ان کے سر کے بال اس قدر لمبے اور سیاہ تھے کہ پیٹھ اور کولہے کے کچھ حصوں کو ڈھانپتے ہوئے زمین کو چھو رہے تھے۔

ہر ننگی عورت ایک ایک گنجے پجاری کی لاش سے چمٹی ہوئی تھی۔ ان کے ہاتھوں کے ناخن کافی لمبے اور نوکیلے تھے اور خون و گوشت کے ذرات سے لتھڑے ہوئے تھے۔

وہ سسک رہی تھیں جیسے کوئی بپھرا ہوا بھینسا پھنکار رہا ہو۔ وہ لاشوں کے جسم سے گوشت ادھیڑ کر چپڑ چپڑ کی آوازوں سے کھانے میں مصروف تھیں۔

تینوں لاشوں کی آنکھوں کی جگہ ہیبتناک گڑھے نظر آ رہے تھے وہ لاشوں کے دل پھیپھڑے اور گردے کھا چکی تھیں۔ یہ میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ لاشوں کی ہڈیاں دکھائی دے رہی تھیں پیٹ کھلے ہوئے اور آنتیں بکھری ہوئی تھیں۔

آدم خور یا مردہ خور عورتوں کو میری موجودگی کی خبر یا پرواہ بھی نہیں تھی۔

چونکیں تو وہ اس وقت جب ہر ایک کے سر پر چکراتی ہوئی چمگادڑیں سماعت شکن چیخوں کے ساتھ میرے طرف لپکیں۔

اف میرے خدا۔ آدم خور عورتوں کے چہرے دیکھ کر خوف کی ایک شدید لہر سی میری وجود میں دوڑ گئی۔

وہ تینوں چڑیلیں تھیں۔ ان کے خون اور گوشت سے لتھڑے ہوئے منہ سے مگرمچھ کے دانتوں کی طرح لمبے لمبے دانت بڑے سے بڑے دل گردے والے انسان کی موت کا باعث بن سکتے تھے۔ ان کے چہرے کے نقوش بھی بے ہوئے تھے اور ان کی آنکھیں دہکتے انگارے بنی ہوئی تھیں۔

انہیں دیکھتے ہی میرا ذہن بھک سے اڑ گیا لیکن ' ایک لحہ کے چوتھے حصے میں میری تمام صلاحیتیں بیدار ہو گئیں۔

چمگادڑوں کی طرف سے میں اس لئے مطمئن ہو چکا تھا کہ فضاء میں بیک وقت آگ کے دو لمبے اور پھیلے ہوئے شعلے معلق ہو چکے تھے اور آگ کی لپٹوں سے بچنے کے لئے ساری چمگادڑیں احتجاج کرتی ہوئی ٹوٹے ہوئے دروازے والی خلاء سے سرنگ میں غائب ہوتی جا رہی تھیں۔

لہٰذا سب سے آگے والے ڈائن اٹھ کھڑی ہوئی اس نے اپنے جبڑے اس قدر پھیلا دیئے کہ گھوڑے کا پورا سر اس میں سما جائے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ایک طویل اور ہیبتناک چیخ ماری۔ اگر یہی چیخ اس نے کھلے میدان میں ماری ہوتی تو بالیقین کئی فرلانگ دور تک کا ماحول دہشتناک ہو گیا ہوتا۔ میرا اندازہ تھا کہ ان طرح اس نے اپنی مسرت کا اظہار کیا تھا۔

وہ اپنی دونوں باہنیں پھیلائے میری طرف لپکی‘اس کے نسوانی نشیب و فراز میری خرمن حیات پر بجلیاں سی گرانے لگے تھے‘ میرے جذبات میں بھونچال سا آگیا تھا مگر‘ میری حفاظت پر مامور اندرونی قوت آن واحد میں میرے جذبات کو سرد کر گئی۔

فی الفور میرا کوڑا حرکت میں آگیا اور شپاک کی کریہہ آواز سے ڈائن کی ننگی کمر کے گرد لپٹ گیا۔

ٹھیک اسی لمحے دو ڈائنیں بھی فلک شگاف غیر انسانی آوازیں نکالتی ہوئی میری طرف لپکی تھیں۔

جونہی میرا کوڑا پہلی ڈائن کی کمر سے لپٹا‘ ویسی ہی تیز ترین آواز ابھری جیسے کھولتے سیال پر پانی پھینکنے سے ابھرتی ہے لیکن ڈائن کے خوفناک کھلے ہوئے منہ سے نکلنے والی چیخ پہلی آواز پر حاوی ہو گئی۔

فی الفور میں نے بھرپور قوت سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا‘ ننگی ڈائن کا لنگر زمین سے اکھڑ گیا اور وہ اچھل کر زبردست دھماکے سے دیوار سے ٹکرا گئی۔

یہ سب کچھ ایک لمحہ میں ہو چکا تھا۔ میں اپنا کوڑا کھینچ کر بقیہ دونوں ڈائنوں پر ضرب لگانے کے لئے تیار ہی ہوا تھا کہ ایک ان ہونا منظر دیکھ کر ٹھٹک گیا۔

میں نے دیکھا‘ جس ڈائن کو میں نے کوڑے کی مدد سے دیوار سے ٹکرایا تھا‘اس کا سر دیوار سے ٹکرا کر سینکڑوں ٹکڑوں میں بدل گیا اور دھب سے زمین پر گرنے کے بعد بقیہ جسم کسی موم کی طرح پگھلنے لگا تھا۔

اس طرف سے نظریں پھیریں تو بقیہ دو ڈائنیں میرے کوڑے کی رینج میں پہنچنے سے پہلے ہی اپنے ہاتھوں سے اپنا گلا دبائے‘ چہرہ چھت کی طرف اٹھائے بدمست شرابی کی طرح ڈولنے لگیں۔ ان کی تیز تر خرخراہٹیں بھی مدھم پڑنے لگیں اور پیروں کی طرف سے ان کے جسم کا گوشت از خود جھڑنے لگا اور اس قدر کریہہ بدبو اٹھنے لگی کہ مجھے سانس لینے میں بھی شدید دشواری محسوس ہوئی۔ میرا دل چاہا کہ کمرے سے سرنگ کی طرف دوڑ لگا دوں مگر اس احساس نے مجھے روکے رکھا کہ صندوق والی چرخی گھما کر مجھے

زینوں والی خلاء بند کرنی ہے۔

☆☆☆

بہت ہی ہولناک منظر تھا۔ پہلی والی چڑیل بالکل سیال بن کر فرش پر پھیلی ہوئی تھی اور بقیہ دو چڑیلیں ڈھانچہ بنی اپنے ہی بدبودار سیال میں بے حس و حرکت پڑی تھیں۔

دوسری طرف تین گنجوں کی ادھڑی ہوئی لاشیں پڑی تھیں جنہیں ایک نظر دیکھتے ہی ابکائی سی آنے لگے۔

پورے کمرے پر ابدی سکوت چھایا ہوا تھا اور میں پتھرائی ہوئی نظروں سے کمرے کے ہولناک مناظر کو تک رہا تھا۔ ممکن ہے میری یہ کیفیت میرے لئے کسی حادثے کا باعث بنتی کہ اچانک ناگن بہن کے ہاتھ کا لمس اپنے کندھے پر محسوس کرتے ہی میں چونک پڑا۔ ساتھ ہی ناگن بہن کے لباس سے ایسی سرور آور خوشبو میرے نتھنوں سے ٹکرائی کہ میں پوری دلچسپی سے اپنی سانس کو کھینچتا رہ گیا۔

"کہاں کھو گئے وصی بھائی؟......" ناگن بہن کی جلترنگ بجاتی آواز سن کر میں مسکرا دیا۔ وہ سراپا قد میرے ساتھ کھڑی تھی۔

"آپا جی۔ میں حیران ہوں کہ یہ...... یہ چڑیلیں ڈھانچہ کیونکر بنیں جب کہ میں نے ان پر کوڑا بھی نہیں چلایا......"

"سیدھی سی بات ہے ویرا۔ میں نے دو پجاریوں کو ڈسا تھا۔ للذا میرا زہر ان کے پورے وجود میں پھیل گیا تھا اور زہریلا گوشت کھانے سے یہ بدبخت اپنے انجام کو پہنچی ہیں......"

جواب گو کہ معقول تھا' تاہم میں الجھ رہا کہ زہر بدروحوں پر بھی اثر انداز ہو سکتا ہے۔

بظاہر مطمئن ہو کر میں صندوق کی طرف بڑھ گیا۔ چند لمحوں بعد جب اوپر جانے والا راستہ بند ہو گیا تو میں نے دوسرے صندوق کی طرف قدم بڑھا دیئے۔

"کہاں جا رہے ہو ویرا؟"...... ناگن بہن لپک کر میرے قریب پہنچتے ہوئے

بولی۔

"دوسرا صندوق چیک کرنا چاہتا ہوں آپا......" میں نے جواب دیا۔

"نہیں ویرا ابھی نہیں، ہم یہاں سے فارغ ہو جائیں گے تو میں خود آپ کو دوسرا صندوق کھولنے کی اجازت دوں گی......"

میں نے کوئی تعرض نہیں کیا۔ میں جان چکا تھا کہ ناگن بہن بھی خفیہ قوتیں رکھتی ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ آن واحد میں جون نہ بدل سکتی تھی۔

"لگتا ہے تمہیں میرے جواب سے اطمینان نہیں ملا......" وہ مجھے کھینچ کر سرنگ کے داخلی دروازے کی طرف بڑھتی ہوئی بولی۔ وہ خود بھی سیال سے بچ رہی تھی اور مجھے بھی بچنے کا اشارہ کئے جا رہی تھی۔

"ہاں آپا۔ میں واقعی میں مطمئن نہیں ہوا......"

آپا کے پیچھے پیچھے میں بھی کمرے کی وحشتوں سے نکل کر سرنگ کی سحرناک روشنی اور آسیبی ماحول میں پہنچ گیا تھا۔ میری رسٹ واچ میں شام کے ساڑھے سات بج رہے تھے۔

"او میرے بھولے ویرا۔ بات اصل میں یہ ہے کہ بدروحوں کا اپنا جسم نہیں ہوتا۔ وہ صرف روحیں یا بدروحیں ہوتی ہیں اور اس طرح بھٹکتی رہتی ہیں جس طرح تم نے چمگادڑ کو بھٹکتے دیکھا تھا۔ جس طرح چمگادڑیں ویران واجاڑ مقامات پر مسکن رکھتی ہیں، اسی طرح بدروحیں بھی اجاڑ و ویران مقام پر یا ناپاک جگہوں میں جا چھپتی ہیں اور جیسے ہی کوئی بھولا بھٹکا انسان ان کی جھپٹ میں آتا ہے وہ فوراً ان کے جسم میں داخل ہو جاتی ہیں یا پھر کوئی عورت یا مرد مر جائے اور بڑی دیر تک لاوارث پڑا رہے تو بھی بدروحیں اس کے جسم پر قابض ہو جاتی ہیں۔

یہ تینوں ڈائنیں بھی بالکل اسی طرح تین مظلوم و مقتول عورتوں کے جسم پر قابض ہو گئی تھیں۔

یہی وجہ ہے کہ تمہارے کوڑے نے ایک بدروح کو جہنم رسید کر دیا اور چونکہ

جسم اس کا اپنا نہ تھا اس لئے اس کا گوشت پوست بد بودار سیال بن کر بہہ گیا اور ڈھانچہ باقی رہ گیا۔

جن بقیہ دو ڈائنوں کے ڈھانچے بنے ان کے گوشت پوست کو میرے زہر نے پگھلا دیا تھا......"

"اف آپا۔ واقعی یہ تو سامنے کی بات ہے، مجھے سمجھ جانا چاہئے تھا۔ اب ایک بات مزید بتلا دیجئے......"

"ہاں ہاں پوچھو......" ناگن بہن پھر ایک بند دروازے پر رکتے ہوئے بولی۔

"وہ فانوس جو معلق تھے، جن کی سرخ زبانوں نے چمگادڑوں کو بھگایا تھا، آپ ہی نے......"

"ہاں بھیا۔ وہ میں نے ہی معلق کئے تھے......"

"اور ہاں آپا......" میں چونکتے ہوئے بولا۔ مجھے اچانک ہی ایک بھولی ہوئی بات یاد آ گئی تھی۔ "ہم جب پہلی بار سرنگ میں داخل ہوئے تھے تو آپ نے مجھے کوئی آواز نہ نکالنے کی اشارتاً تاکید کی تھی......"

"ہاں کی تھی۔ تو پھر......؟" ناگن بہن سوالیہ انداز میں بولی۔

"پھر یہ کہ کمرے میں انسانی اور غیر انسانی شور قیامت صغریٰ بنا ہوا تھا۔ دروازے ٹوٹنے کی آواز بھی پورے سرنگ میں بلکہ کالی کے مندر تک گونجی ہوگی ایسے میں کوئی رد عمل کیوں ظاہر نہیں ہوا......"

"رد عمل ظاہر تو ہوا تھا۔ بارہ چمگادڑیں اور تین ڈائنیں کمرے میں پہنچ تو گئی تھیں ــــ"

"میں انسانی رد عمل کہہ رہا ہوں آپا......" میں نے فوراً کہا۔

"ایک ہی وجہ سمجھ میں آتی ہے۔ وہ یہ کہ کمرہ نمبر ایک کے یہ حالات روز کا معمول ہوں گے اس لئے اس زیر زمین دنیا کے باسی اس کے عادی ہو چلے ہوں گے ہاں اگر نہیں روم نمبر ایک کے نگران ان [illegible] یوں کے بھیانک انجام کا شہرہ بھی نہ ہو جاتا تو میرے لئے

بہت کم اور تمہارے لئے بہت زیادہ پریشانیاں بڑھ جاتیں۔ اچھابس، اب اس دروازے کو توڑ دو۔

میں توڑنے کو اس لئے کہہ رہی ہوں کہ ہر دروازے پر ماورائی حصار قائم ہے اور یہ حصار کمروں میں مقیم زندہ انسانوں کی حفاظت کے لئے ہے......" ناگن بہن کی آخری باتیں میری سمجھ میں نہیں آسکیں اور میں نے دستور سابقہ پیچھے ہٹ کر اپنے زوردار پیر کی ضرب دروازے پر لگائی۔

چرچراہٹ کی تیز آواز کے ساتھ ہی دروازہ ٹوٹ کر اندر جا پڑا۔ ناگن بہن اس مرتبہ غائب نہ ہوئی تھی۔

اندرونی حصے میں سات دھوتی پوش پروہت موجود تھے۔ ان کا بقیہ اوپری جسم بالکل برہنہ تھا۔ وہ بھی ہٹے کٹے اور موٹے تھے۔ بیک وقت ساتوں انسان اس طرح اچھل کر غریق حیرت ہوگئے تھے جیسے میرے اور ناگن بہن کے روپ میں انہوں نے موت کے فرشتوں کو دیکھ لیا ہو۔

☆☆☆

بڑا کمرہ تھا۔ سازو سامان کے لحاظ سے مطبخ خانہ لگ رہا تھا۔ تین چولہے سلگ رہے تھے جن پر بڑی بڑی پیتل کی دیگچیاں رکھی گئی تھیں جن کے ڈھکن کی سائڈوں سے خوشبودار بھاپ بھی نکل رہی تھی۔ فرش پر آلو پیاز کے چھلکے وغیرہ پڑے تھے۔

"کک، کون ہیں آپ لوگ......" بدقت تمام ایک شخص بولا اس کے گلے میں موٹے دانوں کی مالا تھی اور دونوں کلائیوں میں لوہے کے رنگ تھے۔

"تمہاری طرح کے انسان ہیں۔ ہم دونوں بہن بھائی ہیں راستہ بھٹک گئے تھے کہ ہماری جیپ پر چند لوگوں نے حملہ کر دیا اور ہمیں گرفتار کر کے یہاں دھکیل دیا......" میں نے بات بنادی۔

"غلط۔ تم بالکل غلط کہہ رہے ہو......" تخاطب سنبھالا لیتے ہوئے بولا۔ اس کے دیگر ساتھی بھی بڑی حد تک سنبھل گئے تھے جب کہ ناگن بہن گرم گرم ڈھکن اٹھا کر

دیگچیاں چیک کر رہی تھی۔

"وہ کیسے ......" میں اسے خشمگیں نظروں سے تکتے ہوئے بولا۔

"وہ ایسے کہ ہمارے گرو کی اجازت کے بغیر یہاں کا کوئی پجاری باہر نہیں نکل سکتا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ جنگل کے تمام مزدور سوگ میں مبتلا ہیں۔ وہ بھی جاگیر دار کے حکم کے بغیر اپنے ڈیرے سے باہر نہیں نکلیں گے ......"

"وصی ویرا' تینوں دیگچیوں میں معصوم سے انسانی بچوں کا گوشت ہڈیوں سمیت پک رہا ہے ......" ناگن بہن بقیہ چھ پجاریوں کی پشت پر پہنچ کر بولی۔

بے ساختہ میرے حلق سے غراہٹ نکلی' اس کے ساتھ ہی میں نے جھپٹا مار کر تخاطب کے نرخرے پر پنجہ جما دیا۔ اس بدلتی صورت نے بقیہ چھ پجاریوں کو شدید خوف میں مبتلا کر دیا۔ وہ تھر تھر کانپنے لگے تھے جب کہ میری گرفت میں دبے ہوئے پجاری نے اپنے دونوں ہاتھ میری کلائی پر جما دیئے اور میری گرفت سے رہائی پانے کے لئے قوت صرف کرنے لگا۔

چونکہ اس کوشش میں وہ لڑکھڑاتا ہوا اپنے ساتھیوں کے قریب پہنچ چکا تھا اس لئے موقع غنیمت جان کر میں نے کوڑا اپنی گردن میں لپیٹ دیا اور اپنا بیلنس درست کر کے ایک پیر اٹھا کر لانگ شوز میں اڑسا ہوا خنجر کھینچ لیا۔

پھر بیک وقت ایک پجاری کے حلق پر خنجر پھیر دیا اور دوسرے کی کوکھ میں۔

اسی دوران ناگن بہن نے اپنا پنجہ سانپ کے پھن کی طرح اکڑا کر چار پجاریوں کی پیشانی پر ناخن مار دیئے تھے۔

پانچ منٹ کے اندر ساتوں پجاری جہنم واصل ہو گئے اور زمین پر دو پجاریوں کا خون بکھر چکا تھا۔

ان سے بے خبر ہو کر میں دیگچیوں کی طرف بڑھا' تینوں میں معصوم بچوں کے پنجے اور دیگر اعضاء کے ٹکڑے دیکھ کر میرے اوسان خطا ہو گئے۔ میرے دماغ پر گویا ہتھوڑے سے برسنے لگے تھے۔

ایک دردناک آہ کے ساتھ میں جیسے ہی مڑا' ناگن بہن نظر نہ آئی۔ میں ایک دم سے محتاط ہو گیا ناگن بہن کا اس طرح سے غائب ہو جانا اس بات کا ثبوت تھا کہ مجھے پھر سے بدروحوں سے واسطہ پڑنے والا ہے۔

فی الفور میں نے خون آلود خنجر کو ایک مردے کی دھوتی سے صاف کر کے لانگ شوز میں اڑسایا اور کوڑا گردن سے نکال کر برتنوں والی الماری کے پیچھے دبک گیا۔

ابھی میں اکڑوں بیٹھا ہی تھا کہ میری سماعت سے چند ملی جلی آوازیں ٹکرائیں۔ ان آوازوں میں کچھ ایسی دہشت و بربریت تھی کہ میرے پورے وجود میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ میں ویسے ہی پسینے میں شرابور ہو چکا تھا' اس پر ستم ان دہشت ناک آوازوں نے کر دیا۔ میرے ہر بن موسے پسینے کے سوتے سے پھوٹ پڑے۔ اس کے باوجود میری ذہنی صلاحیتیں بیدار تھیں۔ میں نے برتنوں کے درمیان کی دراڑ سے جھانکا اگر چولہے زمین پر رکھے نہ ہوتے' کسی بلند اسٹینڈ پر رکھے ہوتے تو شاید میں انہیں نہ دیکھ سکتا۔

وہ پانچ تھے' بظاہر ان کے چہرے مردے کی طرح بے جان اور سفید پڑے ہوئے تھے۔ ان کے جسم پر صرف کھدر کے کرتے اور لٹھے کی تہمدیں تھیں۔ چہروں پر جھریاں پڑی ہوئی تھیں۔ دونوں ہاتھ اس طرح سامنے کی طرف پھیلائے ہوئے تھے جیسے وہ اندھے ہوں حالانکہ ان کی آنکھیں سرخ زیرو والٹ کے بلب کی طرح سلگ رہی تھیں۔

ان کے منہ کھلے ہوئے تھے جن سے ان کے زرد دانت جھانک رہے تھے اور ان کے کھلے ہوئے منہ ہی سے ایسی آوازیں نکل رہی تھیں جیسے زمین پر زلزلہ آ گیا ہو۔

میں نے سانس تک روک لی تھی اور میرا دل اس تیزی سے اچھلنے لگا جیسے سینے کی ہڈیاں توڑ کر ابل پڑے گا۔

پانچوں زندہ مردے اس طرح قدم اٹھا رہے تھے جیسے انہیں کوئی دھکیل رہا

وہ اسی طرح لڑکھڑا کر چلتے ہوئے لاشوں کے قریب پہنچ کر دوزانو بیٹھ گئے۔

پھر اپنی زندگی کا ہولناک منظر دیکھ کر میرے وجود سے گویا جان ہی نکل گئی۔

پانچوں زندہ مردوں نے اپنے پنجے مردہ پجاریوں کے سینوں میں ڈبو دیئے اور جب کھینچے تو ان کی خون آلود مٹھیوں میں پجاریوں کے دل دبے ہوئے تھے۔

غوں غوں کی ہولناک آوازوں سے انہوں نے دل اپنے منہ میں رکھ لئے اور غرا غرا کر کھانے میں مصروف ہو گئے۔

یہ ایک ایسا ہی ہیبت ناک منظر تھا کہ میرے حق سے حذیانی چیخیں خارج ہو جاتیں کہ اچانک میرے منہ پر پوری قوت سے کسی نے ہاتھ رکھ دیا۔

وہ میری ناگن بہن تھی جو انکار والے انداز میں مجھے چیخنے سے منع کر رہی تھی۔

وہ میرے قریب ہی اکڑوں بیٹھی ہوئی تھی۔ اسے اپنے اس قدر قریب پا کر میرے اوسان بڑی تیزی سے بحال ہو گئے۔ ناگن بہن نے ایک بڑے ٹین کے طرف میری توجہ مرکوز کروائی اور ایسے اشارے دیئے جو بآسانی میری سمجھ میں آگئے اور میں اس پر عمل کرنے کی غرض سے بے آواز کھسکتا ہوا ٹین کے قریب پہنچ گیا۔

پھر ٹین کا کاک کھول کر اسے آہستگی سے زمین پر لٹا دیا۔ وہ مٹی کے تیل کا ٹین تھا اور اب اس کے سوراخ سے بے تحاشہ مٹی کا تیل نکل نکل کر بہنے لگا۔

اس دوران ناگن بہن زمین پر لیٹ کر کہنیوں اور گٹھنوں کے بل رینگتی ہوئی دروازے سے سرنگ میں چلی گئی۔

میں سمجھ گیا کہ ناگن آپا کیا کہنا چاہتی تھی۔ میں نے کوڑا محفوظ کیا اور آپا کی تقلید کر بیٹھا۔

اس دوران پانچوں زندہ مردے مرے ہوئے پجاریوں کے پھیپھڑے وغیرہ کھا لینے کے بعد ان کے پیٹ میں ہاتھ گھسیڑ چکے تھے اور مٹی کا تیل تقریباً پورے فرش پر پھیل چکا تھا۔

پھر ٹوٹے ہوئے دروازے کا ایک لمبا اور وزنی پھٹا اٹھا کر میں نے پوری مہارت سے چولہوں پر دے مارا۔

چولہے الٹ گئے' انگارے مٹی کے تیل پر گرے اور شعلے بھڑک اٹھے مگر ہم دونوں اندرونی منظر دیکھنے کے لئے ٹھہرے نہیں بلکہ سرنگ میں دوڑتے ہوئے آخری کمرے کے بند دروازے تک پہنچ گئے۔

اس دروازے کو توڑنے کی ضرورت پیش نہیں آئی کندھے کے تین جھٹکوں ہی میں اندرونی کنڈی ٹوٹ گئی اور دروازہ کھل گیا۔

☆☆☆

سامنے ہی آٹھ معصوم بچے دو جوان عورتوں سے چمٹنے کی ناکام کوشش میں مصروف دروازے کی جانب ہی تک رہے تھے۔ ان کے چہرے فرط خوف سے سفید پڑے ہوئے تھے اور پسینے کے موٹے موٹے قطرات سے لبریز تھے۔

انہوں نے اسکول یونیفارم یعنی نیوی بلو کلر کی نیکر اور آسمانی رنگ کی شرٹ پہنی تھی۔ پیروں میں سفید پی ٹی شوز اور گھٹنوں تک سفید اونی موزے چڑھے تھے۔

وہ فرط خوف سے سہمک رہے تھے اور تھر تھر کانپ بھی رہے تھے۔ ان کی آنکھیں گویا ابل رہی تھیں۔

دونوں جوان عورتیں بھی تھر تھر کانپ رہی تھیں۔ ان کے چہرے بھی خوف کی آماجگاہ بنے ہوئے تھے۔ وہ عام دیہاتی عورتوں کا لباس پہنے ہوئے اور بچوں کو اپنی بانہوں میں سمیٹنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ قبول صورت اور مناسب سا قد کاٹھ رکھنے والی دونوں جوان عورتیں بالخصوص مجھ ہی کو متوحش نظروں سے گھور رہی تھیں۔ جیسے مجھے بھوت پریت سمجھ بیٹھی ہوں۔

اس کے بعد میں نے اور ناگن آپا نے گفتگو میں ایسے نفسیاتی حربے استعمال کئے کہ دونوں لڑکیاں اور بچے ہم سے مانوس ہو گئے' ان کا تمام خوف مٹ گیا۔

دوران گفتگو معلوم ہوا کہ بچے پنڈ دادن خان کے سرکاری اسکول میں پڑھتے ہیں۔ تین بچے ڈھوک ٹالیاں ہی کے ہیں اور ساتھ بچے کنگر گاؤں کے ہیں۔

کنگر گاؤں سے آنے والے بچے وکٹوریہ میں جاتے ہیں ڈھوک ٹالیاں کے مین

روڈ سے مزید تین بچوں کو لفٹ دیتے ہیں۔ ان کے ہمراہ دونوں لڑکیاں اس وقت تک کھڑی رہتی ہیں جب تک تینوں بچے وکٹوریہ میں سوار نہ ہو جائیں۔

بمشکل ایک فرلانگ ہی وکٹوریہ پنڈ دادن خان کی طرف بڑھی تھی کہ وکٹوریہ کے اگلے پہیے کا ٹائر نکل گیا' بچے چیخ پڑے اور کوچوان گر پڑا۔

یہ آوازیں سن کر دونوں لڑکیاں وکٹوریہ کی طرف دوڑ پڑیں۔ گو کہ بچوں میں سے کسی کے خراش تک نہیں پہنچی تھی البتہ کوچوان کے سر پر شدید چوٹ پڑی تھی اور چوٹ کی جگہ سے خون بھی بہنے لگا تھا۔

اسی دوران ایک جیپ آ گئی' شاید وہ کنگر گاؤں ہی سے آ رہی تھی یا پھر ہو سکتا ہے کسی دوسرے گاؤں یا شہر چکوال سے لوٹی ہو۔

جیپ ڈرائیور کے ساتھ ایک شخص اور بھی تھا جو شکل و صورت اور لباس کے لحاظ سے جانا پہچانا لگا۔ اسی کے کہنے پر بلکہ بے حد اصرار پر بچے تو جیپ میں بیٹھ گئے اور ہمیں بھی بچوں کے ساتھ بیٹھ جانا پڑا تھا۔

وہ شخص جس نے حیلے بہانوں سے ہمیں بچوں کے ساتھ بیٹھنے پر اکسایا تھا' وہی کوچوان کی مدد کے لئے رک گیا تھا۔ پھر...... جیسے ہی جیپ نصف میل فاصلے پر پہنچی' ڈرائیور نے جیپ کا رخ جنگل کی طرف موڑ دیا اور ہمارے (دونوں لڑکیوں کے) احتجاج کے باوجود لمبا چکر کاٹ کر دریا کے قریب لے کر آ گیا۔

اس کے بعد ہمیں کچھ بھی یاد نہیں کہ کیا ہوا۔ ہماری جب آنکھ کھلی تو ہم اسی کوٹھی میں تھے اور دو بچے غائب تھے۔

لڑکیوں کے بیان کی روشنی میں' میں نے اندازہ لگایا کہ اگھوری جن انسانی اعضاء کو پکار رہے تھے وہ انہی دو بچوں کے رہے ہوں گے۔

بچوں کی عمریں چھ سات برس سے زیادہ نہ تھیں۔

حاصل کلام ہم دونوں لڑکیوں اور آٹھوں بچوں کو لے کر سرنگ میں داخل ہو گئے۔

سرنگ میں اس قدر دھواں اور بدبو تھی کہ بچے بے تحاشہ کھانسنے لگے اور منہ پر ہاتھ رکھے تیزی سے ہمارے پیچھے پیچھے چلتے رہے۔

جیسا کہ دھواں بہت گہرا تھا اس لئے کمرے کا منظر بھی دکھائی نہیں دیا جہاں میں نے مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگا دی تھی۔ صرف کریہہ ترین بدبو سے اندازہ ہوا کہ اندر سب کچھ جل چکا ہے آگ بھی لگی ہوئی تھی۔

ہم بڑی تیزی سے پہلے والے کمرے میں پہنچ گئے۔ ڈھانچوں پر نظریں پڑتے ہی بچے چیخ پڑے تھے مگر ہم دونوں بہن بھائی نے ان کی ڈھارس بندھائی۔

"ویرا...... میں ان سب کو لے کر اوپر پہنچتی ہوں' آپ دوسرا صندوق کھول کر اس کی چرخی کو بڑی تیزی سے گھما کر زینوں پر چڑھ جائیے گا۔

اس چرخی کو گھماتے ہی مندر میں کالی کا مجسمہ پاش پاش ہو جائے گا اور دریا کا پانی سیلاب کی طرح یہاں کی ہر جگہ کو بھر دے گا۔ یہاں کی ساری نگری پتھروں اور مٹی کے ڈھیر میں بدل جائے گی......"

مندرجہ گفتگو کے علاوہ بھی مجھے ناگن بہن نے بہت کچھ بتلایا تھا اس کی گفتگو ختم ہونے تک میں چرخی گھما کر زینوں والا راستہ کھول چکا تھا۔

ناگن بہن آٹھوں بچوں اور دو خواتین سمیت زینوں والی خلاء میں داخل ہو گئی۔

چند لمحے کے انتظار کے بعد میں دوسرے صندوق کی طرف بڑھتا چلا گیا۔



جیسے ہی ہم خیریت نیم میدانی حصے میں پہنچے' ٹھنڈی اور یخ بستہ ہوا نے ہر ایک کو سی سی کرنے پر مجبور کر دیا۔ جسم کپکپانے لگے اور دانت بجنے شروع ہو گئے۔

یہ تو اچھا ہوا کہ میں نے انڈر گراؤنڈ جادو نگری سے نکلنے سے پہلے روم نمبر ایک سے چار پانچ موٹے کمبل اٹھا لئے تھے ورنہ بچوں کا مارے سردی کے نہ جانے کیا حال ہو جاتا۔

ایک کمبل ان دو لڑکیوں نے ایک ساتھ لپیٹ لیا تھا جو بچوں کے ساتھ تہہ

خانے میں بند تھیں۔ بقیہ تین لڑکیاں سلوچنا' معصومہ اور سادھنا جن کی پجاریوں نے عصمت پامال کی تھی ایک ایک کمبل لپیٹے ہوئے تھیں۔

اب بھی ایک کمبل میرے کندھے پر رکھا تھا۔ یہ سوچ کر کہ جیسے ہی آٹھوں بچے میری جیپ میں بیٹھیں گے 'ان پر ڈال دوں گا۔

ہر سو سناٹا تھا اور اندھیرے کے دبیز پردے سے چھائے ہوئے تھے۔ ہو سکتا تھا کہ ستاروں کی روشنی میں نشیب و فراز نظر آجاتے مگر کہر اس قدر گہری تھی کی غوطے لگاتے چمگادڑ بھی دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ البتہ ہر چہار سمت حشرات الارض کی آوازیں ضرور سنائی دے رہی تھیں۔ ابھی میں بچوں کو سردی سے محفوظ کر کے فارغ ہی ہوا تھا کہ ایک ہلکا سا دھماکہ سنائی دیا۔ عورتیں اور بچے بری طرح گھبرا گئے تھے مگر میں نے اور ناگن آپا نے انہیں تسلی دی۔

ناگن آپا کے کہنے کے مطابق وہ پن چکی نما چرخی زمین بوس ہو گئی تھی جس کے ذریعے انڈر گراؤنڈ نگری میں داخل ہوا جا سکتا تھا۔

"یہ لو ویرا......" ناگن بہن کی آواز سن کر میں اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"یہ کیا ہے آپا؟......" میں نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

"تیرا پستول اور ایک فائل ہے۔ اس فائل کے مطالعے سے تمہیں علم ہو جائے گا کہ زمین کی گہرائی میں بنائی گئی پراسرار دنیا کس کی ملکیت ہے' اس فائل میں نقشہ بھی ہے اور جس نے بنوائی' جس نے بنائی اور جب بنوائی ان کے گروپ فوٹو اور تاریخ بھی درج ہے......"

میں نے فی الفور فائل کو اوور کوٹ تلے پہنے ہوئے سوئٹر میں محفوظ کر لیا اور ریوالور ہولسٹر میں اڑسا دیا۔

آٹھوں بچے اور پانچوں لڑکیاں جوں توں جیپ میں بیٹھ گئے میں نے باقی ماندہ کمبل بھی بچوں کو اوڑھا دیا۔

پھر' جیسے ہی میں نے جیپ اسٹارٹ کی' پہلی ہی کوشش میں انجن جاگ اٹھا۔ دو

ہی منٹ میں جیپ پگڈنڈی نمارستہ چڑھ کر سپاٹ زمین پر پہنچ گئی۔

جب جیپ ڈھوک ٹالیاں کی چیک پوسٹ پر پہنچی تو شب کے پونے دو بجنے والے تھے۔

جیپ کے انجن کی آواز پر ہی چند کانسٹیبل ہماری طرف دوڑ پڑے تھے۔ ہائی پاور جنریٹر نے نیچے اوپر پوری عمارت کو روشن رکھا تھا یہ علیحدہ بات ہے کہ کہر کی وجہ سے روشنی کا پھیلاؤ محدود ہو کر رہ گیا تھا۔

مجھ پر نظر پڑتے ہی پانچوں کانسٹیبل کھٹاک سے ایڑیاں بجا کر اٹینشن ہو چکے تھے۔ وہ میری جیپ میں سوار پانچ عورتوں اور آٹھ بچوں کو حیرت بھری نظروں سے تک رہے تھے۔

چھٹی عورت میری ناگن بہن تھی جو جیپ کے رکتے ہی اتر کر پشتی حصے میں چلی گئی تھی۔

"کیا بات ہے بھئی' آج بالائی منزل کی کھڑکیاں بھی روشن ہیں......" میں ان کے سلیوٹ کا اشارتی جواب دے کر جیپ سے اترتے ہوئے بولا۔

"سر۔ بڑے صاحب جاگ رہے ہیں۔ ان کے ساتھ بہت سے معزز لوگ بھی موجود ہیں۔ آپ کے عزیز بھی بیٹھے ہوئے ہیں اور کھر پالہ کنگر اور پنڈ دادن خان پولیس چوکیوں کے سیکنڈ شفٹ انچارج بھی موجود ہیں......"

"اوہ۔ ضرور کوئی خاص بات ہو گی......" لاپرواہی سے جواب دے کر میں نے بچوں کو اتارنا شروع کر دیا۔ ناگن بہن اور دیگر پانچوں لڑکیاں بھی متحرک ہو چکی تھیں۔

"جی ہاں صاحب خاص بات ہی ہے۔ کچھ بچوں کے پیرنٹس آئے ہوئے ہیں......"

"ہوں۔ بڑے صاحب کو میری آمد کی اطلاع کر دو......" مختصر سا جواب دے کر میں بچوں کی طرف متوجہ ہو گیا اور پھر تھوڑی دیر بعد ہی جب میں عورتوں اور بچوں سمیت صحن عبور کر کے برآمدے میں پہنچا تو البرٹ ہیکل بڑی تیزی سے سیڑھیاں اترتا ہوا

میری طرف لپکا تھا۔ ان کے پیچھے میرے پھوپھا اور دونوں بھائی اور دیگر دیوانہ وار اترتے نظر آئے۔

ذرا سی دیر میں پورا ماحول رقت انگیز ہو گیا۔ بچے اپنے وارثوں سے لپٹ پڑے تھے اور عورتیں اپنے وارثوں سے۔ میرے پھوپھا بار بار مجھ ہی کو سینے سے لگا رہے تھے۔

☆☆☆

"کیا نام ہے آپ کا......" البرٹ ہیکل ایک شخص سے مخاطب ہوا جو ہندوانہ لباس پہنے تھا۔ اس کا کمبل اس کے کندھے پر پڑا تھا۔

ہم سب بالائی منزل کے ہال نما کمرے میں کرسیوں' صوفوں اور اسٹولوں پر بیٹھے تھے۔ ہال کے دروازے اور کھڑکیاں بند تھے۔ ٹھنڈک تھی مگر ایسی نہیں کہ کمبل اوڑھ لئے جائیں۔ تمام بچے اور پانچوں عورتیں بسکٹ کھانے اور کافی پینے میں مصروف تھے۔ یہ سب کچھ برطانوی نژاد آفیسر البرٹ کے حکم سے ہوا تھا۔

میری ناگن بہن میرے ساتھ ہی صوفے پر بیٹھی تھی جسے میرے پھوپھا اور بھائی علاؤالدین اور امیر جان بڑے غور سے تک رہے تھے۔ ابھی تک ناگن بہن کے متعلق مجھ سے کسی نے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔

"جگندر سنگھ صاحب بہادر......" مخاطب نے جواب دیا اور اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دھاریں جاری ہو گئیں۔

"کیا بات ہے جگندر' آپ رو کیوں رہے ہیں؟......" میں نے سب کچھ جانتے ہوئے بھی انجان بن کر پوچھا۔

"مم میرے دو پوتے جے پال سنگھ اور شکتی سنگھ ان...... ان بچوں میں نہیں ہیں......" وہ ہچکیاں روکنے کی کوشش میں جھٹکے لیتے ہوئے بولا۔

"اوہ۔ آپ' آپ کس گاؤں کے ہیں؟......" جگندر سنگھ کی کیفیت نے مجھے بہت ہی متاثر کیا۔

"میں...... میں پنڈ کنگر دا اکا جیاز یندھر ہے گاں۔ گڈی وی میری سی۔ ساریاں

چیاں دے لئی وقف کیتی سی......"

"آپ کی وکٹوریہ گڈی کے کوچوان نے آپ کو کچھ نہیں بتلایا؟......" البرٹ نے جگندر سنگھ سے پوچھا۔

"اس کی دستراں سی صاحب بہادر۔ اس کی لاش تو آپ نے پوسٹ مارٹم کے لئے چکوال بھجوادی تھی۔"

میرے ذہن پر بڑی زور کا چھناکا ہوا۔ میرے ساتھ وہ دونوں لڑکیاں بھی چونک پڑیں جو ڈھوک ٹالیاں کے تین چوں کے ہمراہ تھیں۔ "یہ جھوٹ ہے صاحب بہادر......" نازیہ ایک دم سے چیخ پڑی اور سبھی لوگ اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"کوچوان گاڑی سے گر کر زخمی ضرور ہوا تھا...... مگر...... وہ زندہ تھا......" اس نے جملہ مکمل کر دیا اور البرٹ کے کہنے پر اس نے پوری بات بتلادی۔

"کیا تم اس شخص کو پہچانتی ہو؟......" البرٹ ہی نے پوچھا۔ قطع نظر اس کے جگندر سنگھ زخمی ناگ کی طرح اپنی کرسی پر پہادبد لتا رہا تھا۔

"آہو جی۔ میں شروع ہی سے اس کے متعلق سوچتی رہی تھی۔ وہ...... وہ چوہدری نظام کا بیٹا چوہدری بہرام تھا......"

ایک بار پھر میرے ذہن پر بڑی زور کا چھناکا ہوا۔ مجھ پر ہی کیا منحصر تھا' البرٹ سمیت ہر شخص غریق حیرت ہو چکا تھا۔ قطع نظر ہر ایک کے جگندر سنگھ بھوکے بھیڑیے کی طرح غراتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"مجھے بتاؤ صاحب بہادر......" وہ میری طرف تکتے ہوئے بھوکے درندے کی طرح غرایا۔ "میرے پوتے قتل کر دیئے گئے ہیں ناں؟......" اس نے جملہ مکمل کر دیا۔

"مجھے افسوس ہے چاچا کہ...... کہ میں انہیں نہیں بچا سکا......"

"او نہیں پترا نہیں۔ مرنے والے مر گئے۔ دکھ صرف اس بات کا ہے کہ اپنے چوں کا کریا کرم نہیں کر سکا......"

"مسٹر جگندر۔ آپ کہاں جا رہے ہیں؟......"

جگندر سنگھ کو دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھ کر البرٹ نے پوچھا۔

"پنڈ دادن خان جا رہا ہوں۔ اپنی جان قربان کر دوں گا یا بہرام خان کے ٹکڑے کر دوں گا' چوہدری نظام کی حویلی میں ایک اور صف ماتم بچھا دوں گا......"

"ٹھہرو جگندر......" البرٹ اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ اہل زبان کی طرح پنجابی بول رہا تھا۔ صرف اس کے لہجے سے انگریزی ہونے کا احساس ہوتا تھا۔

"آپ ایسا کچھ نہیں کریں گے۔ مجھے فل اختیارات کے ساتھ یہاں اسی لئے تعینات کیا گیا ہے کہ مزید خون خرابہ نہ ہونے دوں' پنڈت دھیراج اگھوری اور چوہدری نظام کے گٹھ جوڑ کا پتہ لگاؤں اور مجرموں کو تختہ دار تک پہنچاؤں......"

البرٹ کے خاموش ہوتے ہی جگندر ناتھ آتش فشاں کی طرح پھٹنا چاہتا تھا کہ میں بول اٹھا۔

"چاچا۔ آپ رفیع الدین چغتائی کو جانتے ہیں؟......"

"اوئے میں اس دے والد عماد الدین چغتائی نوں وی جانداں سی یار سی میرا...... پر توں......؟"

"میں آپ کے یار عماد الدین چغتائی کا بیٹا وصی الدین ہوں......"

"اوں توں وصی...... وصی پترا۔ میں...... میں نوں تیرے تے پہلاں ہی شک سی۔ اوئے توں تے میرا یار عماد و بالکل ہمشکل ہے گاں......" جگندر سنگھ اپنا دکھ بھول کر مجھ سے لپٹ پڑا۔ باپ دادا کی یاد آتے ہی میری ہچکی بندھ گئی تھی۔

"ناں پترا ناں۔ اوئے جھلیا جھٹکے نے لے۔ تیرے داد تے پیو دے قاتل وی چوہدری نظام تے اس دے پتر ہے گے نیں......"

میرے چہرے پر چونکہ اندرونی کرب کے آثار اُمڈ آئے تھے اس لئے پورے ماحول پر رقت سی طاری ہو گئی تھی جب کہ ناگن بہن بیتاب ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور میرا شانہ تھپک رہی تھی۔

"اس کے باوجود میں نے چوہدری نظام کے خلاف کوئی انتہائی قدم نہیں

اٹھایا......" میں اپنی ہچکیوں پر قابو پاتے ہوئے بولا۔ میں چوہدری نظام کو ننگا کر کے رکھ دوں گا۔اس کے خلاف ثبوت اکٹھے کر رہا ہوں چاچا۔آپ کی منت کرتا ہوں کہ کوئی انتہائی قدم نہ اٹھایئے......" میرے الفاظ کارگر ثابت ہوئے اور جگندر سنگھ شکست خوردہ ہو گیا۔

☆☆☆

میں صبح تک چیک پوسٹ پر ہی رہا۔ میری وجہ سے سبھی لوگوں کو چیک پوسٹ پر رکنا پڑا تھا۔اس لئے کہ ہر ایک کا بیان لکھا گیا۔ ہر ایک سے دستخط یا نشان انگوٹھا لئے گئے تھے۔

صبح کا سورج نکلتے ہی سبھی لوگ اپنے اپنے راستے پر چل دیئے۔ناگن بہن نے نہ کوئی بیان دیا اور نہ ہی دستخط کئے۔ویسے بھی میں نے علی الاعلان کہہ دیا تھا کہ وہ میری بہن ہے۔ان کا شوہر میرا بہترین دوست تھا اب چونکہ وہ اس دنیا میں نہیں رہا اس لئے یہ آئندہ میرے ساتھ ہی رہے گی اور اس کا نام سلیمہ ہے۔ میرے عزیزوں نے بے انتہا خوشی کا اظہار کیا تھا۔نہ تو مجھ سے کسی نے پوچھا کہ سلیمہ بہن سے میری ملاقات کب اور کہاں ہوئی اور نہ ہی میں نے بتلانا ضروری سمجھا۔ پھوپھا اور میرے بھائی ناگن بہن کو ساتھ لے جانے پر مصر تھے مگر اس نے بڑی مہارت سے بہانا بنا دیا تھا۔

میں صبح نو بجے تک چیک پوسٹ پر ہی رہا تھا۔ناشتہ میں نے البرٹ کے ساتھ ہی لیا۔

"میجر سر۔آپ یقین رکھیں۔ کوچوان کی پوسٹ مارٹم رپورٹ کے آتے ہی میں چوہدری بہرام کو گرفتار کر لوں گا۔ اگر ہو سکے تو آپ وائرلیس پر پنجاب کے وائسرائے سے بات کر لیں......"

"کیا بات کرنی ہے ان سے......" میں انجان بنتے ہوئے بولا۔

وائسرائے اکثر چوہدری نظام کی حویلی میں جاتے رہے ہیں۔وہ کبھی نہیں چاہیں گے کہ چوہدری نظام کے خلاف کوئی انتہائی قدم اٹھایا جائے......"

"ہوں۔ آیئے وائرلیس روم تک میری رہنمائی کریں......" وائرلیس

روم میں پہنچ کر کوئی دس منٹ تک میں وائسرائے سے گفتگو کرتا رہا۔ گو کہ اس نے البرٹ کو اپنے اختیارات کے استعمال کی اجازت دے دی تھی مگر' میرے ساتھ البرٹ کا بھی یہی خیال تھا کہ وائسرائے کا ظاہر کچھ اور باطن کچھ ہے۔ وہ چوہدری نظام کو بالضرور خبردار رہنے کی تاکید کرے گا۔

جو کچھ بھی تھا' میں البرٹ سے رخصت ہو کر ناگن بہن کے ہمراہ چیک پوسٹ سے روانہ ہو گیا۔ سلوچنا جو دریا پٹی کے گاؤں کے سرپنچ جیراج کی بیٹی تھی پولیس کی نگرانی میں صبح سات بجے ہی روانہ کر دی گئی تھی۔

معصومہ کو اس کے والد بوڑھے قربان کے ہمراہ جانے دیا گیا اور سادھنا چونکہ کنگر گاؤں کے لوہار مندر کی بیٹی تھی اس لئے اسے جگندر سنگھ کے ساتھ جانے کی اجازت دے دی گئی تھی۔

"کیا سوچ رہے ہو ویرا؟....." چیک پوسٹ سے کچھ فاصلے پر پہنچنے کے بعد ناگن بہن نے پوچھا۔

"میں وائسرائے کی گفتگو سے مطمئن نہیں ہوں آپا......" میں نے پر سوچ لہجے میں جواب دیا۔

"مطمئن تو میں بھی نہیں ہوں....." ناگن بہن پراسرار مسکراہٹ سے بولی اور میں چونک پڑا۔

"میں سن چکی ہوں۔ یہ انگریز قوم کسی کے ساتھ وفادار نہیں ہوتی۔ پیچھے مڑ کر دیکھئے البرٹ ہیکل اپنی جیپ میں جا رہا ہے۔" میں نے فوراً ہی مڑ کر دیکھا۔ البرٹ ہیکل تو نظر نہ آیا البتہ جیپ دکھائی دے رہی تھی۔

"تم جیسے ہی بالائی منزل سے اترے تھے وائرلیس سیٹ جاگ اٹھا تھا۔ میں خاموش اس لئے ہو گئی تھی کہ وائرلیس کی گفتگو سننے میں مصروف تھی۔

البرٹ ہیکل چوہدری نظام سے ملنے جا رہا ہے۔ تمہاری ذمے داریاں کچھ اور بڑھ گئی ہیں۔ اگر تھوڑی دیر انتظار کر لو تو میں چیک پوسٹ سے وہ فائل لے آؤں جس میں

دستخط شدہ بیانات رکھے گئے ہیں۔ اگر فائل کو دہیں رہنے دیا گیا تو سلوچنا' معصومہ اور سادھنا کے ساتھ نازیہ اور فرح کی زندگیاں بھی خطرے میں پڑ جائیں گی......"

"اوہو۔ جاؤ' جاؤ آپا میں یہیں پر تمہاری واپسی......" میں جملہ مکمل نہ کر سکا' اس لئے کہ ناگن بہن آن واحد میں ناگن بن کر جیپ سے زمین کی طرف رینگ گئی تھی۔

اسے گئے ہوئے چند لمحے گزرے تھے کہ میرے جسم کو ایک ہلکا سا جھٹکا لگا' میرے نتھنوں سے قوس قزح کی سی لہریں نکلیں اور گنزا ایک جیتی جاگتی گڑیا کے روپ میں ڈیش بورڈ پر نمودار ہو گئی۔

"السلام علیکم صاحب جی......" وہ اپنی مسکراہٹ کی جلیاں گراتے ہوئے بولی۔

"وعلیکم السلام گنزا۔ تم نے تو مجھ سے منہ ہی موڑ لیا ہے......"

"نہیں وصی الدین صاحب۔ میں آپ کے وجود سے ایک لمحہ بھی الگ نہیں ہوئی۔ حرکت میں اس لئے نہیں آئی کہ بدروحوں کا مقابلہ کرنے کے لئے تمہاری بہن ہی کافی تھی۔

ایک مشورہ میرا بھی مان لیں۔ وہ یہ کہ ڈھوک ٹالیاں اور کنگر گاؤں سے چند جی دار جوانوں کو اپنے ساتھ ملا کر جنگل کے جنوبی کنارے' پہاڑی کے دامن میں چوہدری نظام کے مضبوط دوسرے ڈیرے پر حملہ آور ہو جائیں۔

چونکہ بدروحوں کا خاتمہ ہو چکا ہے اس لئے نظام کی ذاتی جیل کے کئی قیدی رہائی کے لئے مچل رہے ہیں۔ جو بھی سرکاری گواہ بننے کو تیار ہو جائے اسے پناہ دیجئے اور جو چوہدری نظام سے وفاداری نبھائے اسے ختم کر دو اور یہ کام آج کی رات میں کر گزرو ورنہ کل یعنی جمعرات کی صبح ہی پنڈت دھیراج کی موت کی ہوا پھیل جائے گی اور چوہدری نظام اپنی ذاتی جیل سے تمام ثبوت غائب کروا دے گا۔ اچھا بس' آپ کی بہن آرہی ہے......"

دوپہر کے تین بجے تک کنگر گاؤں سے جگندر سنگھ اپنے شیر جوان بیٹے مہتاب سنگھ سمیت پہنچ گیا۔ بھلا کریالہ گاؤں سے سلطان' زمان خان اور فرحان خان بھی پہنچ گئے۔ ڈھوک ٹالیاں سے میرے پھوپھازاد بھائی علاؤالدین نے دس ایسے سر پھرے جوانوں کا

انتخاب کر لیا جو مرنے مارنے پر آمادہ تھے۔

تقریباً ایک گھنٹے تک میں نے جامع پروگرام ترتیب دے کر انتہائی خفیہ طریقے سے سب کو منتشر کر دیا۔ صرف میرے خالہ زاد بھائی ہی میرے پھوپھا کی حویلی میں رہ گئے تھے۔

میں نے پھوپھا ریشم خان کو پوری طرح اعتماد میں لے کر ساری حقیقت انہیں بتا دی۔ انہیں پنڈت دھیراج اگھوری کے قتل سے ڈھوک ٹالیاں جنگل میں پیش آنے والے مفصل حالات بتا کر انہیں یقین دلا دیا تھا کہ اب جنگل میں محیر العقل واقعات نہیں ہوں گے۔ کبھی کبھار اگر خطرہ ہو گا تو سانپ بچھوؤں سے جنہیں ہمارے مزدور آسانی سے نمٹ سکتے ہیں۔ ایک طرح سے میں نے پھوپھا کو راغب کر دیا کہ آنے والے پیر کے روز سے جنگل کی کٹائی کا کام شروع کروا دیں۔ صرف اپنی ملکیت کی حد تک۔ چوہدری نظام کی حد پر کسی مزدور کو قدم رکھنے نہ دیں۔

ناگن بہن سے بھی میری طویل گفتگو ہوئی اور طے یہ پایا کہ پھوپھی اور پھوپھا کے سو جانے کے بعد وہ اپنے اصل روپ میں مجھ سے پہلے مین روڈ پر پہنچ جائے گی اور چوہدری نظام کی ذاتی جیل تک میری رہنمائی کرے گی۔

یہ جیل اصل میں میرے پھوپھا کی ملکیت والے علاقے میں ناجائز طور پر قائم کی گئی تھی تاکہ پھوپھا کے مزدوروں کو خوف میں مبتلا کر کے جنگل کو اونے پونے بھاؤ خرید لیا جائے۔

رات کا کھانا ہم نے نو بجے سے پہلے کھا لیا تھا۔ گو کہ ڈھوک ٹالیاں کے رہنے والوں کے دلوں سے نوے فیصد خوف ختم ہو گیا تھا اس کے باوجود کڑاکے دار سردی اور بے پناہ کہر کی وجہ سے پورے گاؤں پر ابدی سکوت چھا گیا تھا۔ حتیٰ کے ڈھور ڈنگروں کی آوازیں بھی دب کر رہ گئی تھیں ساڑھے نو بجے تک میں پندرہ سیاہ پوش جوانوں کے ہمراہ منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔

میرے تمام ساتھی آتشیں اسلحے کے علاوہ ہر طرح سے لیس تھے۔ ٹارچ بتیاں

بھی ہم نے ساتھ لے لی تھیں۔

ہمیں کھیتوں میں اس لئے داخل نہ ہونا پڑا کہ کہر کے گھرے بادل ہم میں سے ہر ایک کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے تھے۔ اگر ہم ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے نہ ہوتے تو ایک دوسرے کو دیکھ بھی نہیں سکتے تھے۔۔

قارئین کرام۔ چونکہ یہ مشن وصی الدین کے ساتھ پیش ہونے والے واقعات کا ایک لازمی حصہ تھا اس لئے صرف آپ کی آگہی کے لئے لکھ دیا گیا ہے تاکہ تسلسل بھی قائم رہے اور مسائل بھی حل ہوتے جائیں۔ اب میں ان واقعات کو بالکل مختصر کر رہا ہوں تاکہ وصی الدین اپنے گاؤں اور اپنے مکان میں پہنچ جائے اور آتشی مخلوق کی خوفناک شرارتیں آپ کے علم میں آجائیں اور واقعات طوالت نہ پکڑ سکیں۔

شکریہ۔ ایم۔ ایس قادری

مین روڈ تک پہنچنے میں ہمیں بیس قیمتی منٹ ضائع کرنے پڑے۔ سڑک کی دوسری جانب جگندر سنگھ بیس سیاہ پوش جوانوں سمیت موجود تھا۔ ان میں جگندر سنگھ کا بیٹا مہتاب سنگھ بھی شامل تھے۔

جیسا کہ میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ کہر اس قدر دبیز تھی کہ ہم ایک دوسرے کی نہ تو شکل دیکھ سکتے تھے اور نہ ہی سراپا۔ اسی موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ناگن بہن انسانی روپ میں میری رہنمائی کرتی رہی۔ تقریباً گیارہ بجے تک ہم پہاڑی کے گرد گھیرا ڈال چکے تھے۔

پہاڑی کے پیٹ میں داخل ہونے کا خفیہ راستہ بھی ناگن بہن ہی نے بتلایا تھا۔

پہاڑی کے پیٹ میں ایک وسیع صحن نما دالان سمیت آٹھ بڑے بڑے کمرے بطور رہائش بنے ہوئے تھے۔ تین کمرے اسٹور پر مشتمل تھے اور ایک بڑا کمرہ باورچی خانے پر مشتمل تھا۔

ابتداء میں ایک بڑا کمرہ بطور آفس استعمال ہوتا تھا۔ ہم جب اندر پہنچے تو بالکل شہر خموشاں کی سی ویرانی اور وحشت چھائی ہوئی تھی۔ صرف چار کمرے ایسے تھے جن میں

بتیس جوان لحافوں میں دبکے پڑے ہوئے تھے۔ ایک کمرے میں آٹھ محافظ بھی گہری نیند سوئے ہوئے تھے۔

ہم نے سب سے پہلے ان کی بندوقوں اور دیگر اسلحے پر قبضہ کر لیا اس کے بعد چالیس انسانوں پر قابو پایا اور بغیر کوئی جانی نقصان اٹھائے نصف گھنٹے میں چوہدری نظام کی نجی جیل پر قابض ہو گئے۔

چالیس افراد بہت گھبرائے ہوئے تھے۔ اسی گھبراہٹ کے باعث نہ وہ کوئی احتجاج کر پائے اور نہ ہی جدوجہد کر سکے تھے۔ آٹھ محافظوں کا بیان انتہائی المناک تھا۔ ان کے مطابق چوہدری نظام اور اس کے ایس ایس پی بیٹے نے ان کے گھر کی عورتوں کو یرغمال بنایا ہوا ہے اور ان کی زندگی کی ضمانت یہی ہے کہ وہ بے چوں چرا گارڈ کے فرائض انجام دیتے رہیں۔ اگر انہوں نے بھاگنے' رہائی پانے یا بھید کھولنے کی حماقت کی تو ان کی بیویوں' بہنوں اور بیٹیوں کو قتل کر دیا جائے گا۔

انہوں نے ہی بتلایا کہ نائٹ ڈیوٹی والے آٹھ محافظ ایک ایک دو دو کر کے غائب ہوتے رہتے تھے انہیں کوئی خوبصورت سی جوان عورت پھانس کر اپنے ساتھ لے جاتی اور پھر دو تین روز بعد ان کی ادھڑی ہوئی لاش جنگل کے کسی نہ کسی حصے میں پائی جاتی' جنہیں بعد میں دفنا دیا جاتا تھا۔

جب سے چوہدری ارسلان قتل ہوا ہے' جنگل کی کٹائی کا کام بند ہے اور قتل کا کوئی واقعہ رونما نہیں ہوا۔

نگرانوں کے مطابق قیدی مزدوروں کی تعداد ایک سو سے زیادہ تھی۔ ان میں زیادہ تر وہ لوگ تھے جن کا چکوال یا جہلم شہروں کے سنگین کرائم سے تعلق تھا۔ ان میں بھی بہت سے جی دار قسم کے لوگ چوہدری ارسلان کے ساتھ ڈاکہ زنی' قتل و غارت گری اور اغواء کی وارداتیں کرتے اور کسی نہ کسی طرح فرار ہو جاتے رہے ہیں۔

اب صرف تیس قیدی باقی رہ گئے ہیں۔ یہ اس لئے فرار نہیں ہوتے کہ ان میں سے کسی کی بہن' کسی کی بیوی اور کسی کے معصوم بچے چوہدری نظام کی حویلی والے تہہ

خانوں میں قید ہیں۔

طویل بیانات سن لینے کے بعد ہم نے جب تلاشی لی تو ہمیں ایسے ایسے ثبوت مل گئے کہ وائسرائے کو بھی اپنی جان بچانی مشکل پڑ جاتی۔

تیس قیدیوں میں بیس کا تعلق پنڈ دادن خان سے تھا اور یہ سب مسلمان تھے۔

آٹھ جوان کنگر گاؤں کے تھے جنہیں جگندر سنگھ اور پیٹے وساتھیوں نے پہچان لیا تھا۔

بقیہ چار کا تعلق چکوال سے تھا وہ اپنے عزیزوں سمیت کھر پالہ گاؤں جاتے ہوئے اغواء کر لئے گئے تھے اور تقریباً دو سال سے اپنے بیوی بچوں کی نہ تو شکل دیکھ پائے تھے اور نہ ہی ان کی خیریت سے باخبر ہو سکے تھے۔



صبح نو بجے تک ڈھوک نالیاں کے ہر جوان' بچے' بوڑھے' مرد وزن کو پنڈت دھیراج اور اس کے چیلوں کی موت کا علم ہو گیا۔ علم تورات سے پہلے ہی ہو چکا تھا جب کچھ بوڑھے' ناقص عقیدے والے لوگ جھونپڑے سے اٹھنے والی بدبو کا راز جاننے جھونپڑے میں داخل ہوئے تھے۔ انہوں نے ہی پورے گاؤں کو مطلع بھی کیا تھا۔

پھیلتے پھیلتے اطلاع ڈھوک نالیاں کے بڑے افسر البرٹ ہیکل تک بھی پہنچ گئی تھی۔ شاید اسی لئے وہ پولیس کی بھاری نفری کے ساتھ جائے حادثہ پر پہنچ گیا تھا۔

پنڈت دھیراج سمیت اس کے چیلے محض ڈھانچہ بن چکے تھے۔ ان کے جسموں کا گوشت جھڑ جھڑ کر بدبودار سیال میں تبدیل ہو گیا تھا۔ جھونپڑے میں موجود ہر سامان ناقابل استعمال ہو چکا تھا۔

جھونپڑے میں لاتعداد مکھیاں' چمگادڑیں اور چیونٹے وغیرہ مرے ہوئے پڑے تھے۔ چند کوے اور چیلیں بھی مردہ پڑے تھے۔ بدبو کا یہ عالم تھا کہ البرٹ ہیکل یا مجھ سمیت کسی نے بھی جھونپڑے میں داخل ہونے کی ہمت نہیں کی۔

میں دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ میری ناگن بہن کا زہر کس قدر سریع الاثر اور مہلک ہے۔ میرے ساتھ میرے پھوپھا رشم خان' بھائی علاؤالدین اور امیر جان بھی

موجود تھے۔ گاؤں والوں کا بھی ایک ہجوم سا جمع تھا۔ کسی کو سردی کا احساس تک نہیں ہو رہا تھا۔ ایک اور وضاحت کر دوں کہ میں اپنے ساتھیوں سمیت گزشتہ شب ساڑھے تین بجے تک انتہائی خاموشی سے گاؤں پہنچ چکا تھا۔ بھلا کریالہ اور کنگر گاؤں سے میری مدد کو آنے والے سارے ہی مددگار اپنی اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئے تھے۔ وہ یقیناً خیریت اپنے ٹھکانوں تک پہنچ گئے ہوں گے اگر ذرہ برابر بھی گڑبڑ ہو جاتی تو مجھے صبح ہی صبح اس کی اطلاع ہو جاتی۔

"میجر سر۔ اب کیا کیا جائے 'ڈھانچوں' کو کس طرح پوسٹ مارٹم کے لئے بھیجا جائے......" رابرٹ ہیکل میرے قریب پہنچ کر انگریزی میں بولا۔ حقیقتاً اس کے چہرے سے ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اس کے تاثرات ظاہر کرتے تھے کہ اسے پنڈت کی موت کا شدید رنج پہنچا ہے۔ وہ بہت زیادہ نروس ہو چکا تھا۔

"اس کا جواب تو آپ چوہدری نظام سے اور اس کے بیٹوں سے حاصل کر سکتے ہیں۔"

"میں نے ان کی طرف پیغام......" جملہ مکمل کرنے سے پہلے ہی وہ چونک پڑا شاید اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔

"مم' میرا مطلب ہے میں ان کی طرف پیغام بھجوا دوں گا......" اس نے فوراً ہی بات بنا دی۔

"کل میں بھی تو آپ چوہدری سے ملنے گئے تھے......" میں نے برجستہ کہا۔

"ہاں۔ مم' میرا مطلب ہے کہ ایس پی صاحب سے ملنا ضروری تھا......" وہ بوکھلا گیا۔ اس کا نروس بریک بالکل ہی ڈاؤن ہو چکا تھا۔

"مسٹر البرٹ۔ آپ کو معلوم ہو گا کہ برصغیر میں آزادی کی تحریک کیا رخ اختیار کر چکی ہے۔ قائداعظم محمد علی جناح کی ولولہ انگیز قیادت میں مسلمان پاکستان کے نام سے ایک الگ اسلامی ریاست کا مطالبہ کر چکے ہیں......"

"آں......ہاں' میں جانتا ہوں......" وہ پرسوچ لہجے میں بولا۔

"تو پھر یقین جانئے کہ آج نہیں تو کل' آپ کو اپنا بوریہ بستر سمیٹنا ہی پڑے گا۔
میرا اب بھی مشورہ ہے کہ جانے سے پہلے کوئی ایسا کام کر جائیے کہ یہاں کی
عوام آپ کو عزت و احترام سے رخصت کرے......" میں خاموش ہو گیا اور البرٹ ہیکل
پیشانی پر بہت سی شکنیں ڈالے ادھر سے ادھر ٹہلتا رہ گیا۔

پانچ منٹ کی طویل خاموشی کے بعد اس کے چہرے کی سرخی لوٹ آئی۔ وہ اس
قدر پر سکون ہو گیا جیسے اس نے کوئی حتمی فیصلہ کر لیا ہو۔

"ویل میجر......" وہ بڑی گرمجوشی سے میری طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔

"یسوع مسیح کی قسم کھا کر وعدہ کرتا ہوں کہ وائسرائے کے اختلاف کے باوجود
چوہدری نظام اور اس کے بیٹوں کے گھناؤنے جرم بے نقاب کر دوں گا۔ اس کے ساتھ
ایک چھوٹی سی شرط یہ ہو گی کہ آپ میری بھرپور مدد کریں گے' مجھے اپنے مشوروں سے
نوازیں گے......"

"اوکے البرٹ...... میں آپ کے ساتھ ہوں......" میں نے بھی خلوص نیت
سے اس سے ہاتھ ملایا۔

"یہ...... یہ ہماری مقدس کتاب انجیل ہے....." اس نے اپنے اوور کوٹ سے
انجیل مقدس نکالتے ہوئے کہا۔

"میں اس پر ہاتھ رکھ کر وعدہ کرتا ہوں کہ ظلم و ظالم کا ساتھ نہیں دوں گا۔
اپنی سچائی کے ثبوت میں چند اہم حقیقتیں آپ پر واضح کرنے لگا ہوں۔
سب سے پہلے یہ کہ کل شام میں چوہدری نظام اور اس کے تینوں بیٹوں سے ملا
تھا۔ میں نے انہیں بتلایا تھا کہ پنڈت دھیراج کے طلسم کدہ کو وصی الدین نے مٹا دیا ہے۔
بہت سے ثبوت اور گواہیاں حاصل کر کے میرے سپرد کر چکا ہے۔
مجھ سے کہا گیا کہ میں ان ثبوت اور بیانات کو ضائع کر دوں اور ان گواہوں کو
مروا دوں یا ہم خیال بنالوں۔
مجھے افسوس ہے میجر پورا فائل میرے آفس سے گم ہو چکا ہے۔ دوسری سچائی

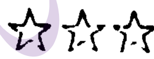
یہ ہے کہ پھول سنگھ کو چوہدری نظام کے بیٹے بہرام ہی نے قتل کیا تھا۔

تیسری سچائی یہ ہے کہ...... کہ آپ کی' دو...... دونوں بہوؤں کو ارسلان اور امام دین نے اغواء کر کے آپ کے والد سے شوگر ملوں کی فروخت کے کاغذات پر دستخط لئے تھے۔

اور آپ کی...... بہوں' بہوؤں کی عزت وانسرائے اور...... چوہدری کے چاروں بیٹوں نے پامال کی تھی......''

بے ساختہ میرا وجود آتشِ انتقام سے سلگ اٹھا...... میرے حلق سے نکلنے والی غضبناک دھاڑ نے ہر شخص پر سکتہ طاری کر دیا۔ میرا پورا جسم یوں لرزنے لگا کہ البرٹ اور علاؤالدین مجھے فوراً ہی تھام نہ لیتے تو میں گر پڑتا۔

میرا ذہن بالکل تاریک ہو گیا تھا اور میری آنکھوں سے چنگاریاں نہیں بلکہ شعلے نکلنے لگے تھے۔



آگ لگا دی گئی پنڈت کے جھونپڑے کو آگ لگا دی گئی۔ یہ میرا ہی مشورہ تھا۔ نارمل ہونے کے بعد البرٹ ہیکل میرے ساتھ ہی حویلی کی بیٹھک میں آ گیا تھا۔ پولیس جا چکی تھی۔ احتیاطاً میں نے ناگن بہن سے بھی مشورہ کر لیا۔ اس نے تصدیق کر دی تھی کہ البرٹ پر خلوص ہو چکا ہے۔

میرے اور البرٹ کے درمیان بہت سے خفیہ پروگرام طے پا گئے تھے۔ ان ہی میں سے ایک پر عمل کرنے کے لئے مجھے تین بجے بذریعہ جیپ اپنے گاؤں کی طرف روانہ ہونا پڑا۔

ڈھوک ٹالیاں سے ایک گھنٹے بعد میں اپنے گاؤں پہنچ گیا۔ کھیتوں' دکانوں میں جہاں کہیں لوگ موجود تھے' میری وضع قطع دیکھ کر چونک پڑے تھے بہت سے ایسے بھی تھے جو مجھے پہچان چکے تھے۔ اس کی ایک وجہ شاید یہ بھی تھی کہ میری شکل وصورت اور قد کاٹھ میرے مرحوم دادا سے ملتا جلتا تھا۔

ناگن بہن انسانی روپ میں میرے ساتھ تھی اور گنزا جنی میرے وجود میں' میرے لہو میں سمائی ہوئی تھی۔ میں نے جیپ کا رخ قبرستان کی طرف موڑ دیا لیکن مجھے علم نہیں تھا کہ میرے بزرگوں اور بہنوں کی قبریں کہاں ہیں۔

میری یہ مشکل بھی گاؤں والوں نے حل کر دی۔ بہت سے لوگ قبرستان میں موجود تھے۔ مجھے پہچان کر سب آبدیدہ ہو گئے تھے۔ میرے ابا اور دادا کی قبریں ساتھ ساتھ تھیں۔ قبروں پر نظر پڑتے ہی میری تمام حسیات سمٹ کر میرے چہرے پر آ جمیں۔ میں نے دس منٹ تک دعا مانگی۔

پھر' چند قدموں کے فاصلے پر ہی میری ماں اور دونوں بہنوں کی قبروں تک ایک ضعیف شخص نے میری رہنمائی کی۔

نصف گھنٹے بعد میں بذریعہ جیپ ناگن بہن سمیت قبرستان سے چل دیا۔

ویسے بھی شام کے سرمئی سائے گہرے ہو رہے تھے۔ سورج مغرب کی گود میں سمٹنے ہی والا تھا۔ بلندیوں پر پرواز کرتے پرندے اپنے آشیانوں کی طرف پلٹ پڑے تھے۔ چمگادڑیں اپنے ٹھکانوں سے نکل آئی تھیں۔

سردی اپنے پورے شباب پر تھی اس کے باوجود گاؤں کی رونقیں بحال تھیں۔ لوگوں کی آمدورفت' بچوں کی کھیل کود اور جھگی نما ہوٹلوں پر گراموفون کی ریکارڈنگ جاری تھی۔ یوں لگتا جیسے میرے گاؤں والوں کو کسی قسم کا کوئی خطرہ نہیں ہے۔ مختلف راستوں سے گزرتے ہوئے میں نے جیپ کو اپنی حویلی کے بڑے سے مقفل دروازے کے سامنے روک دیا۔

میری حویلی کے سامنے بہت سے چھوٹے بڑے درخت تھے البتہ حویلی اجڑی ہوئی تھی۔ بڑا سا تالہ اس قدر زنگ آلود ہو چکا تھا کہ میرے اندازے کے مطابق ایک جھٹکے سے ٹوٹ جائے گا۔ ایک عجیب سی اداسی' وحشت اور ویرانی نے حویلی کو گھیر رکھا تھا۔

حد بندی دیواریں خودرو بیلوں سے لدی پھندی تھیں۔ اندر والے حصے میں بھی چند طویل القامت گنجان اور ہرے بھرے درخت کھڑے تھے۔ میں حسرت و غم

بھری نظروں سے حویلی کا جائزہ لے رہا تھا۔ میری جیپ کے رکتے ہی اطراف سے چند مرد' عورتیں اور بچے جیپ کے گرد جمع ہو چکے تھے۔

دو تین عمر رسیدہ مرد: عورتیں مجھے پہچان چکے تھے اور پروانہ وار میرے گرد جمع ہو گئے۔

پندرہ قیمتی منٹ ان سے ملنے میں صرف ہو گئے۔ شور مچ گیا میری آمد کا۔ لالٹینیں اور پیٹرومیکس لیمپ آ گئے اور بہت سے جوان ہر طرح سے میری مدد کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ کسی نے بھی ناگن بہن کے متعلق مجھ سے کسی قسم کا استفسار نہیں کیا۔

"گاؤں والو......" میں جیپ سے اتر کر مجمعے کے درمیان پہنچ کر پکارا۔ میرے دل و دماغ پر جہاں میرے پیاروں کی موت کا غم مسلط تھا وہیں اپنی حویلی کو دیکھ کر میرا رواں رواں فرط مسرت سے جھوم رہا تھا۔

"اندھیرا بہت ہو گیا ہے' سردی بھی شدت اختیار کر چکی ہے اس لئے میں چاہتا ہوں کہ فی الحال بیٹھک کی صفائی میں میری مدد کی جائے۔"

بیٹھک کا دروازہ حویلی کے مین گیٹ سے مغرب کی سمت صرف چھ قدموں کے فاصلے پر تھا۔ نوجوانوں نے مجھے کوئی کام کرنے سے منع کر دیا اور بیٹھک کا تالا توڑ کر پیٹرومیکس لیمپ کی روشنی میں اندرونی جائزہ لیا۔

پوری بیٹھک مکڑی کے جالوں سے اٹی ہوئی تھی مگر محلے والوں کے حوصلے بلند تھے۔ جت گئے اپنے کام کاج میں۔

"ویرا......" ناگن بہن پھنکارتی آواز سے مجھ سے مخاطب ہوئی۔ "مجھے تیری حویلی بہت خطرناک لگ رہی ہے۔"

"وہ تو لگے گی آپا اس میں تشویش کی کیا بات ہے۔"

"ہے۔ ہے ویرا تشویش کی بات ہے۔ حویلی میں سانپ اور بچھو تو ہیں ہی' مگر میں جنات کی موجودگی بھی محسوس کر رہی ہوں۔" ناگن بہن کا لہجہ تشویش بھرا تھا۔

"کوئی بات نہیں آپا۔ برسوں سے حویلی ویران پڑی ہے۔ ظاہر ہے جہاں چالیس

یوم تک چراغ نہیں جلے گا' وہاں جنات کا قبضہ تو ہو ہی جائے گا۔"

"پھر اس سے پہلے کے ناگن بہن مزید کچھ کہتی' اچانک ہی گھنگھروؤں کی آواز کے ساتھ ہنہناہٹ اور پھنکاریں سن کر میں چونک کر مڑا اور ایک سجے سجائے تانگے سے دیبور' افراہیم اور شرجیل کو اترتے دیکھ کر میرا دل فرطِ مسرت سے مینڈک کی طرح اچھلنے لگا۔ صرف وہی تینوں نہیں ان کے ساتھ صابرہ اور ایک عورت بھی تھی انہیں دیکھ کر مجھے اندازہ ہو گیا کہ اب آتشی مخلوق سے بھی زبردست مقابلہ شروع ہونے والا ہے۔

بے پناہ مسرت کا مظاہرہ کرتے ہوئے میں جونہی مڑا ناگن بہن غائب ہو چکی تھی۔



میری ناگن بہن کے ساتھ جو واقعات پیش آئے جن کا میرے مشن سے بڑی حد تک ربط ہے انہیں بیان نہ کرنا ناگن بہن کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔

میری بہن نے جب دیبور' افراہیم اور شرجیل کو دیکھا تو فوراً محسوس کر گئی کہ تینوں جن ہیں اور آتشی مخلوق ہیں وہ مطمئن ہو گئی اور ناگن بن کر گاؤں کے گلی کوچوں میں گھومتے ہوئے کافی دور اس طرف چلی گئی جہاں چوہدری نظام کی قلعہ نما حویلی روشنیوں میں جگمگا رہی تھی۔

چونکہ چوہدری نظام کی حویلی کے ایک کونے میں جنریٹر روم بنا ہوا تھا جہاں بیک وقت تین انتہائی طاقتور جنریٹر نصب تھے جنہیں چھ انگریز آپریٹ کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ چوہدری نظام کی حویلی جگمگاتی رہتی تھی۔

نظام کی حویلی کے تین بڑے گیٹ تھے۔ ایک گیٹ کا اختتام بیٹھک پر ہوتا تھا' دوسرا گیٹ حویلی کا مردانہ حصہ تھا وہیں سے ملازمین کی آمدورفت بھی رہتی تھی اور تیسرا وہ دروازہ تھا جو حویلی کی عورتوں کے لئے مخصوص تھا۔

چونکہ حویلی کی حد بندی دیوار کے باہر بھی کافی روشنی تھی اس لئے سائبان تلے چند جیپیں اور کاریں پارک کی ہوئی تھیں۔ چار پانچ خوب صورت قسم کے تانگے بھی کھڑے تھے۔ ان کی سج دھج دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ قرب و جوار کے رؤسا اور زمیندار

پرسہ دینے پہنچے ہوں گے۔

ناگن بہن کو دشواری تو بہت ہوئی کیونکہ لوگوں کی آمدورفت کا سلسلہ جاری تھا۔ جیپوں اور کاروں کے ڈرائیور اور تانگوں کے کوچوان گرم لباس میں ملبوس چہل قدمی اور گپ شپ میں مصروف تھے تاہم ہر ایک کی نظروں سے چھپتے چھپاتے کسی نہ کسی طرح وہ بیٹھک تک پہنچ گئی۔

بیٹھک کیا تھی' شہنشاہان مغلیہ کا سا دربار تھا۔ ایک بڑی اور جڑاؤ دار کرسی پر چوہدری نظام کاٹھ کے الو کی طرح اکڑا ہوا بیٹھا تھا۔ اس کے دائیں بائیں کی کرسیوں پر چوہدری امام دین' چوہدری عبدالسلام اور چوہدری بہرام بیٹھے تھے۔

ان ہی کے قریب تھری پیس گرم سوٹوں میں ملبوس انگریز عملدار بیٹھے تھے اور چند لوگ پنجاب کے روایتی زمینداروں کے لباس میں زمیندار بھی بیٹھے ہوئے تھے۔

حالانکہ ارسلان کی موت کو چھ سات ہی روز گزرنے پائے تھے مگر بیٹھک میں شراب کا دور چل رہا تھا۔ چوہدری نظام کی جوان ملازمائیں ہاتھوں پر ٹرے اٹھائے ایک ایک کو جھک جھک کر شراب کے جام پیش کر رہی تھیں۔

انہوں نے جسموں پر شوخ رنگ کے ریشمی کپڑے کے لباس پہنے تھے۔ لباس کیا تھے' بے حیائی و بے شرمی کے جیتے جاگتے اشتہار تھے۔

زمیندار ٹائپ کے لوگ جام اٹھانے کے بعد عورتوں کے ابھرتے اور ڈولتے کولھوں پر صرف ہاتھ پھیرتے رہ جاتے جب کہ آٹھ انگریز ضرورت سے زیادہ بے حیائی کا مظاہرہ کرتے۔ عورتوں کے نرم و گداز ابھاروں سے جام ٹکراتے' کسنگ کرتے اور گود میں بٹھا کر لپٹا لیتے۔

بے حیائی کا یہ کھیل جاری ہی تھا کہ ایک دراز قد مقامی باشندہ کمبل میں لپٹا ہوا بیٹھک میں پہنچا اور چوہدری امام دین کے کان میں کچھ ایسی بات کی کہ وہ چونک کر کھڑا ہو گیا۔

میری ناگن بہن گو کہ محفل سے کافی فاصلے پر تھی' اس کے باوجود اس نے اپنی

پراسرار قوتوں کے ذریعے سب کچھ سن لیا۔ نووارد نے امام دین کو میری آمد کی اطلاع کی تھی۔ میرے پانچ معزز مہمانوں کی آمد کی اطلاع بھی دی اور یہ بھی بتلایا کہ میرے ساتھ آنے والی لڑکی حسن نسوانیت کا شاہکار ہے۔ یہ اشارہ میری ناگن بہن کے لئے تھا۔

میرے مہمانوں کے ساتھ پہنچنے والی صابرہ اور جمائمہ کی اطلاع بھی تھی اور یہ بھی بتلایا کہ محلے کے بہت سے جوان اور عورتیں میری ہر طرح سے مدد کر رہے ہیں۔

"ابا جی۔ وصی الدین اپنی حویلی میں پہنچ گیا ہے میں جائزہ لینے جا رہا ہوں۔"

ناگن بہن نے امام کی آواز سنی۔ ارسلان اور بہرام بھی اس کی طرف متوجہ ہو چکے تھے۔

"ناں او پتر اناں۔ اک شیر جوان پتر گنوا چھیاواں۔ اوئے پنڈت دی مرچھیا اے۔ صبر کر پترا صبر کر۔" بوڑھا نظام جھرجھراتے ہوئے بولا۔ دیگر افراد میں سے کوئی بھی چوہدریوں کی طرف متوجہ نہ تھا وہ اپنے شیطانی کھیل میں اس قدر مگن تھے جیسے ان کے علاوہ بیٹھک میں کوئی بھی نہیں ہے۔

"کچھ نہیں ہو گا ابا جی یہ آٹھ باؤلے کتے۔" وہ انگریزوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "جو ہمارے ٹکڑوں پر پل رہے ہیں' ہمارے گاؤں کی عورتوں سے اپنی جنسی تسکین پاتے ہیں' کس دن کام آئیں گے پنجاب کا وائسرائے اور ان تمام علاقوں کا مختیار کل البرٹ ہیکل ہمارے ساتھ ہے۔ ہمارے لئے کوئی خطرہ نہیں ہے ابا جی پنڈت مر گیا تو کیا ہوا۔ ہمارے پاس افرادی قوت اس قدر ہے کہ دس وصی الدین مل کر بھی ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔"

"او ہوش کر پترا ہوش کر۔ میں جہاندیدہ آدمی ہوں۔ اب بھی یقین سے کہتا ہوں کہ پنڈت کو قتل کرنے والا وصی الدین کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے۔"

"نہیں ابا جی اسے اس کے چیلوں سمیت زہریلے ترین سانپ نے ڈسا اسی لئے ان کی لاش بھی نہ پہچانی گئیں۔"

"بحث نہ کر پترا۔ تمہیں یاد نہیں پنڈت نے کیا کہا تھا' اس وقت جب وصی نے ایئرپورٹ پر قدم بھی نہیں رکھا تھا۔"

"یاد ہے ابا جی مجھے سب کچھ یاد ہے۔ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ چکوال پہنچنے سے پہلے وصی الدین کو مروا دے گا۔ کیا ہوا پر 'پھر وہ خود ہی عبرتناک موت مر گیا' اس کی ساری شکتی 'بدروحیں اور ویمپائرا سے مرنے سے نہیں بچا سکے۔

مجھے تو یہ بھی یقین ہے کہ ارسلان وغیرہ کو بھی وصی الدین نے قتل کیا ہے مگر افسوس کہ ہمارے پاس اس کے خلاف کوئی ثبوت نہیں ہے۔ وہ آزاد گھوم رہا ہے اور تمام پنڈوں سے ہمارے دبدبے کو مٹا رہا ہے۔

اس کے باوجود ابا جی میں اسے للکارنے نہیں جا رہا بلکہ صرف جائزہ لینے جا رہا ہوں۔

آپ دیکھتے رہیں میں اس کے ساتھ پہنچنے والی حسینہ کو کس طرح اپنے جال میں پھانس کر اغواء کروں گا۔ اس سے وصی الدین کے متعلق بہت کچھ معلوم ہو گا۔"

"تیری مرضی پترا۔ اگر تجھے خود پر اتنا ہی اعتماد ہے تو پھر جا۔"

☆☆☆

ناگن بہن لوگوں کی نظروں اور تیز روشنی سے بچتی بچاتی انسانی روپ میں ایک لمبا سا چکر کاٹ کر سائبان تلے پہنچ گئی۔ اس نے تھوڑی سی تبدیلی یہ کی کہ اپنا لباس اس قدر پرکشش کر دیا' اپنی اداؤں میں ایسا سحر بھر دیا کہ اگر زاہد صد سالہ بھی اسے دیکھ لے تو اپنا سب کچھ اس پر قربان کر دے۔ وہی ہوا بھی۔ سائبان میں موجود ڈرائیور اور کوچوان اس پر نظریں پڑتے ہی سحر زدہ ہو کر رہ گئے۔

اس سے پہلے کہ ان کا سحر ٹوٹتا یا ناگن بہن سے کوئی بات کرتے اچانک ہی چکوال کا ڈپٹی کمشنر چوہدری امام دین پھاٹک سے نمودار ہوا۔ ناگن بہن کو دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا۔

ناگن بہن نے اسے پہلے ہی دیکھ لیا تھا اور ہونٹوں پر سحر ناک مسکراہٹ بکھیر کر حسین تتلی کی طرح ڈولتی ہوئی اس کے قریب پہنچ گئی۔

"ہیلو۔ کون ہیں آپ چکنے جوان۔" اس کے ایک ایک لفظ میں نقرئی گونج تھی۔ وہ کھڑی ہوئی تھی مگر اس کی ادائیں حقیقتاً ناگن ہی کی طرح بل کھانے لگی تھیں۔ "ہیلو جی

چکنے۔ کیا کھڑے کھڑے سو گئے۔" اسے مبہوت پا کر ناگن بہن نے اسے بازو سے پکڑ کر جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔

"آں۔ آپ' آپ بہت خوب صورت ہیں۔" امام دین چونکا اور فرش راہ ہوتے ہوئے بولا۔

"جی ہاں۔ وہ تو میں ہوں ویسے کم آپ بھی نہیں ہیں۔ وصی الدین سے زیادہ خوب صورت۔"

"وہ...... وصی الدین سے آپ کا...... آپ کا کیا رشتہ ہے......" امام دین کے لہجے میں وار فتگی اور انداز میں ہچکچاہٹ تھی۔

"کوئی بھی رشتہ نہیں ہے اور بہت ہی نازک رشتہ ہے بھی......"

"چلئے...... میرے ساتھ چلئے۔ دیکھئے کس غضب کی سردی ہے اور آپ' آپ کوئی گرم لباس بھی پہنے ہوئے نہیں ہیں۔ آپ کو نمونیا بھی ہو سکتا ہے۔" امام دین کی وار فتگی اور ہمدردی نے ناگن بہن کو کھل کھلا کر رکھ دیا۔

"آپ مجھے جانتے نہیں ہیں مسٹر......"

"چوہدری امام دین نام ہے میرا"

"بڑا ہی واہیات نام ہے۔ آپ کو سوٹ بھی نہیں کرتا......"

"جی بس وہ...... والدین کا رکھا ہوا نام ہے ناں...... "وہ فرط ندامت سے سمٹ سا گیا۔

"ہاں تو میں یہ کہہ رہی تھی کہ میں ہمالیہ کی ترائی میں نقطہ انجماد والے علاقے کی رہنے والی ہوں۔ یہاں کی سردی آپ کو تو نقصان پہنچا سکتی ہے مجھے نہیں......"

"چلئے نا ہم کہیں بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں......"

اس طرح امام دین ناگن بہن کو اپنے تئیں بہلا پھسلا کر حویلی کے اندر اپنے ذاتی بیڈ روم میں لے گیا اور ایک گھنٹے تک طرح طرح کے سوالات کرتا رہا ناگن بہن نے اس سے کوئی بات نہیں چھپائی۔ ظاہر یہ کیا جیسے وہ امام دین پر مرمٹی ہے۔

ناگن بہن نے اسے بتلایا کہ چوہدری ارسلان کو اور اس کے مددگاروں کو وصی الدین ہی نے قتل کیا ہے۔ پنڈت دھیراج اور اس کے چیلوں پر وصی الدین ہی نے دنیا کے خطرناک ترین سانپ کو چھوڑا تھا۔

وصی الدین ہی نے پنڈت دھیراج کی جادونگری کو تہس نہس کر کے بچوں اور عورتوں کو آزادی دلائی تھی اور ڈھوک ٹالیاں کی چیک پوسٹ سے فائل کو بھی وصی الدین نے غائب کروایا تھا۔

اور اب وہ اپنے باپ دادا اور بہنوں کا انتقام لینے کے لئے زیر قدم گاؤں میں پہنچ گیا ہے۔

ناگن بہن سے تمام اصلیت معلوم کر لینے کے بعد امام دین نے بے خود ہو کر ناگن بہن کو اپنی بانہوں میں سمیٹتے ہوئے کہا۔ "وصی الدین کو اسی کے خون میں نہلادوں گا جانمن مگر تم، تم مجھے چھوڑ کر نہ جانا ورنہ، ورنہ میں مر جاؤں گا دلبر جانیاں۔"

"مرنا تو تمہیں ہے امام دین۔ بہت ظلم کر لئے تم نے بہت سے لوگوں کی جائیدادیں ہضم کی ہیں۔ وصی الدین کی بہنوں سلیمہ اور نسیمہ کو تم ہی نے اغوا کروایا تھا ان کے دامن عصمت کو پہلے تم ہی نے تار تار کیا تھا للہذا اب تمہیں مر ہی جانا چاہیے۔"

"کیا بک رہی ہو......" وہ ناگن بہن کو بری طرح جھٹک کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"اوہو ناراض ہو گئے۔ اچھا ہٹاؤ ان باتوں کو آگے بڑھو اور مجھے اپنی بانہوں میں سمیٹ لو......"

امام دین کا غصہ ایک دم اتر گیا، اس نے فرط جذبات سے مغلوب ہو کر ناگن بہن کو اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔

☆☆☆

شب کے نو بجے تک بیٹھک آئینے کی طرح چمکا دی گئی۔ تین سانپ اور چند بچھو بھی مار دیئے گئے تھے۔ بیٹھک کی کرسیاں چونکہ گل چکی تھیں اس لیے میں نے پھنکوادی تھیں۔

میرے لئے بہترین قسم کا مرغن کھانا بھی میرے ابا کے دوست حاجی نور الدین کے گھر سے آچکا تھا۔ صرف میرے مہمانوں نے بڑی مہارت سے معذرت طلب کر لی تھی۔

تقریباً دس بجے تک مصروف رہنے کے بعد مجھے فرصت و تنہائی ملی۔ گاؤں والے جیسا کہ جلدی سو جانے کے عادی تھے اس لئے جا چکے تھے۔

ٹھیک اسی لمحے میری ناگن بھی آگئی۔ وہ بہت ہی خوش نظر آرہی تھی۔ میرے مہمان ناگن بہن کے احترام میں کھڑے ہو گئے۔ میں نے صاف محسوس کر لیا تھا کہ شرجیل' افراہیم' ڈیجور' صابرہ اور جمائمہ کو دیکھ کر ناگن بہن اور ناگن بہن کو دیکھ کر پانچوں بڑے ہی پراسرار انداز میں مسکرائے تھے۔ گو کہ بیٹھک میں کم از کم چھ پلنگ موجود تھے' صاف بھی کر دیئے گئے تھے تاہم ان کے گدے چادروں کے بغیر ناقابل استعمال تھے۔ میرے ساتھ صرف ایک ہی بستر تھا اس لئے میرے لیے پریشانی کی کوئی بات بھی نہیں تھی۔

ناگن بہن اور ڈیجور وغیرہ کی مجھے کوئی فکر نہ تھی۔ ظاہر ہے جنات کے رہن سہن کے اپنے ڈھنگ تھے اور سانپوں کا اپنا انداز تھا۔ بیٹھک میں ایک ہی پیٹرومیکس کی شوں شوں گونج رہی تھی۔ تین عدد لالٹینیں بھی تھیں۔

ناگن بہن نے یہیں پر بلا تکلف یا تذبذب کے آتشی مخلوق کے پانچ جنات کے سامنے وہ سب کچھ بتلا دیا تھا جو کہ آپ پچھلے باب میں پڑھ چکے ہیں۔

جب میں نے ناگن بہن سے اس کی وجہ پوچھی تو وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

"ویرا۔ ہم دونوں کی کیٹگری ایک ہے......" وہ ڈیجور وغیرہ کی طرف تکتے ہوئے بولی۔ "ہم سب پاتالوں' ویرانوں اور اجاڑ جگہوں کے رہنے والے ہیں۔ نہ تو آپ کے مہمان مجھے کوئی نقصان پہنچا سکتے ہیں اور نہ ہی میں انہیں کوئی نفع نقصان پہنچا سکتی ہوں۔

ہم دونوں ہی ماورائی قوتیں رکھتے ہیں' جون بدل سکتے ہیں اور تھوڑے سے فرق سے یکساں قوتیں رکھتے ہیں۔

اب بہتر یہی ہے کہ تم آرام کر لو......" کہتے ہوئے ناگن بہن اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ مسلسل مسکرا رہی تھی۔

"آپ کی بہن نے بالکل درست کہا ہے چغتائی صاحب ہم ایک دوسرے کو پہچان چکے تھے۔ ہم دونوں کے درمیان ایک نمایاں فرق یہ ہے کہ آپ کی بہن انسانوں کے درمیان رہ سکتی ہے مگر ہم نہیں رہ سکتے۔ ہماری وجہ سے انسان ہوش و حواس کھو بیٹھتا ہے' اپنے پرائے کی اسے پہچان نہیں رہتی وغیرہ وغیرہ......" دیجور کے الفاظ ختم ہوتے ہی پانچوں جنات میری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

گردن موڑ کر دیکھا تو ناگن بہن بھی غائب ہو چکی تھی۔ میں اس کے تازہ بہ تازہ کارنامے پر غور کرتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ ارادہ یہی تھا کہ لباس بدل لوں گا۔

میں نے اپنے سوٹ کیس سے سلیپنگ سوٹ نکال بھی لیا تھا کہ ایک اچانک خیال کے ذہن میں ابھرتے ہی فرط شرم سے میرا پورا وجود گرما گیا اور وہ خیال یہ تھا کہ جنی گنزا جو چوبیس گھنٹے میرے وجود میں رہتی ہے' مجھے کپڑے بدلتے دیکھتی ہو گی' میں حاجت روی کے لئے لیٹرین وغیرہ......

میں یہیں تک سوچ پایا تھا کہ بیٹھک میں گنزا کے نقرئی قہقہے گونج اٹھے میں مزید جھینپ گیا۔

"فضول باتوں میں نہ الجھئے چغتائی صاحب آپ کے جسم کا کوئی حصہ مجھ سے کبھی بھی پوشیدہ نہیں رہا اس لئے میں چھوٹی سی گڑیا کے روپ میں آپ کے سامنے آتی رہتی ہوں۔ مجھے آپ سے خوف لگتا تھا۔ آخر کو میں جنی ہوں' میں بھی بہک سکتی تھی۔ اگر ایک مرتبہ بھی وہ سب کچھ ہو جاتا جواب تک نہیں ہوا تو پھر آپ ہوش و حواس کھو بیٹھتے اور شاید زندگی میں کبھی بھی اپنا مشن پورا نہ کر پاتے۔"

آواز بند ہو گئی اور میں غریق حیاء ہوتے ہوئے بھی لباس بدلنے لگا۔

سلیپنگ سوٹ بدل کر میں نے پیٹرومیکس لیمپ بجھا دیا۔ ایک لالٹین بھی بجھا دی اور بقیہ دو کی لو ہلکی کر دی۔ اس طرح کرنے سے میرے اپنے پیروں کی چاپ مجھے ہر

طرف سے گونجتی محسوس ہوئی تھی۔ دو تین بار تو میں اپنا ہی سایہ دیوار پر دیکھ کر چونک پڑا تھا۔ سکوت کا یہ عالم تھا کہ میرے اپنے تنفس کی آواز بھنکار بنی ہوئی تھی۔ جو کچھ بھی تھا' میں نے چت لیٹ کر لحاف تان لیا۔ تھوڑی دیر بعد جب لحاف کی گرمی سے میری کپکپی ختم ہوئی تو میرا ذہن میرے باپ داد اور بھوں کی طرف مڑ گیا۔ میں ماضی کی یادوں میں اس قدر کھو گیا کہ مجھے سرہانے کی جانب سے میرے پلنگ کے اٹھنے کا احساس ہی نہیں ہو سکا۔

احساس تو مجھے اس وقت ہوا جب میں پھسلتا ہوا فرش کی طرف چلا۔ "کون ہے ؟......" میں بری طرح بوکھلا گیا۔ لحاف الٹ کر پیروں کے بل کھڑا ہو گیا۔

میرا کوڑا میرے ہاتھ میں دبا ہوا تھا۔ اس کوڑے کو کسی بھی لمحے کہیں بھی میں خود سے الگ نہیں کرتا تھا۔

میری آواز بیٹھک کی وسعتوں میں گونجتی ہوئی معدوم ہو گئی۔ کوئی جوابی آواز نہ ابھری کوئی بھی دکھائی نہ دیا۔ میرا پلنگ بھی درست حالت میں پڑا تھا۔

بیٹھک کی وسعتوں میں ہولناک خاموشی اور لالٹینوں کی سحر زدہ روشنی کے علاوہ اگر کوئی آواز تھی تو میرے اپنے تنفس کی آواز تھی۔

میں بے خوفی سے سر جھٹک کر پلنگ پر بیٹھ گیا۔ میں پوری طرح ہوش و حواس میں تھا اس لئے سرہانے کی طرف سے پلنگ اٹھنے کی حرکت کو واہمہ سمجھنے کے لئے تیار ہی نہ تھا۔

دو تین منٹ گزر گئے مجھ پر غنودگی غالب ہونے لگی۔ بالآخر میں نے آنکھیں بند کر لیں۔

اچانک رگوں میں خون منجمد کر دینے والی غراہٹ نے میرے ذہن کی غنودگی کو پارہ پارہ کر دیا۔ میرے دل کی دھڑکنیں حادثاتی طور پر تیز ہو گئیں۔

میں ایک بار پھر اٹھ بیٹھا۔ بیٹھتے ہی میری متوحش نظریں میرے پائنتی جانب رکھے ہوئے ٹیبل پر پڑیں۔ ٹیبل پر بھورے رنگ کا بلا بیٹھا ہوا اپنی خون اگلتی آنکھوں سے میری طرف تک رہا تھا۔ نہیں بلکہ مجھ پر جست لگانے ہی والا تھا۔

میری سانس اکھڑنے سی لگی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے جسم سے جان نکل گئی ہے۔ یا پھر ہو سکتا ہے بھورے بلے کی خونخوار آنکھوں سے نکلنے والی غیر مرئی شعاعوں نے مجھے ہپناٹائیز کر دیا ہو۔

جو کچھ بھی تھا' بھورے بلے کے کھلے ہوئے منہ سے ایک اور غراہٹ بلند ہوئی یہ غراہٹ پہلی والی غراہٹ سے بھی کہیں زیادہ بھیانک تھی' اس کے ساتھ ہی بھورے بلے نے مجھ پر جست لگادی۔

میری پشت سے درودیوار پر لرزہ طاری کرتی ہوئی ایک اور غراہٹ ابھری۔ ساتھ ہی میں نے صاف محسوس کیا کہ میرے سر سے کوئی قوت اڑتی ہوئی گزری ہے اور اس سے پہلے کہ بھورا بلا میرے پلنگ کے قریب پہنچتا' میرے سر سے اڑنے والی قوت درمیان ہی میں اس سے ٹکرا گئی۔

اف...... اف وہ بھی بلا تھا چتکبرا بلا۔ بھورے بلے کی جسامت سے کچھ ہی بڑا۔ ٹھیک اسی لمحے میرا سکوت ٹوٹ گیا اور میں بلے ہی کی طرح چھال مار کر اٹھ کھڑا ہوا یہ سب کچھ ایک لمحے کے آٹھویں حصے میں ہو گیا۔

دونوں بلے باہم گتھم گتھا ہو کر زمین پر گر پڑے اور لوٹ پوٹ ہونے لگے ان کے حلق سے نکلنے والی آوازوں نے قیامت صغریٰ سی مچا کر رکھ دی۔ وہ ایک دوسرے سے الگ ہی نہیں ہو رہے تھے۔ ایک دوسرے کے نرخرے دبو چنے کی جدوجہد میں مصروف تھے۔ کبھی وہ لڑتے بھڑتے ہوئے پلنگ کے نیچے چلے جاتے تو کبھی کرسیوں کے نیچے۔

کرسیاں گرتی رہیں' زمین کانپتی رہی' فضاء تھراتی رہی اور میں کوڑے پر گرفت مضبوط کئے ادھر سے ادھر اچھلتا رہا۔ مجھے موقعہ ہی نہیں مل رہا تھا کہ بھورے بلے پر ضرب لگا سکتا۔

پورے بیٹھک کی چیزیں الٹ پلٹ ہو گئیں۔ خون کے چھینٹے بھی ادھر ادھر فرش پر گرتے چنگاریوں کی طرح چمکتے اور غائب ہوتے رہے۔

میرا اندازہ اگر غلط نہیں ہے تو دونوں بلوں کی جنگ دس منٹ تک جاری رہی

تھی۔

گیارہویں منٹ کے شروع ہوتے ہی بھورابلا فرش پر پڑا ہوا جھٹکے لے رہا تھا۔ اس کا نرخرہ کھلا ہوا تھا اور انتڑیاں پیٹ سے باہر لٹک رہی تھیں۔ مسلسل تڑپتے رہنے کے بعد بھورابلا ساکت و جامد ہو گیا۔ اس دوران چتکبرا بلا ایک لمحے کے لئے اس کے قریب سے نہیں ہٹا تھا۔ اس کی زبان لٹک رہی تھی آنکھوں سے شعلے سے نکل رہے تھے اور وہ بہت بری طرح سہک رہا تھا۔

معاً بھورے بلے کے وجود سے ایک بڑا سا شعلہ بلند ہوا اور چھت سے ٹکرا کر غائب ہو گیا۔

میں نے جونہی چھت سے نظریں ہٹائیں چتکبرے بلے کی جگہ شرجیل کھڑا نظر آیا۔

اس کی آنکھیں بدستور شعلہ بار تھیں' وہ بدستور ہانپ بھی رہا تھا اور اس کا پورا چہرہ پسینے میں ڈوبا ہوا تھا البتہ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

"یہ حملہ آور بلا شر تھا چغتائی صاحب......" شرجیل بولا۔ اس کی آواز اور لہجے میں ایسی دہشت تھی کہ میں جھرجھرا گیا۔ "یہ اس وقت بیٹھک کی چھت والے سائبان پر بیٹھا وہاں بھی آپ کو تک رہا تھا جب آپ جیپ سے اتر کر گاؤں والوں سے بغلگیر ہو رہے تھے۔ ہمارے تانگے کو دیکھ کر یہ دبک گیا تھا مگر میں نہ صرف یہ کہ اس کی موجودگی کو محسوس کر چکا تھا بلکہ اسے دیکھ بھی چکا تھا۔

تینوں سانپ اور تمام بچھو اسی کی غیر مرئی قوت سے متاثر ہو کر بیٹھک کی صفائی کرنے والوں پر حملہ آور ہوئے تھے۔

گو کہ بھورابلا بھی ہماری مخلوق سے متعلق ہے مگر وہ عزازیل کے جتھے سے تعلق رکھنے کے باعث شر کہلایا۔

اس کا ٹھکانہ یہی بیٹھک تھا۔ وہ آپ کو مار ڈالتا حالانکہ وہ آپ کے جسم کو چھو بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ گنڈا آپ کے وجود میں موجود ہے وہ آپ کا بچاؤ ضرور کرتی مگر اس کے

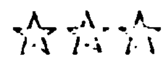
زخمی ہونے یا مٹ جانے کے
امکانات تھے۔

آپ کو بلے نے مبہوت اس لئے کر دیا تھا کہ جنگز اپنی موجودگی کو اس سے محفوظ رکھنے میں مصروف ہو گئی تھی۔

آپ کو ختم کرنے کے بعد یہ مردود ان جوانوں کی زندگیاں بھی برباد کر دیتا جنہوں نے سانپوں اور بچھوؤں کو مارا تھا۔ وہ دیکھیئے آپ کی ناگن بہن آپ کے ہیٹ پر بیٹھی ہوئی تشکر کے آنسو بہا رہی ہے......" شرجیل کے متوجہ کرنے پر میں نے فوراً ہی گردن موڑی۔ واقعی میری بہن میرے ہیٹ پر کنڈلی ماری بیٹھی تھی اور اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔ "یہ محترمہ اس وقت بیٹھک میں پہنچی جب بھورے بلے کے روپ میں شیطان نے آپ پر چھلانگ لگا دی تھی۔

"اگر میں فوراً ہی اس کا حملہ نہ روکتا تو آپ کی ناگن بہن بالضرور بھورے جن پر جھپٹ پڑتی۔

فرط مسرت سے میری آنکھیں بھی ڈبڈبا گئیں۔ میں بے ساختہ ناگن بہن کی طرف بڑھا' وہ جون بدل کر انسانی روپ میں آگئی اور ویران ویرا کہتی ہوئی مجھ سے لپٹ گئی۔ اسی موقعے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے شرجیل غائب ہو چکا تھا۔



ناگن بہن سورج طلوع ہونے تک میرے ساتھ رہی' اس وقت وہ میرے لحاف سے اتری جب بیٹھک کا دروازہ دھڑ دھڑایا گیا۔ وہ زمین پر اترتے اترتے انسانی روپ میں دروازے کی طرف بڑھ گئی اور میں ایک طویل جماہی لے کر اٹھ بیٹھا۔

وہ حاجی نور الدین تھے۔ میرے ابا کے جگری یار۔ ان کے ساتھ دو نو عمر لڑکے تھے اور دونوں نو عمر لڑکے بھاپ اڑاتے گرم پانی کی بالٹی پکڑے ہوئے تھے۔

"سلام چاچا......" ناگن بہن نے سر جھکاتے ہوئے سلام کیا۔

قطع نظر اس کے میں لحاف جھٹک کر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ مجھے حاجی نور الدین سے

ابامرحوم کے دوست ہونے کے ناطے بہت زیادہ عقیدت تھی۔

"وعلیکم السلام وہی اے جیوندی رہو.... "حاجی صاحب نے بڑے محبت سے جواب دیااور ناگن بہن کے سر پر شفقت بھرا ہاتھ رکھ دیا۔

میں نے پوری عقیدت واحترام سے حاجی صاحب کو پلنگ پر بٹھایااور گرم پانی کی بالٹی لے کر ملحقہ باتھ روم میں داخل ہو گیا۔

ساتویں منٹ پر میں کپڑے بدل کر حاجی صاحب کے قریب آن بیٹھا۔"ناشتہ آ رہاہے پترا۔کسی چیز کی بھی ضرورت پڑے تواپنا گھر سمجھ کر طلب کر لینا......"

"ضرور طلب کروں گا چاچا'آپ میرے اباجی جو ٹھہرے......"

"آہو پترا۔ایک نئی بات کا پتہ چلا ہے...... "وہ سنجیدہ ہو گئے۔

"وہ کیا چاچا؟......"

"گاؤں میں افواہ اڑی ہوئی ہے کہ چوہدری امام دین کو سانپ نے ڈس لیاہے'وہ مرچکا ہے......"

"اوہ......لیکن چاچا یہ کیسے پتہ چلا کہ امام دین کو سانپ نے ڈسا ہے؟......"

"پتہ نہیں پترا۔کہتے ہیں اس کے جسم کا سارا گوشت جھڑ چکا ہے اور تو اور جس شخص نے امام دین کے جسم سے کوٹ اتارنا چاہا تھا وہ بھی نیلا پڑ گیااور وہیں تڑپ تڑپ کر مر گیا......"

"چاچا برائی کا انجام براہی ہوتا ہے۔

"آہو پترا۔سنا ہے کوئی وانسراء ہیلی کاپٹر کے ذریعے پہنچنے والا ہے۔ایک انگریز آفیسر البرٹ نام کا پہنچ چکا ہے۔تعجب کی بات تو یہ ہے کہ امام دین کی بیوی اور بہوؤں کی آنکھوں سے آنسو کا ایک قطرہ بھی نہیں گرا...... "غرضیکہ ناشتے کے اختتام تک چوہدری امام دین ہی کا تذکرہ ہوتا رہا تھا۔میں گیارہ بجے سے پہلے بیٹھک سے نہیں نکل سکا تھا اس لئے کہ میں نے گاؤں کے مشہور مستری کو بلا کر اس کے ساتھ معاملات طے کئے تھے۔

چونکہ بیٹھک کی دیواروں کا جگہ جگہ سے پلاسٹر ادھڑ چکا تھا۔دروازوں اور دیگر

فرنیچر کی پالش وغیرہ بھی اتر چکی تھی اس لئے ضروری سمجھا کہ پہلے بیٹھک کو درست کرواؤں۔

اندرونی کمروں کا نہ تو میں نے جائزہ لیا اور نہ ہی اس طرف جانے کی ضرورت محسوس کی۔ سوچا بیٹھک یعنی ڈرائنگ ہال کو درست کروانے کے بعد ہی پوری حویلی کی مرمت یا ٹوٹ پھوٹ کا ٹھیکہ دوں گا۔

اپنے خاص الخاص مہمانوں کو میں نے وہیں چھوڑا اور ناگن بہن کے ہمراہ جیپ میں سوار ہو کر چوہدری نظام کی حویلی کی طرف روانہ ہوا۔ ابھی میں چند ہی موڑ مڑنے پایا تھا کہ میری نظریں ایک وکٹوریہ گاڑی پر پڑیں جس میں دو گھوڑے جتے ہوئے تھے۔

گاڑی میں چار پانچ بچوں سمیت چار جوان عورتیں بھی سوار تھیں اور شاید وہ باغ والی حویلی کی طرف جانا چاہتی ہوں گی لیکن چونکہ راستہ کشادہ نہ تھا اس لئے کوچوان نے وکٹوریہ کو میری جیپ سے چند قدم پہلے ہی روک دیا تھا۔

گھوڑے مچل رہے تھے' ہنہنا اور پھنکار رہے تھے۔ دھوپ کی شدت کی وجہ سے سردی گو کہ قابل برداشت تھی اس کے باوجود گاڑی میں سوار عورتیں اور بچے دیدہ زیب قیمتی شالوں میں لپٹے ہوئے تھے۔

گزرگاہ کے دائیں بائیں گزرتے ہوئے اکا دکا دیہاتی گاڑی سواروں کو سلام کرتے ہوئے گزر رہے تھے۔

''او جوانا ... ''میں نے کوچوان کو آواز دی۔ ''گڈی پچھا کر...... ''میں نے جملہ مکمل کر دیا۔

پھر' اس سے پہلے کہ کوچوان جواب دیتا' گاڑی سواروں میں سے ایک جوان سی لڑکی سیٹ سے

اٹھی اور انتہائی مہذبانہ انداز میں بول اٹھی۔ ''محترم اجنبی۔ آپ ہی جیپ کو ریورس میں لے جائیں۔ بگھی کس طرح پیچھے ہٹے گی۔''

وہ جب سیٹ سے اٹھی تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے سیاہ بدلی سے چاند نمودار ہوا

ہو۔ اس کا یہ حسن و جمال اپنی جگہ' میرے ذہن پر چھاکے کی وجہ اس کے چہرے کے خدوخال تھے۔ وہ ہوبہو گنزا تھی۔ وہی جنی گنزا جس کے وصل کا میں دیوانہ تھا۔ جس کی ایک ہلکی سی مسکراہٹ سے میری کائنات حیات جھوم اٹھتی تھی۔ ایک طرح سے مجھ پر سکتہ سا طاری ہو گیا تھا۔

"ہوش میں آؤ ویرا۔ یہ چوہدری نظام کی چھوٹی بیٹی اور شازیہ کی سگی بہن سلیمہ بانو ہے......" ناگن بہن کی آواز سن کر میں بری طرح چونکا۔

"آں۔ نن' نہیں آپا یہ گنزا ہے' جنی گنزا جس کے وصل کا میں دیوانہ ہوں آپا۔ یہ...... یہ چوہدری نظام کی بیٹی نہیں ہے......"

"اوہ...... آج مجھے پتہ چلا کہ جنی گنزا کا رنگ وروپ ایسا ہے۔ اب ہوش میں آجاؤ ویرا۔ دیکھو' وکٹوریہ کی پشت پر ایک جیپ اور ایک ٹرک آرہا ہے۔ جیپ میں البرٹ ہیکل اور پنجاب کا وائسرائے سوار ہے۔ ٹرک میں بیس پولیس کے مسلح جوان سوار ہیں اور یہ سب ہم دونوں کو امام دین کے قتل کے الزام میں گرفتار کرنے آرہے ہیں۔"

میں نے ناگن بہن کی آواز سنی ان سنی کر دی اور پلکیں جھپکائے بغیر گنزا کو تکتا رہا۔ حیرت انگیز طور پر وہ بھی لبوں پر ملکوتی تبسم لئے مجھ ہی کو تکتی رہی تھی۔

چونکا میں اس وقت جب وائسرائے کے ماتحت میری جیپ کو گھیر کر میری طرف بندوقیں تان کر کھڑے ہو گئے۔

"کیا بدتمیزی ہے یہ کیوں گھیرا ہے مجھے؟" میں اپنی یہ بے عزتی برداشت نہ کر سکا اور غصیلی آواز میں بولا۔

کسی نے جواب نہیں دیا بلکہ جیپ سے اتر کر ایک لمبا تڑنگا انگریز تھری پیس سوٹ میں ملبوس میرے پاس پہنچ گیا۔

"یہ بدتمیزی نہیں ہے مسٹر میجر بلکہ قانونی کارروائی ہے......" "کون سا قانون توڑا ہے میں نے اور تم کون ہو؟"

"آپ پر بہت سے لوگوں کے قتل کا الزام ہے میجر۔ یہ جو آپ کے ساتھ خوب صورت لڑکی بیٹھی ہے' چوہدری امام دین کی قاتل ہے۔ مجھے پہچانو میجر' میں پنجاب کا وائسرائے ہوں ....."

"سنو سدرہ میرا نام وصی الدین ہے....." میں وائسرائے کو کوئی جواب دیئے بغیر وکٹوریہ میں کھڑی ہوئی حسینہ سے مخاطب ہوا جس کے لبوں سے مسکراہٹ غائب ہو چکی تھی اور حیرت چھا گئی تھی۔

"رفیع الدین کا بیٹا اور عماد الدین کا پوتا ہوں' سلیمہ اور نسیمہ کا چھوٹا بھائی ہوں۔ بہت ہی بھیانک انتقام لوں گا اپنے پیاروں کے قاتلوں سے میرا انتظار کرنا سدرہ میں جلد ہی آؤں گا اور تجھے دلہن بنا کر لے جاؤں گا۔" "اے مسٹر وائسرائے......" میرے لہجے میں بادلوں کی گرج سما گئی۔ "اپنے ان شکاری کتوں سے کہو پیچھے ہٹ جائیں......"

"اور اگر میں انکار کر دوں تو......" وائسرائے سفاکانہ مسکراہٹ سے بولا۔ "میں تمہارے ان کتوں کی لاشیں بچھا دوں گا۔ میں جانتا ہوں تو ہلاکو کے چیلے چوہدری نظام کا پالتو کتا ہے......" میرے الفاظ نے وائسراء۔ کے وجود پر کپکپی طاری کر دی تھی۔ غالباً نہیں بلکہ حقیقتاً چند حسین ترین عورتوں کے سامنے ذلت اٹھانے پر وہ غضبناک ہو گیا تھا۔ سدرہ مجھے بہت ہی دلفریب مسکراہٹ سے دیکھ رہی تھی۔ "وہ چوہدری نظام جس نے میرے دادا عماد الدین چغتائی کو محض اس لئے قتل کروا دیا تھا کہ انہوں نے میری بہنوں کا رشتہ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ میرے بابا کو اس لئے قتل کروا دیا کہ انہوں نے شوگر ملوں' کھیتوں اور دکانوں کو بیچنے سے انکار کر دیا تھا۔ میری بہنوں کو اس لئے اغواء کروایا کہ میرے ابا کو بلیک میل کر سکے۔ وہ اپنے شیطانی مقاصد میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے میرے بابا کا سب کچھ ہتھیا لیا اور میری بہنوں کی عصمت پامال کر کے انہیں اپنے شکاری کتوں کے سامنے ڈال دیا۔ اور سور کھانے والے وائسرائے تجھ میں ہمت ہے تو چوہدری نظام کو گرفتار کر لے۔ اس کے زندہ بچ رہنے والے باقی دونوں بھیڑیوں کو گرفتار کر لے۔ میں عدالت میں ان کے سارے جرم ثابت کر دکھاؤں گا۔ البرٹ ہیکل۔ میں شعلہ جوالا سا بن گیا تھا جملے

کے آخری الفاظ میں نے البرٹ ہیکل کو مخاطب کر کے کہے جو وائسرائے کے ساتھ کھڑا ہوا بے قراری سے ہتھیلیاں مل رہا تھا۔ بتاؤ...... تمہارے وائسرائے کو بتلاؤ کہ نظام اور اس کے بیٹوں کے کرتوت کیا ہیں۔ پنڈت دھیراج اگھوری کی اصلیت کیا تھی' وہ چوہدری نظام کی مدد کیوں کرتا تھا۔ مت گھبراؤ البرٹ' تمام ثبوت اور اقبالی بیانات والا فائل میرے پاس محفوظ ہے۔ میرے پاس اور بھی بہت سارے ثبوت ہیں۔ جاؤ اور ڈھوک نالیاں میں واقع چوہدری نظام کے عقوبت خانے پر ریڈ کر دو۔ بالکل فکر مند نہ ہونا۔ میں نے رات ہی میں وسیع حیطہ عمل والے ٹرانسمیٹر پر برطانیہ کی ملکہ اور وزیر خارجہ سے بات کر لی ہے۔ یہ وائسرائے صرف آج کے دن وائسرائے رہے گا کل سے رابرٹ ہڈسن پنجاب کا وائسرائے بن جائے گا......"

الفاظ کے اختتام کے ساتھ ہی میں ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا اور ریورس گیئر میں جیپ اس قدر پیچھے لے گیا کہ وکٹوریہ بڑی آسانی سے میری جیپ کے قریب سے گزر گئی۔

سدرہ بدستور میری طرف تک رہی تھی اس کے لبوں پر ملکوتی تبسم بکھرا ہوا تھا۔

جونہی وکٹوریہ میری جیپ کے قریب سے گزری سدرہ نے اپنے ساتھ بیٹھی ایک اور قیامت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔" یہ میری بہن شازیہ ہے اور سلطان خان کو دل دے بیٹھی ہے......" "اف خدایا......" میں دل سوز کراہ کے ساتھ ناگن بہن کی طرف متوجہ ہو گیا۔ "میں' کیسے یقین کروں آپا کہ یہ گزرا نہیں ہے؟ وہی لباس' وہی آواز' وہی مسکراہٹ اور وہی شرم و حیاء"

" جیپ آگے بڑھاؤ ویرا۔ اس موضوع پر پھر کبھی فرصت میں بات کریں گے۔ سامنے دیکھو' وائسرائے شکست خوردہ انداز میں مڑ کر ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ رہا ہے' کیونکہ البرٹ ہیکل تمہارے حکم کی تعمیل میں نکل پڑا ہے۔ بہت سے مسلح کانسٹیبل اسی کے ساتھ جا رہے ہیں۔"



سجے سجے کار ہو گئی میرے گاؤں کے جن پچاسوں لوگوں نے ایک انگریز عملدار کو

ذلت اٹھاتے دوسرے انگریز عملدار کو میرے سامنے اٹینشن ہوتے اور چوہدری نظام کے لئے میرے ریمارکس سنے۔ انہوں نے پورے گاؤں میں میرے نام کے نعرے لگوا دیئے۔ لیکن میں کسی خوش فہمی میں مبتلا ہوئے بغیر سوچتا رہ گیا کہ کیا واقعی رامن ہڈسن کل تک لاہور پہنچ جائے گا۔

یہ حقیقت تھی کہ میں نے وسیع حیطہ عمل والے ٹرانسمیٹر پر برطانیہ کے وزیرِ خارجہ سے بات کی تھی' اسی کے توسط ملکہ سے بھی بات کی۔ انہیں موجودہ وائسرائے کے حوالے سے کچھ ایسی بامقصد باتیں کہیں جو جنوبی ایشیاء میں تاجِ برطانیہ کی ذلت کا باعث بن سکتی تھیں۔

''کیا سوچ رہے ہو ویرا؟'' ناگن بہن نے مجھے مخاطب کیا۔ اس وقت تک ہم چوہدری نظام کی حویلی تک پہنچ چکے تھے۔ ہر طرف شکست خوردہ پولیس کے جوان' پچاسوں گاؤں والے اور پچاسوں ہی اطراف کے گاؤں کے زمیندار' نمبردار اور بیوپاری نظر آئے۔ حویلی سے باہر ہی شامیانے لگے ہوئے تھے۔ بالیقین سب ہی لوگ چوہدری امام کی تعزیت کے لئے پہنچے ہوں گے۔

شامیانوں کے اطراف میں بہت سے تانگے' جیپیں اور گھوڑے بھی تھے جن کی ہنہناہٹ کے ساتھ ناک نتھنوں سے بھاپ بھی نکل رہی تھی۔ اسی بھاپ کے تحت اندازہ ہوتا کہ سردی اپنے پورے شباب پر ہے۔

میں نے بھی ایک کھلی جگہ پر جیپ روک دی اور ناگن بہن سمیت قناطوں کا طواف کرتے ہوئے لوگوں کے ہجوم میں پہنچ گیا سب ہی لوگ میری طرف متوجہ ہو گئے اور اس قدر متاثر بھی ہوئے کہ احتراماً کھڑے ہو گئے۔

''کوئی ملازم ہے جو میری بہن کو زنان خانے تک پہنچادے؟......'' میں فرداً فرداً ہر ایک سے مصافحہ کرتے ہوئے بولا۔ کئی حویلی کے ملازم موجود تھے۔ ان میں سے ایک کے ساتھ میری بہن لوگوں کے ضرمن ضبط پر بجلیاں گراتی ہوئی چلی گئی۔

دوسرے ملازم سے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ چوہدری نظام اپنے دو بیٹوں سمیت

شامیانے ہی میں موجود تھا کہ وائسرائے اور دیگر انگریزوں کے ہمراہ بیٹھک میں چلا گیا ہے۔

میں نے ملازم سے کہا کہ اسے میری آمد سے مطلع کر دیا جائے ملازم جلد ہی لوٹ آیا اور جب میں حویلی کے بڑے پھاٹک کو عبور کر کے ڈیوڑھی کے دروازے تک پہنچا ہی تھا کہ چوہدری نظام اپنے دونوں بیٹوں چوہدری عبدالسلام اور چوہدری بہرام سمیت میرے استقبال کو دروازے ہی پر موجود تھا۔

چوہدری نظام پر نظریں پڑتے ہی میرے خون میں انگارے سے دوڑ گئے مگر موقعے کی نزاکت کے تحت مجھے خون کے گھونٹ پینے پڑ گئے۔

چوہدری نظام پورے تپاک سے مجھ سے ملا' میرے کندھے سے سر لگا کر زار و قطار رونے لگا۔ اسے روتے' بلبلاتے دیکھ کر قدرتی طور پر میرا دل بھی پسیج گیا' میری آنکھیں بھی بھر آگئیں۔ عبدالسلام اور بہرام بھی غم سے نڈھال ہونے کے باوجود مجھ سے بڑی گرمجوشی سے ملے اور مجھے اس عزت و احترام سے اندرونی حصے کی طرف لے چلے جیسے میں ان کا پیرو مرشد ہوں۔ بیٹھک میں کم و بیش بارہ انگریز بیٹھے تھے' ان ہی میں پنجاب کا وائسرائے بھی موجود تھا جس کا ہیلی کاپٹر میں حویلی کے گرین اسپاٹ صحن میں دیکھ چکا تھا۔

وائسرائے کے کانوں پر ہیڈ فون چڑھا ہوا تھا جس کے وائر ٹیبل پر رکھے ہوئے ٹرانسمٹر سیٹ سے منسلک تھے۔

شاید اس سے میری آمد کو مخفی رکھا گیا تھا' یہی وجہ تھی کہ مجھے دیکھتے ہی اس کے چہرے پر ہوائیاں سی اڑنے لگی تھیں۔ وہ اور اس کے دیگر گیارہ حواری احتراماً اٹھ کھڑے ہوئے۔

نصف گھنٹہ فاتحہ وغیرہ کی نذر ہو گیا۔ اس نصف گھنٹے میں وائسرائے کا چہرہ کئی رنگ بدل چکا تھا۔

''ڈیل مسٹر میجر۔ برٹش وزیر خارجہ کے حکم کے بموجب مجھے آج ہی برطانیہ روانہ ہو جانا ہے اس لئے میں اپنی گستاخی پر معذرت چاہتا ہوں۔ وائسرائے چہرے پر خجالت کے آثار لئے خادمانہ لہجے میں بولا۔ ''میں کن ناگزیر وجوہ کی بناء پر چوہدری نظام کی غلامی کرنے

لگا تھا۔ چوہدری اور اس کے ان دونوں بیٹوں کی ضد تھی کہ آپ کو پابہ زنجیر ان کے سامنے پیش کیا جائے ...."

"بند کرو بکواس ....." چوہدری بہرام غصے سے بیچ و تاب کھاتے ہوئے غرایا۔ چوہدری نظام اور اس کے دونوں بیٹے چونکہ انگریزی زبان پر عبور رکھتے تھے اس لئے تلملاتے رہ گئے۔ چوہدری نظام کا چہرہ تو بالکل سفید پڑ چکا تھا۔

"یہ سراسر جھوٹ کہہ رہا ہے وصی الدین ....." بہرام میری طرف متوجہ ہوا۔ وہ ٹھیٹ پنجابی میں بول رہا تھا۔ "جس کے ساتھ ہم بچپن میں کھیلتے رہے' ایک ساتھ پڑھتے رہے تھے کیا اس کے متعلق ہم غلط سوچ سکتے ہیں؟ یہ مکار آدمی ہمارے درمیان نفاق کی دیوار کھڑی کر رہا ہے۔ جا رہا ہے ناں' اس کی حکومت جو ختم ہو گئی ہے اس لئے جاتے جاتے بھی کمینگی سے باز نہیں آ رہا....." بہرام کے الفاظ ختم ہوئے ہی تھے کہ وانسرائے کے جسم کو ایک زبردست جھٹکا لگا۔

سب ہی لوگ چونک کر اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اس کا جسم خشک پتے کی طرح کانپنے لگا تھا اور چہرے پر شدید کرب کے آثار چھا گئے تھے۔ ٹھیک اسی لمحے میری نظریں کرسی کے نیچے قالین پر پڑیں اور بڑی تیزی سے ناگن کو اندھیرے میں رینگتے دیکھ کر میرے لبوں سے تھکا دینے والی سانس خارج ہو گئی۔

وانسرائے دھپ سے زمین پر گر گیا اور لرزنے لگا۔ چوہدری نظام اور اس کے دونوں بیٹوں پر اس اچانک پڑنے والی افتاد نے سکتہ سا طاری کر دیا تھا جب کہ گیارہ انگریز بے تابانہ اپنی کرسیوں سے اٹھ اٹھ کر تڑپتے وانسرائے کے گرد جمع ہو گئے۔

میں اس لئے گم صم کھڑا رہا کہ وانسرائے کو میں نے اپنے ہاتھوں سزا دینی تھی' ناگن بہن کو جلد بازی ....

یہیں تک سوچنے پایا تھا کہ اچانک میرے ذہن کے تاریک گوشے کھل گئے۔ مجھے یاد آیا کہ وانسرائے نے فوراً ہیلی کاپٹر کے ذریعے چلے جانا تھا۔ پتہ نہیں وہ چکوال میں لینڈ کرتا' جہلم چلا جاتا یا پھر ڈائریکٹ پرواز سے راولپنڈی یا لاہور جا پہنچتا۔ میں اس کا تعاقب تو

کر ہی نہیں سکتا تھا۔ اس طرح وہ میرے انتقام سے محفوظ ہو جاتا۔ شاید بلکہ یقیناً ناگن بہن نے یہی سوچ کر اسے ڈس لیا ہے۔ ذرا سی دیر میں اندر باہر کہرام سا برپا ہو گیا۔ چوہدری نظام اور اس کے بیٹوں پر گویا ہسٹریائی دورے پڑنے لگے۔ سب کی متفقہ رائے یہی تھی کہ وانسرائے کو انتہائی مہلک زہر رکھنے والے کسی ناگ نے ڈس لیا ہے اور یہ کہ وہ ناگ حویلی ہی میں کہیں موجود ہے۔

اس لئے کہ رات میں اس نے امام دین کو ڈس لیا' اس کی لاش کا تمام گوشت جھڑ کر بدبودار سیال میں بدل گیا اور اب وانسرائے کا گوشت جھڑ جھڑ کر اس کے لباس میں جمع ہو رہا تھا۔

''معاف کریں پترا...... '' چوہدری نظام اپنا لرزتا ہوا ہاتھ میرے کندھے پر رکھتے ہوئے بولا۔ ''میرا دماغ پھٹنے لگا ہے۔ میں آپ کو وہ کمپنی نہیں دے سکا جس کے آپ مستحق ہیں۔ اگر آپ...... ''

''کوئی بات نہیں چوہدری صاحب...... ''میں نظام کا جملہ اچکتے ہوئے بولا۔ ''میں جا رہا ہوں' مجھے حویلی کی صفائی وغیرہ کروانی ہے۔ آپ صرف اتنی زحمت کریں کہ میری بہن سلیمہ کو زنان خانے سے بلوا دیں...... ''سلیمہ' کا نام سنتے ہی نہ صرف چوہدری نظام بلکہ اس کے دونوں بیٹوں کے ذہنوں پر برف سی جم گئی ہو گی۔ تینوں کے چہرے شدید حیرت اور خوف سے سفید پڑ چکے تھے۔ پھر' ان کی یہ حیرت و خوف اس وقت بالکل ہی مٹ گئے جب ناگن بہن اندرونی دروازے سے نمودار ہوتے ہوئے بولی۔ ''چلو ویرا' بہت دیر ہو گئی ہے...... ''

''یہ...... یہی میری بہن سلیمہ ہے چوہدری صاحب اس کے شوہر کو ایک سازش کے تحت قتل کروا دیا گیا تھا۔ تب سے یہ میرے ساتھ ہی رہتی ہے۔ چلو آپا...... ''

میں ناگن بہن کے ساتھ چل دیا۔ میں محسوس کر چکا تھا کہ عبدالسلام اور بہرام بڑی پر ہوس نظروں سے ناگن بہن کو تک رہے تھے۔ جیپ اسٹارٹ کر کے جب ہم آگے بڑھے تو ناگن بہن مجھ سے مخاطب ہوئی۔ ''ناراض ہو مجھ سے...... ؟''

''نن' نہیں آپا مم۔ مگر آپ نے یہ کیوں پوچھا میں چونکتے ہوئے بولا۔ اس لئے کہ میں وائسرائے کو۔ اوہ نہیں آپا نہیں یہ دکھ ضرور ہے مجھے کہ اسے سزا نہ دے سکا۔ تاہم خوشی اس لئے ہے کہ اب برطانیہ میں اس کا ڈھانچا ہی جائے گا۔ مگر آپا آپ کچھ کچھ اداس سی لگ رہی ہیں......''

''ہاں ویرا۔ زنان خانے میں چند مانگنے والی خانہ بدوش عورتیں بھی آئی تھیں۔ انہوں نے عبدالسلام کی بیوی کو بتلایا ہے کہ حویلی میں ایک ناگن موجود ہے حالانکہ انہوں نے میری طرف دیکھا تھا مگر شاید پہچان نہ سکیں۔ یہ خانہ بدوش گاؤں کے جنوبی کنارے پر ڈیرہ ڈالے ہوئے ہیں۔ خدشہ ہے کہ میری تلاش شروع نہ کر دیں......''

''ہوں۔ بالفرض وہ تمہیں تلاش کر لیتے ہیں تو......

''تو مجھے تم سے جدا ہونا پڑ جائے گا...... اور میں تم سے الگ نہیں ہونا چاہتی۔ اتنے سارے خانہ بدوشوں کو ڈس کر جہنم کی حقدار بھی بننا نہیں چاہتی۔ میں تمہارے بچوں کو دیکھنا چاہتی ہوں۔ انہیں لوریاں سنانا چاہتی ہوں......''

''ارے آپا۔ اللہ نے چاہا تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا......''



''آپا......'' میری حویلی کی بیٹھک میں پہنچتے ہی میں نے ناگن بہن کو مخاطب۔

''جی ویرا......''

''اگر آپ اجازت دیں تو میں اپنے باغ کی سیر کر آؤں...... ؟''

''ہوں۔ مجھے معلوم تھا وہ باغ چوہدری نظام کا نہیں بلکہ تمہارا ہے۔ جاؤ ویرا میں جانتی ہوں تم وہاں کیوں جانا چاہتے ہو......''

''نہیں آپا میں سدرہ سے ملنے نہیں جا رہا بلکہ میں کچھ اور کرنے جا رہا ہوں۔ آپ صرف یہ وعدہ کریں کہ میرا تعاقب نہیں کریں گی۔ ناگن بہن نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ سر جھکائے کچھ سوچتی رہی۔ ''ٹھیک ہے ویرا۔ میں وعدہ کرتی ہوں۔ مطمئن اس لئے ہوں کہ گنزا سمیت دو مزید جنیاں اور تین جنات تمہاری پشت پر موجود ہیں۔'' میں خوش

ہو گیا اور بیٹھک سے نکلا چلا گیا۔

دو بجنے والے تھے' مجھے بھوک بھی لگی ہوئی تھی مگر بھوک سے زیادہ مجھے میری ناگن بہن کے تحفظ کی فکر تھی۔ میں نے ناگن بہن کی اداسی سے اندازہ لگالیا تھا کہ خانہ بدوش کے جس قافلے کا اس نے ذکر کیا ہے اس میں اپنے وقت کے ماہر ترین ناگی یا جوگی موجود ہوں گے اور اگر انہوں نے پیسے کے لالچ میں آکر کام شروع کر دیا تو وہ ناگن بہن کو ضرور پکڑ لیں گے۔ انہی سوچوں میں غلطاں پیچاں لوگوں کے سلام کا جواب دیتے ہوئے میں اس مقام تک پہنچ گیا جہاں صبح کو وائسرائے سے سامنا ہوا تھا چونکہ یہ راستہ میرے دادا کے زمانے ہی سے نیم گذر گاہ کے بطور استعمال ہوتا تھا اس لئے اکثر ویران ہی رہتا تھا تاہم یہاں سے کھیتوں میں کام کرنے والے مرد و عورت صاف نظر آتے تھے۔

میں باغ کی دیوار کے ساتھ ایک لمبا چکر کاٹ کر سنسان اور چھوٹے بڑے درختوں سے اٹے ہوئے خطہ زمین پر پہنچ گیا۔ اچانک حسب دستور میں نے اپنے وجود میں سرسراہٹ محسوس کی پھر ایک انہونی تبدیلی یہ ہوئی کہ مجھے لگاتار تین چھینکیں ہوئیں۔ تیسری چھینک کے بعد میں نے جیسے ہی سر اٹھایا' میرے سامنے بیس پچیس برس کی ایک عورت یا لڑکی کھڑی نظر آئی۔ بہت خوب صورت اس کے سر کے بال اس قدر لمبے تھے کہ زمین کو چھو رہے تھے۔ بالوں کی رنگت تیز گولڈن تھی۔ وہ شیر کی کھال کا لباس پہنے تھی المختصر یہ کہ اس کا جسم' حسن و جمال اور جسمانی نشیب و فراز گرما دینے والے تھے۔

"السلام علیکم چغتائی صاحب......" لڑکی کی آواز سنتے ہی میرے ذہن پر بڑی زور کا چھناکا ہوا اس لئے کہ یہ آواز گنزا کی تھی۔

"کک' کون تم؟......" میں لڑکھڑاتی زبان میں بولا۔

"گنزا ہوں چغتائی صاحب' سابقہ آواز میں اس لئے بولی ہوں کہ آپ مجھے پہچان لیں اب جس آواز میں بولوں گی وہ ایک جنی کی اصل آواز ہو گی......"

"لیکن گنزا تم اپنے اصل یعنی گنزا والے روپ کو کیوں بدل چکی ہو......؟"

"یہی میرا اصل روپ ہے صاحب......"

اب جو آواز ہوئی تو بالکل یوں لگا جیسے کوئی خونخوار بلی منمنانے لگی ہو۔

"کیا کہہ رہی ہو گنزا!؟ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا......"

"زیادہ نہ سوچئے صاحب جی۔ جس لافانی قوت کے حکم سے آتشی مخلوق سے تعلق رکھنے والی ہستیاں آپ کی معاونت کرتی چلی آرہی ہیں' اسی کے حکم سے میں نے وہ مصنوعی روپ اختیار کیا ہوا تھا۔ اب اصل روپ والی دوشیزہ سدرہ آپ کی نظروں میں آچکی ہے لہٰذا مجھے مصنوعی خول اتار پھینکنا پڑا ہے۔ اب آپ ذہن نشین کر لیں کہ آپ سے ہماری جدائی کا وقت بہت قریب پہنچ چکا ہے۔ آپ بڑی تیزی سے اپنے مقاصد میں کامیابی حاصل کرتے چلے جا رہے ہیں۔ بس' اب صرف آخری مرحلہ باقی رہ گیا ہے۔ آج اس روپ میں آپ کے سامنے آئی ہوں مگر آئندہ کسی نہ کسی جانور کے روپ میں اس وقت تک آپ کی مدد کرتی رہوں گی جب تک انتہائی سنگین اور غیر انسانی مرحلہ آپ کو درپیش ہوگا۔ شرجیل وغیرہ بھی صرف آج کچھ وقت کے لئے آپ کے ساتھ انسانی روپ میں رہیں گے' اس کے بعد ان کی ہیئت بھی بدلتی رہے گی۔ آپ کو خبردار کرنا چاہتی ہوں کہ آپ کا مقابلہ اب آتشی مخلوق سے ہوگا اور یہ کہ میں اب آپ کے وجود میں نہیں رہوں گی۔ جتنا حکم تھا' اتنا ہی عرصہ آپ کے وجود میں رہی۔ اب اگر میں آپ کے وجود میں داخل ہوؤں گی تو آپ دیوانے ہو جائیں گے۔ نہ تو سدرہ آپ کو اور آپ سدرہ کو چھو سکیں گے اور نہ ہی اپنی بہنوں و عزیز و اقارب کو پہچان سکیں گے۔ آجاؤ ساتھیو......" وہ برگد کے درخت کی طرف رخ کر کے بولی اور بیک وقت آتشی مخلوق کے پانچوں مددگار میرے سامنے آن پہنچے۔



میرے لئے کھانا حاجی نور الدین کے گھر سے آیا ہوا رکھا تھا۔ کھانے کے بعد میں تھوڑی دیر ستا کر ناگن بہن کو باہر نہ نکلنے کی ہدایت کرتا ہوا خانہ بدوشوں کے ڈیرے کی طرف چل دیا۔

شرجیل' دیجور' افراہیم' صابرہ اور جمائمہ ڈیرے کے کنارے میرے منتظر تھے ان کے

ساتھ سفید رنگ کی ایک بڑی سی خوب صورت بلی بھی تھی۔ وہ سب عام دیہاتیوں کا لباس پہنے تھے۔ سیاہ رنگ کے کمبلوں میں لپٹے ہوئے وہ بہت ہی پراسرار لگ رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی وہ میری طرف بڑھ آئے۔ سفید بلی میاؤں میاؤں کرتی میرے پاؤں کے قریب آن بیٹھی۔

"آپ یہیں رکیں وصی صاحب۔" شرجیل بولا۔

"چار خطرناک اور بہت ہی ماہر سپیرے چوہدری نظام کی حویلی میں جانے کی تیاری کر رہے ہیں۔ واپسی میں ہم آپ کو سب کچھ بتا دیں گے۔" میں نے کوئی اعتراض نہیں کیا اور ایک اونچے سے پتھر پر بیٹھ گیا۔ شرجیل وغیرہ سب اس طرح اڑے جیسے شکار جھپٹنے کے لئے عقاب اڑتا ہے۔

اڑتے ہوئے وہ دھندلایا غبار بن کر نظروں سے غائب ہو گئے۔ صرف سفید بلی ہی میرے ساتھ رہ گئی۔

سورج غروب ہو چکا تھا اور میدانی علاقہ ہونے کے باعث سردی میں بھی اضافہ ہو چکا تھا۔ سفید بلی میری گود میں بیٹھ چکی تھی اور میں اس کے جسم پر بڑی آہستگی اور پیار سے ہاتھ پھیر رہا تھا۔

تھوڑی ہی دیر گزرنے پائی تھی کہ بلی عجیب سی دبی دبی غراہٹ کے ساتھ میری گود سے اترنے لگی گو کہ اندھیرا گہرا ہو چکا تھا اس کے باوجود یہ دیکھ کر میں سناٹے میں آگیا کہ بلی کے اگلے پیر زمین سے لگنے کی بجائے غائب ہو رہے ہیں۔

دیکھتے ہی دیکھتے پوری بلی غائب ہو گئی۔ ایسا ہوتے ہی میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹیاں بج اٹھیں۔ میرا ہاتھ از خود میری کمر کے گرد لپٹے ہوئے ہنٹر کی طرف بڑھ گیا۔

معاً چھن ... چھن ... چھن۔ گھنگروؤں کی آواز سن کر میں ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا اور چند قدموں کے فاصلے پر ایک عورت کو اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر بجائے خوف کے میرے لبوں پر مسکراہٹ کی سفاک ترین لکیر کھنچ گئی۔

آہستہ آہستہ سرد ہواؤں میں تیزی آتی گئی' چمگادڑوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا اور

دور کہیں سے کتے کے رونے کی آواز میری سماعت سے ٹکرانے لگی۔

"کون ہو جی تم ..... ؟" وہ لڑکی میرے قریب پہنچ کر بولی۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ اپنی دونوں طرف کی کوکھ پر رکھ دیئے تھے۔ اسی کے پیروں میں گھنگرو بندھے تھے۔ اس نے کلائیوں میں موٹے اور بھاری طلائی کنگن پہنے تھے۔

اس کی آنکھیں ہرن کی طرح پرکشش تھی۔ وہ کمر سے نچلے جسم پر امبریلا ٹائپ بھاری بھر کم لباس پہنے تھی اور اس کی ناف سے اوپر جسم بلاؤز تک برہنہ تھا اور اندھیرے کے باوجود نارنگی کی طرح دمک رہا تھا۔ اس کے مخروطی ہونٹ یاقوت کے کاشے کی طرح سلگ رہے تھے اور وہ کمر پر ہاتھ ٹیکے اس طرح ڈول رہی تھی کہ اس کی اک اک ادا سے سیکس اپیل ٹھاٹھیں مار رہی تھی۔

میرے ہونٹوں سے بے ساختہ قسم کی سسکاری سی نکل گئی۔ "پپ' پردیسی ہوں' راستہ بھٹک گیا ہوں۔" میرے تنفس کی رفتار میں جذباتی دباؤ بڑھ گیا تھا۔

"غلط۔ یوں کیوں نہیں کہتے کہ تم میرے خانہ بدوش قبیلے پر ڈاکہ ڈالنا چاہتے ہو..... ؟"

"ڈاکہ تو تم نے ڈالا ہے....." میں مسکراتے ہوئے بولا اور جذباتی ہونے کی کامیاب ایکٹنگ کرنے لگا۔ میری بے خوفی کی دو وجوہات تھیں ایک تو میرے ہاتھ میں تھاما ہوا کوڑا اور دوسری وجہ سفید بلی کا اچانک غائب ہو جانا۔ مجھے یقین تھا کہ سفید بلی کے روپ میں گنزا ہی ہو سکتی ہے۔

میں یہ بھی اندازہ لگا چکا تھا کہ میرے سامنے لڑکی کے روپ میں ایک ماورائی وجود موجود ہے۔ اس کے باوجود میں جاننا چاہتا تھا کہ ماورائی قوت رکھنے والیوں کا سیکس کیسا ہوتا ہے۔

"کیا ڈاکہ ڈالا ہے میں نے....." وہ لڑنے بھڑنے پر آمادہ ہو گئی۔

"میرا دل لوٹ لیا ہے تم نے....."

اسی طرح کی باتوں باتوں میں اس کے قریب ہو گیا اور ایک بازو اس کی گوری چٹی کمر

کے گرد حائل کر کے اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔ اس نے کوئی تعرض نہ کیا بلکہ عالم سپردگی میں میرے بازو پر جھول گئی۔

پھر اس سے پہلے کہ میری دست درازی میں اضافہ ہوتا' اس اچانک ہی فضا میں ایک لکیر سی بناتی ہوئی سفید بلی روح لرزا دینے والی آواز میں غراتی ہوئی لڑکی کے نرخرے سے چپک گئی۔

فی الفور آن واحد میں مغلوب لڑکی نے کالی بلی کا روپ دھار لیا اور سفید بلی سے گتھم گتھا ہو گئی۔ ہوا میں طوفانی تیزی آ گئی۔ تاریک فضاء میں دونوں بلیوں کی غراہٹیں زمین و زمان کو لرزانے لگیں اور میں اپنی بیوقوفی پر کف افسوس ملتا ہوا ان سے بچنے کے لئے ادھر ادھر اچھلتا رہا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کالی بلی ہر بار سفید بلی سے چھٹکارا پا کر ہیبت ناک غراہٹوں سے مجھ ہی پر حملہ آور ہوتی رہی تھی۔ اگر سفید بلی بجلی کی طرح لپک لپک کر اسے دبوچ نہ لیتی تو......بعد کا تصور کر کے ہی میرا جسم مرگی کے مریض کی طرح کانپ اٹھا۔

بھیانک ترین جنگ کے بعد کالی بلی زمین پر پڑی اس طرح جھٹکے لینے لگی جیسے کسی لاری کے نیچے کچلی گئی ہو۔

معاً سفید بلی نے ایک تیز جھرجھری سی لی اور انسانی وجود میں آ گئی۔

وہ گنزا ہی تھی' سدرہ کے روپ میں نہیں بلکہ اپنے دوسرے اور اصلی روپ میں وہ سہک رہی تھی اور اس کی سہک سے مہیب فضا تھرا رہی تھی۔ اس کا جسم جگہ جگہ سے زخمی تھا۔

''جانتے ہو یہ کون تھی......؟'' گنزا خون برساتی آواز میں مجھے تکتے ہوئے بولی۔

جواب میں میں گم صم کھڑا رہا۔

''یہ جنی تھی' اسی بچے کی ماں جسے آپ نے بن سوچے گود میں اٹھا لیا تھا اس جن کی بیوی تھی جسے آپ نے اپنے ہنٹر سے مارا تھا۔

خدارا ہوش کے ناخن لیں۔ کہیں جناتی سیکس کا تجربہ کرنے کے شوق میں اپنی زندگی سے ہاتھ نہ دھو بیٹھیں۔

میں آپ سے کہہ چکی ہوں کہ آپ سے ہمارا ساتھ چھوٹنے والا ہے ہم چودہ سین شاہ میں واقع اپنے ٹھکانے پر لوٹ جانے والے ہیں شاید کل کا سورج طلوع ہونے سے پہلے۔ اب منہ بسورے کیوں کھڑے ہیں۔ بیٹھ جایئے پتھر پر......" آخری الفاظ کے ساتھ وہ دودھیائی دھواں بن کر دوبارہ بلی بن گئی جب کہ کالی بلی کا کہیں نشان تک نظر نہیں آیا۔

☆☆☆

میں جب اپنی حویلی پہنچا تو ڈیوڑھی کے باہر ہی شدید سردی کے باوجود بیسیوں لوگ موجود تھے۔ یہ تعداد پولیس کے مسلح جوانوں کے علاوہ تھی مجھے دیکھتے ہی پولیس کے جوانوں کی ایڑیاں بج اٹھیں۔ گاؤں والوں کے سلام سے فضا گونج اٹھی۔

ان ہی گاؤں والوں کے درمیان میرے ابا مرحوم کے دوست حاجی نورالدین بھی کھڑے تھے۔ ان کا اس طرح ٹھٹھرتی رات میں ڈیوڑھی سے باہر رہنا میرے لئے تکلیف دہ ثابت ہوا لہٰذا میں لوگوں کے سلام کا جواب دیتے ہوئے ان ہی کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

روشنی کا معقول انتظام کر دیا گیا تھا۔ جگہ جگہ پیٹرو میکس لیمپس اور لالٹینیں روشن تھیں۔

"السلام علیکم چاچا۔ آپ باہر کیوں کھڑے ہیں......؟"

"جیوندار ہو پترا وعلیکم السلام۔ میں تو پولیس دیکھ کر گھبرا گیا ہو پترا......"

"اوہ کچھ نہیں چاچا آپ آئیں میرے ساتھ......" کہتے ہوئے میں حاجی صاحب کا ہاتھ پکڑے پکڑے بیٹھک میں داخل ہو گیا۔

بیٹھک میں ناگن بہن موجود تھی۔ البرٹ ہیکل بھی چند پولیس افسران کے ساتھ موجود تھا۔

رسمی سی علیک سلیک کے بعد البرٹ ہیکل نے بتلایا کہ ڈھوک ٹالیاں کے جنگل میں واقع چوہدری نظام کے عقوبت خانے پر کامیاب چھاپہ مار کر چالیس انسانوں کو آزاد کروالیا گیا ہے۔ ان چالیس انسانوں میں سے آٹھ اسی پنڈ کے ہیں۔ آٹھ جوان کنگر گاؤں کے تھے بقیہ چار کا تعلق چکوال شہر سے تھا۔

آٹھ افراد وہ ہیں جو چوہدری نظام کے حکم پر عقوبت خانے کی حفاظت پر مامور تھے۔

مجھے دیر اس وجہ سے ہوئی کہ تمام لوگوں کے بیانات لکھے اور دستخط وغیرہ لئے گئے۔

تمام بیانات چوہدری نظام اس کے چاروں بیٹوں کو ظالم' قاتل اور زانی ثابت کرتے ہیں۔

بیانات مکمل ہونے کے بعد میں نے سب کو آزاد کر دیا بلکہ ان کی سواری کے لئے سرکاری گاڑیاں بھی مہیا کیں۔ اس کے علاوہ وہاں سے ایسے ایسے دستاویزی ثبوت بھی ملے ہیں جن میں کل تک کے مقتولین کے نام و پتے درج ہیں۔ ایسے مقتول تقریباً دہ ہیں جن کی جائدادیں چوہدری نظام نے اپنے نام منتقل کروائی تھیں۔ انہیں میں آپ کے والد محترم و مرحوم رفیع الدین چغتائی صاحب کا نام بھی موجود ہے۔

مختصر یہ کہ چوہدری کے دو بیٹے تو مر چکے ہیں' صرف دو زندہ ہیں اور چوہدری نظام زندہ ہے۔ وہاں سے کامیاب واپسی کے بعد میں نے پولیس کی بھاری جمعیت سے چوہدری نظام کی حویلی پر ریڈ کیا۔ وہاں پہنچا تو وانسرائے کی اذیتناک موت کا علم ہوا۔ اس کا ڈھانچا ہیلی کاپٹر کے ذریعے میرے پہنچنے سے پہلے پرواز کر چکا تھا۔

دو گھنٹے کی کارروائی کے بعد میں نے چوہدری نظام کو سینکڑوں لوگوں کی موجودگی میں ہتھکڑیاں پہنادیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ سوائے عبدالسلام اور بہرام خان کے کسی نے رکاوٹ بننے کی حماقت نہیں کی بلکہ دو دو' چار چار کے حساب سے شامیانے سے چلے گئے۔

آدھ گھنٹے کے اندر سوائے عبدالسلام و بہرام کے اگر کوئی تھا تو وہ حویلی کے ملازم تھے۔

چوہدری نظام نے اپنی پگ میرے قدموں میں رکھتے ہوئے دو روز کی آزادی مانگی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ امام دین کا تیجا ہو جانے کے بعد بے شک اسے گرفتار کر لیا جائے۔

فی الحال میں نے عبدالسلام اور بہرام پر ہاتھ نہیں ڈالا۔ اس لئے کہ وہ گورنمنٹ محکمے کے اعلیٰ افسر ہیں۔ انہیں گرفتار کرنے کے لئے مجھے کمشنر آف جہلم سے باقاعدہ وارنٹ حاصل کرنا پڑے گا۔

البرٹ کا مفصل بیان سن لینے کے بعد میں نے اس سے علیحدگی میں کچھ باتیں کیں اور رخصت کر دیا۔

گیارہ بجے شب تک چاچا نور الدین اور دیگر گاؤں والوں سے گپ شپ لڑانے کے بعد انہیں بھی رخصت کر دیا۔ اب بیٹھک میں صرف میں یا ناگن بہن باقی رہ گئے۔

"آپا....." تنہائی پاتے ہی میں نے ناگن بہن کو مخاطب کیا۔ "آپ کو بھی اب خوش ہو جانا چاہئے۔ میرے معاونین آتشی مخلوق کے پانچ جنات نے سپیروں کے ڈیروں میں وہ اودھم بازی اور خوف وہراس مچایا کہ وہ اپنی جانیں بچا کر بھاگ گئے۔ جو کچھ مجھے معلوم ہوا ہے' اس کی روشنی میں' میں اسے نتیجے پر پہنچا ہوں کہ سپیرے مر کر بھی پنڈ دادن خان کا رخ نہیں کریں گے۔

ایسا نہ بھی ہوتا تب بھی انہیں ناکام ونامراد لوٹنا پڑتا اس لئے کہ چوہدری نظام اور اس کے بیٹوں کی ہوا نکل چکی ہے۔ اب تو انہیں کوئی سلام کرنے والا بھی نہیں ملے گا۔"

☆☆☆

تقریباً ڈھائی بجے شب جب زمین وکائنات کا ذرہ ذرہ محو استراحت تھا' میرے تحت الشعور پر دھماکے سے ہوئے اور ب ان دھماکوں نے تحت الشعور سے جمپ لگا کر میرے شعور کو جھنجوڑا تو میں نے کسمسا کر آنکھیں کھول دیں۔

چند لمحے میں بے خیالی میں چھت ہی کو گھورتا رہا کہ اچانک دھب دھب کی آوازیں پھر سنائی دیں اور میں لحاف ہٹا کر اٹھ بیٹھا میرے جسم پر صرف سلیپنگ سوٹ تھا۔ یعنی پاجامہ اور شرٹ سر پر البتہ مفلر لپٹا ہوا تھا۔

دھب دھب اندرونی دروازے پر ہوئی تھی۔ یعنی اندرونی دروازہ وہ راستہ تھا جو حویلی کے برآمدے سے دیگر کمروں میں منسلک تھا۔ میں ایک دلنشین اور دلفریب خواب دیکھ کر بیدار ہوا تھا۔ میں نے دیکھا کہ میں اپنے دوستوں کے ساتھ ڈیوڑھی میں بیٹھا ہوں ڈنر کا وقت ہوا ہے اور مجھے اندرونی دروازہ تھپتھپا کر متوجہ کیا جارہا ہے۔

یہ تاثر میرے ذہن پر چھایا ہوا تھا اور میں ناگن بہن کے بستر پر توجہ دیئے بغیر' اپنا مخصوص کوڑا اٹھائے بغیر سلیپر پہن کر دروازے پر پہنچا اور ہلکے سے دباؤ سے فولادی چٹخنی گرا کر بغیر کسی دشواری کے دروازہ کھول لیا۔

یہ فولادی چٹخنی وہ تھی جو دن میں کئی بار کھولنے کی کوشش کے باوجود نہیں کھل سکی تھی اور میں اس پر بار بار مٹی کا تیل چھڑک چکا تھا۔ دروازہ کھولتے ہی یخ بستہ ہوا کا ایک تیز جھونکا میرے جسم کو ٹھٹھراتا ہوا غائب ہو گیا۔

سامنے ہی سدرہ کھڑی مسکرا رہی تھی۔ وہ ننگے سر کھڑی تھی اور اس کے بلاؤز سے اس کا سرخ و سفید سینہ نصف کے قریب برہنہ تھا۔ ”کب تک دوستوں میں بیٹھے رہو گے؟ چلئے اب مجھ سے زیادہ برداشت نہیں ہوتا۔“ کہتے ہوئے اس نے اپنی دونوں بانہیں میرے کندھوں کے گرد حائل کر دیں۔

ایک برف سی میرے رگ و پے میں دوڑ گئی' شدت جذبات سے بے خود ہو کر میں نے اسے بھینچ لیا اور بھوکے بھیڑیئے کی طرح اس کے گالوں' ہونٹوں' گردن کو چومنے لگا۔

”اونہہ۔ یہاں نہیں۔ اپنے کمرے میں ....“ وہ چوٹ کھائی ناگن کی طرح کسمسائی۔ اس کے تنفس کی رفتار بھی میرے سانسوں کی طرح پھنکاروں میں بدل چکی تھی۔ وہ بھی کسی بھیڑنی کی طرح مجھے چومنے چاٹنے لگی تھی۔

شدت جذبات سے بے خود ہو کر میں نے اسے گود میں اٹھالیا اس طرح اس کا گلابی اور ریشمی لباس رانوں سے کچھ اوپر ہو گیا اور بھری بھری گول دملتی رانیں دیکھ کر ضبط کا بندھن ایک دم سے ٹوٹ گیا میرا کمرہ دلہن کی خواب گاہ کی طرح دمک رہا تھا۔ اندھیرا اس لئے نہ تھا کہ چھت سے لٹکا ہوا فانوس روشن تھا۔

شدت جذبات سے بے خود ہو کر میں نے سدرہ کو پلنگ پر ڈال دیا اور اس پر بھوکے گدھ کی طرح جھپٹنا ہی چاہتا تھا کہ اپنی پنڈلیوں پر کسی کی سخت ترین گرفت محسوس کر کے میں اس طرح چونک پڑا جیسے مجھ پر سرد ترین پانی انڈیل دیا گیا ہو۔

میں نے دیکھا وہ زنانہ ہاتھ تھے اور ان ہاتھوں میں جو کنگن اور انگلیوں میں جو طلائی انگوٹھیاں پہنی تھیں' وہی تھیں جو ناگن بہن پہنے رہا کرتی تھی۔

یہ سب کچھ پلک جھپکنے کی دیر میں ہو گیا اور اسی پلک جھپکنے کی دیر میں سدرہ بلاؤز کھول

کر' سسکاریاں بھرتے ہوئے میری طرف بانہیں پھیلا چکی تھی۔

اور اسی لمحے کے اندر میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بج اٹھی میرے منتشر حواس سمٹ گئے' میرے جذبات ٹھنڈے پڑ گئے اور میں از خود پلنگ سے دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔

''کیا ہوا وصی الدین۔ جھپٹو مجھ پر' نوچو کھسوٹو مجھے' میرا تن آتشیں جذبات میں پھنک رہا ہے...... ''سدرہ زخمی ناگن کی طرح پھنکاری بلبلائی۔

''میں تیری آتش بجھاتی ہوں۔ خبیث''

یک بیک ناگن پلنگ سے نکل کر انسانی روپ میں کھڑی ہو گئی۔ یہ جھٹکا میرے لئے ایک سانحہ سے کم نہ تھا۔ میں بالکل نہتا تھا۔ گنزا اور شرجیل وغیرہ بھی نہ جانے کہاں تھے۔ میں یقیناً اپنے ہی ویران گھر کی شیطانی قوت کے نرغے میں آ چکا تھا۔ مجھے ہوش آ چکا تھا۔ مجھے یاد آ گیا تھا کہ سدرہ اپنی بہن اور بھتیجوں وغیرہ کے ساتھ باغ میں تھی اور......اور یہ کہ ناگن بہن اس آفت کی پرکالہ کا مقابلہ کر سکے گی یا نہیں۔

اچانک وہ سب کچھ ہو گیا جس کی ایک لمحہ قبل مجھے نہ تو خبر ہو سکی تھی اور نہ توقع تھی۔

سدرہ کا چہرہ ایک دم سے خوف ناک ہو گیا۔ اس کی آنکھیں کٹورے کی مانند گول گول ہو کر پھیل گئیں اور ان میں سے آگ کی لپٹیں سی نکلنے لگیں۔ اس کے پورے چہرے پر ابھرے ہوئے کئی پھوڑے تھے۔ اس کے دانت سیاہ اور بڑی مچھلی کے دانتوں کی طرح نوکیلے تھے اور اس کا پورا جسم سلیٹی رنگ اور سلیٹی بالوں سے بھرا ہوا تھا۔ پلنگ بیشک میرا تھا مگر اس قدر بوسیدہ' گرد آلود اور ادھڑا ہوا تھا کہ شاید کباڑیا بھی اسے نہ خریدے۔ پورا کمرہ مکڑے کے دبیز جالوں سے بھرا ہوا تھا۔ یہاں تک ہی میں نے جائزہ لیا تھا کہ فانوس از خود بجھ گیا اور میں خود کو قبر کے اندھیروں میں محسوس کرنے لگا۔

یہ سب کچھ ہونے کے باوجود مہیب عورت اور ناگن بہن کا جسم صاف نظر آ رہا تھا۔

''کون ہے تو؟ تو گنزا نہیں ہو سکتی......'' مہیب عورت کا لہجہ ایسا ہو گیا جیسے پھٹے ہوئے اسپیکر پر آواز ڈراؤنی اور کھوکھلی ہو جاتی ہے۔ ''میں واقعی گنزا نہیں ہو' میں ناگن

ہوں، شیش ناگ ..... " جواب کے ساتھ ہی ناگن بہن کا انسانی وجود آنکھوں میں چکا چوند سی پیدا کرنے والی روشنی بکھیرتے ہوئے ناگن کا روپ پا گیا۔ میں نے صرف اتنا ہی دیکھا کہ ناگن بہن کا پھن مہیب عورت کی گردن کو چھوتا ہوا دوبارہ انسانی روپ میں آ گیا۔

"چل وے میرے بھلیا ویرا..... " پلک جھپکنے کی دیر میں ناگن بہن نے مجھے بازو سے پکڑ کر کھینچا۔ اگر اس نے ایک لحہ کی بھی تاخیر کی ہوتی تو شاید ہم' بالخصوص میں قبر کا قیدی بن چکا ہوتا جیسے ہی ناگن بہن نے مہیب عورت کی گردن پر ڈنک مارا تھا۔ اف..... اف۔ مجھے یوں لگا جیسے کمرے کے ہر ہر ذرے میں بھونروں کی بھنبھناہٹ گونجنے لگی ہے۔ اتنی تیز کہ کانوں کے پردے پھٹتے محسوس ہوئے اور پھر جیسے ہی ہم کمرے سے نکلے' کھٹاک کی دل ہلا دینے والی آواز سے دروازہ بند ہو گیا۔

"میرے کندھوں پر ہاتھ جما دو ویرا۔"

گھور' بے پناہ اندھیرے میں ناگن بہن کی پھنکارتی آواز سنتے ہی میں نے اپنے لرزتے ہاتھ اس کے کندھوں پر رکھ دیئے۔ رکھے ہی تھے کہ زمین میرے پیروں تلے سے کھسک گئی۔ میں اس تیزی سے پھسلنے لگا جیسے کمان تیر سے چھوٹتا ہے۔



"تھوڑے سے وقفے کو غنیمت جانو ویرا..... " نیم روشن بیٹھک میں پہنچتے ہی ناگن بہن پھنکارتی آواز میں بولی۔ "فوراً سے پہلے اپنا کوڑا اٹھا لو اور مرد میدان کی طرح تن جاؤ....."

ناگن بہن کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی میں کوڑا اٹھا چکا تھا اور ناگن بہن شاید دوبارہ جون بدل کر ناگن بن چکی ہو گی۔ لیکن میرے پاس وقت نہیں تھا اس لئے کہ بیٹھک کے اندرونی بند دروازے سے بھیڑیئے کی سی جسامت رکھنے والی دھوئیں کی شبیہ نکلنے لگی تھی جب کہ اس دروازے سے جو بیرونی تھا' چیتے کی سی جسامت سے مشابہہ شبیہ نکلنے لگی تھی۔ پھر' اس سے پہلے کہ بھیڑیئے کی سی شبیہ کوئی بھی روپ دھار پاتی میں نے زائیں سے کوڑا لہرا دیا۔ ایسا ہوتے ہی بھیڑیئے کی غراہٹوں میں بے پناہ اضافہ ہو گیا' ساتھ ہی یوں لگا جیسے پوری بیٹھک میں آگ کی روشنی پھیل گئی ہو۔

وہ بھیڑیئے ہی کی سی جسامت رکھتا تھا' زمین پر گرا اور ادھر سے ادھر تڑپنے لگا۔ اس کی اذیتناک چیخیں میرے دماغ پر کچوکے سی لگانے لگی تھیں۔ قطع نظر اس کے بیرونی مد دروازے سے چیتے کی سی شبیہ رکھنے والے روشن دھویں کے ہیولے یکے بعد دیگر نمودار ہوتے اور میرے وتڑپتے ہوئے آگ کے بھیڑیئے کے درمیان حائل ہو جائے۔ ان کے حلق سے چیتے ہی کی غراہٹوں کی سی لرزہ بر اندام کر دینے والی آوازیں نکل رہی تھیں۔

"وصی الدین صاحب...... "اچانک بیٹھک کی وسعتوں میں دیجور کی جانی پہچانی آواز گونجی۔ "افسوس کہ ہمیں پہنچنے میں ذرا سی دیر ہو گئی۔ آپ آرام سے اپنے بستر پر لیٹ جائیں۔ کوئی لمحہ گذرتا ہے کہ آپ پر پتھروں' اولوں اور انگاروں کی بارش سی شروع ہو جائے گی۔ خیال رہے کہ آپ کی حویلی کے ہر کمرے میں آتشی مخلوق کا ایک ایک خاندان بسا ہوا ہے ان کو ہر حال میں مار ڈالنا' جلا دینا یا بھگا دینا ضروری ہے۔ اگر آپ گھر بدل دیں گے تب بھی یہ آپ کو یا آپ کے محلہ داروں کو بہت پریشان کریں گے......"

"گنزا کہاں ہے دیجور...... ؟" کہتے ہوئے میں پلنگ پر چت لیٹ گیا۔ "وہ بھی پہنچ چکی ہے......"

دیجور کی آواز رکی ہی تھی کہ اچانک ہی پانچوں چیتا شبیہ پستول سے نکلی ہوئی گولی کی طرح لاتعداد رنگین چنگاریاں بن گئے۔ ان میں سے سینکڑوں چنگاریاں میرے پلنگ کے گرد اور میرے وجود سے بمشکل چار فٹ کی بلندی پر اس تیزی سے رقص کرنے لگیں کہ ان پر نظریں جمانی مشکل ہو گئیں اور دیگر سینکڑوں چنگاریاں روشن' باریک اور لمبی لمبی ہو کر پورے بیٹھک میں گردش کرنے لگیں۔ اس تیزی سے کہ عقل دنگ رہ جائے۔

اپنی زندگی میں اپنی نوعیت کی اس حقیقت نے مجھے گنگ کر کے رکھ دیا۔ میرے لبوں سے طویل سانس اس وقت نکلی جب میں نے بیٹھک کے چاروں طرف سے اپنے اوپر چھوٹے بڑے پتھروں کی بارش ہوتے دیکھی۔ بالکل یوں جیسے ساون میں بادلوں سے بارش کے قطرے دھار بن کر برستے ہیں۔ بیٹھک میں قیامت صغریٰ مچی ہوئی تھی۔ کڑاکوں پر کڑاکے ہونے لگے' ایسی دہشتناک آوازیں بھی اٹھ رہی تھیں جیسے واقعی آتش فشاں پھٹ

رہا ہو۔ مگر' حیرت انگیز طور پر نہ تو کوئی پتھر مجھ سے ٹکرایا اور نہ ہی کوئی انگارہ یا اولا میرے قریب پہنچ سکا تھا' یقیناً میرے پانچوں محافظ ان حملوں کو روکنے میں مصروف تھے۔

کس قدر خوش نصیب ہوں کہ آتشی مخلوق جو میری دشمن ہے اور وہی آتشی مخلوق میری محافظ بھی ہے۔ یقیناً یہ سب کچھ میرے والدین کی التجاؤں' ارمانوں اور دعاؤں کا ثمر تھا۔۔ ورنہ نہ تو میں کوئی پیر و اولیاء ہوں اور نہ ہی پنڈت و پادری ہوں۔ قیامت خیز یہ جنگ اس وقت ختم ہوئی جب ایک گھنٹے کے بعد اچانک ہی بیٹھک کے بیرونی دروازے سے ایک جگنو سا نمودار ہوا جو آن واحد میں آگ کی طرح دہکتے ہوئے اژدہے کا روپ پا گیا۔ اس کی لمبان اور موٹان ایسی تھی کہ میری آنکھیں پتھرا گئیں۔ اس کا دہانہ اس قدر چوڑا تھا کہ پورا اونٹ اس میں سما جائے۔

آگ کے اس اژدہے نے بالا ہی بالا صرف ایک چکر لیا۔ اسی ایک چکر میں پتھروں' اولوں اور انگاروں کی بارش ایک دم سے رک گئی۔ تمام خوفناک کڑاکے' دھماکے اور غراہٹیں دب گئیں اور بیٹھک پر ایک ابدی سکوت چھا گیا میری محافظت کرنے والے پانچوں آتشی مخلوق لہریں' چنگاریاں اور برقیں سمٹ کر روشن غبار کے انسانی وجود میں آ گئے۔ یہی کچھ اژدہے نے کر دکھایا۔



میں بے فکری کی نیند سویا ہی تھا کہ بیرونی دروازے کی دھڑ دھڑاہٹ سے میری آنکھ کھل گئی۔ نیم غنودگی کے عالم میں میں نے دیکھا ناگن بہن کنڈی کھولنے لگی تھی اس کے جسم پر سرمئی کمبل لپٹا ہوا تھا۔ چندہی لمحوں میں میں اٹھ بیٹھا۔ ٹھیک اسی لمحے [illegible] صاحب بیٹھک میں داخل ہوئے تھے۔ انہوں نے ناگن بہن کے سلام کے جواب [illegible] کے سر پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔

حاجی صاحب کے ساتھ میرے خوابوں کی تعبیر' میری امنگوں کا مجموعہ اور میری محبت سدرہ بھی تھی۔ سر سے پیروں تک سیاہ لباس میں ملبوس سدرہ کی غزالی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اس کے چہرے پر یتیمی کے آثار طاری تھے۔

میری تمام غنودگی ہوا ہو گئی میں لحاف ہٹا کر اٹھ کھڑا ہوا مگر میرے دل و دماغ پر حیرتوں کے پہاڑ سے کھڑے ہو گئے تھے۔ قطع نظر ان کے ناگن بہن کے لبوں پر کچھ ایسی مسکراہٹ کھیلنے لگی تھی جسے میں سفاکی یا خونخواریت ہی سے تشبیہہ دے سکتا ہوں۔

رسمی سی علیک سلیک کے بعد میں نے انہیں پورے احترام سے بٹھایا رسٹ واچ میں وقت دیکھا تو صبح کے نو بج رہے تھے۔

''وصی بیٹا۔ یہ چوہدری نظام کی چھوٹی بیٹی سدرہ ہے۔'' حاجی چاچا نے یوں تعارف کروایا جیسے میں سدرہ کو جانتا ہی نہیں ہوں۔ ''یہ اس لئے رو رہی ہے کہ چوہدری نظام نے صبح چھ بجے خودکشی کر لی ہے......''

''کیا...... ؟'' میں تقریباً چیخ پڑا۔

''ہاں پترا۔ آج اسے گرفتار کیا جانا تھا' گرفتاری سے بچنے کے لئے ہی اس نے اپنی بندوق سے اپنے حلق پر فائر کر دیا۔ فائر کی آواز ہی پر حویلی والے جاگ پڑے' دوڑتے ہوئے وڈے چوہدری کے کمرے میں پہنچے تو وہ اپنے ہی خون میں لت پت قالین پر پڑا ہوا ایڑیاں رگڑ رہا تھا۔

سدرہ اپنی بہن اور بھتیجوں وغیرہ کے ساتھ باغ میں تھی۔ اطلاع ملتے ہی وہ بھی دوڑ پڑی اور اب حویلی سے سیدھی میرے پاس پہنچی ہے۔ اس کی درخواست پر ہی اسے میں تمہارے پاس لایا ہوں۔'' حاجی چاچا کے خاموش ہوتے ہی میں کچھ کہنا چاہتا تھا کہ سدرہ ہچکیاں بھرتے ہوئے اٹھی اور میرے پیروں سے لپٹ گئی۔

''خان زادے' معاف کر دے' میرے دونوں بھائیوں کو میں...... میں تیرے پیر پکڑتی ہوں۔'' وہ گڑگڑاتی رہی' بلبلاتی رہی' میں بوکھلاہٹ میں ایک ایک کا چہرہ تکنے لگا۔ میرے ذہن پر بیک وقت چوہدری نظام کی خودکشی' سدرہ کا اس طرح اچانک میرے ڈیرے پر پہنچ جانا دو ایسے حالات تھے کہ میں فوری طور پر کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔

''اٹھ دھی ئے اٹھ جا......'' حاجی صاحب ہی نے سدرہ کو بازوؤں سے پکڑ کر میرے

قدموں سے اٹھایا۔ ناگن بہن بھی سر جھکائے بیٹھی تھی' ویسے میں نے صاف محسوس کر لیا تھا کہ وہ اب بھی مسکرا رہی تھی۔ "وصی پترا۔ میرے گھر جا اور ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر جلد آجا مل ملا کے چلاں گے......"

میں ہپناٹزم کے معمول کی طرح' سدرہ کو کھوئی کھوئی نظروں سے تکتا ہوا بیٹھک سے نکلا چلا گیا۔ باہر وکٹوریہ کھڑی تھی۔ کوچوان نے مجھے دیکھتے ہی سلام کیا مگر میں مبہوت سا ہا رہا۔

بیس منٹ بعد جب میں دوبارہ بیٹھک میں پہنچا تو ناگن بہن موجود نہ تھی البتہ سدرہ امید و بیم بھری نظروں سے میری ہی طرف تک رہی تھی۔ اس کی آنکھیں مسلسل روتے رہنے کی وجہ سے بہت ہی سرخ ہو چکی تھیں اور چہرہ مرجھا سا گیا تھا۔

"وصی پترا' کپڑے بدل کے سدرہ کے ساتھ حویلی پہنچو' میں بھی محلے کے چند لوگوں کے ہمراہ درمیانی راستے سے پہنچتا ہوں......" کہتے ہوئے حاجی صاحب میرے جواب کا انتظار کئے بغیر چلے گئے جب کہ میں اپنا مخصوص لباس' یعنی تھری پیس سوٹ اٹھا کر باتھ روم کی طرف بڑھ گیا۔ ساتویں منٹ پر میں جیسے ہی بیٹھک سے نکلا' وکٹوریہ میں جتے ہوئے دونوں گھوڑے بڑی زور زور سے ہنہنائے اور اگلے دونوں پیر اٹھا اٹھا کر زمین پر مارنے لگے۔ یوں لگتا جیسے ان پر دیوانگی طاری ہو گئی ہو۔ کوچوان انہیں کنٹرول ہی نہیں کر پا رہا تھا۔

ہم دونوں بڑی مہارت سے وکٹوریہ میں بیٹھ گئے۔ بیٹھے ہی تھے کہ دونوں گھوڑے ہوا سے باتیں کرنے لگے۔

یہ تو اچھا ہوا کہ اکا دکا لوگ اور بچے نظر آئے وہ بھی گھوڑوں کی تیز رفتار کے باعث ادھر ادھر سمٹتے رہے تھے۔ شاید لوگوں کی اکثریت چوہدری نظام کی حویلی کے گرد یا پھر کھیتوں کھلیانوں میں مصروف ہو چکی تھی۔

پوری وکٹوریہ دائیں بائیں اوپر نیچے ڈولتی رہی۔ اس طرح سدرہ کبھی مجھ سے لپٹ پڑتی اور کبھی میری گود میں لڑھک جاتی سدرہ کے اس اتفاقیہ لمس نے مجھ پر سرشارانہ

کیفیت طاری کر رکھی تھی' میرا دل فرط مسرت سے بلیوں اچھلنے لگا تھا اور میں چاہنے لگا کہ وکٹوریہ کو جھٹکے لگتے رہیں اور راستہ لمبا ہوتا جائے مگر ایسا نہ ہو سکا تیز رفتار گھوڑے گاؤں سے کچھ فاصلے پر فوجی بیرکوں کے پاس پہنچ کر رک گئے۔

یہ بیرکیں کھنڈرات میں بدلی ہوئی تھیں۔ ہو سکتا ہے کسی زمانے میں یہاں رونقیں رہی ہوں گی۔ مگر تا حال تو وحشت سناٹا اور ویرانی کے علاوہ کوئی رونق نہ تھی۔

بے اختیار ہو کر میں نے گاڑی سے اترنے کے بعد سدرہ کو گود میں اٹھا لیا۔ ابھی میں صحیح طور پر کھڑے ہونے بھی نہیں پایا تھا کہ گھوڑے ایک بار پھر ٹوٹے پہیوں کے باوجود گاڑی کو لے بھاگے پتہ نہیں بے چارے کوچوان پر کیا گزر رہی ہو گی۔

سدرہ فرط حیاء سے چھوئی موئی کی طرح سمٹ رہی تھی۔ اس کے سرخ و سفید چہرے پر ایک سے ایک رنگ آ آ کر گزر رہا تھا۔

"خان زادے......" وہ شرم سے لرزتی آواز میں بولی۔ "پلیز مجھے نیچے اتار دیجئے......" اس نے جملہ مکمل کر دیا اور میں نے خفت سی محسوس کرتے ہوئے اسے گود سے اتار دیا۔



ڈیڑھ دو فرلانگ مشرقی سمت میں کھیت کھلیان' درخت اور کچے پکے مکانات اور فضاؤں میں پرواز کرتے ہوئے پرندے واضح طور پر دکھائی دے رہے تھے ٹھنڈک بھی تھی مگر اس میں شدت اس لئے نہ تھی کہ ہم تیز دھوپ میں کھڑے ہوئے تھے۔

ہوا میں تیزی کے باعث گرد بھی اڑ رہی تھی اور کھنڈر نما بیرکوں سے ایک عجیب سی وحشت چھلکتی محسوس ہو رہی تھی۔

سدرہ کو جیسے ہی میں نے زمین پر کھڑا کیا' وہ دونوں ہاتھوں سے اپنی کنپٹیاں داب کر لہرانے لگی۔

"کک کیا ہوا سدرہ..... ؟" بے چین ہو کر میں نے اسے بازوؤں سے تھام لیا۔

میرے سوال کے جواب میں وہ کچھ نہ بولی اور اپنا ماتھا میرے سینے سے ٹکا دیا۔

اچانک گرد و غبار کا ایک تیز مرغولہ زمین سے بلند ہوا اور آن واحد میں انسانی روپ میں آگیا۔

یہ گنزا تھی، اپنے دوسرے اور شاید اصل روپ میں۔ جب سے میں نے سدرہ کو دیکھا تھا گنزا نے وہ روپ اپنانا چھوڑ دیا تھا۔

گنزا کو دیکھتے ہی میرے ذہن پر بڑی زور کا چھناکہ ہوا۔ خطرے کے احساس نے میرے لہو میں انگارے سے دوڑا دیئے۔ بالکل غیر ارادی طور پر میں نے سدرہ کے بال جکڑ کر اس کے سر کو پشتی طرف جھٹکا، یہ سب کچھ ایک لمحہ کے دسویں حصے میں ہو گیا، پھر سدرہ کی شکل دیکھتے ہی میرا دل اچھل کر حلق میں آ اٹکا۔

وجہ بھی معقول تھی، سدرہ کی زبان کسی بدمست بھینسے سے زیادہ چوڑی لمبی اور آگ کی طرح سرخ تھی۔ بالیقین میرے سینے سے ٹکرا کر وہ اپنی زبان سے مجھے کوئی شدید جسمانی نقصان پہنچانا چاہتی تھی شاید اس لئے کہ میری کمر سے میرا ہنٹر لپٹا ہوا تھا، اسی ہنٹر کی پراسرار قوتوں کے باعث وہ اب تک میرے جسم پر قابض نہیں ہو سکی تھی بہر حال اس کی نہ صرف آگ کی طرح زبان منہ سے باہر تھی بلکہ اس کی دونوں آنکھیں بھی ابلی ہوئی تھیں۔ یوں لگتا جیسے کسی سنگتراش نے آنکھوں کی جگہ آگ کے دو اخروٹ سائز انگارے رکھ دیئے ہوں۔ اس کے حلق سے کوئی آواز نہیں نکل رہی تھی مگر جیسے ہی میں نے اس کے بال جکڑ کر جھٹکا دیا۔ اس کے حلق سے تیز، کریہہ اور انتہائی جھلسا دینے والی سانس خارج ہو گئی۔ اگر میں فوراً ہی جھک نہ جاتا تو میرا چہرہ اس کی بھاپ نما سانس سے جل جاتا۔

جھکتے ہی میں نے اس کی دونوں پنڈلیاں پکڑ کر کھینچ لیں۔ لہٰذا وہ فلک شگاف غیر انسانی چیخ کے ساتھ ایک زوردار دھماکے سے سر کے بل بالکل چت گر پڑی۔

گنزا یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی اور مسکرا رہی تھی، کسی قسم کی مداخلت نہیں کر رہی تھی اور اس کی اس حرکت پر مجھے تعجب بھی ہو رہا تھا۔ جونہی سدرہ کا روپ دھارنے والی ہستی زمین پر گری، چھپاک سے ایک ناگ یا ناگن اس کی گردن پر پھانسی کے پھندے کی طرح لپٹ چکی تھی۔ میرے خیال میں، بلکہ مجھے یقین تھا کہ وہ میری ہی ناگن بہن تھی۔ ایسا کچھ

سوچتے ہوئے میں نے اپنی کمر سے کوڑا کھینچ لیا تھا جب کہ ناگن بہن اتنی سی دیر میں مہیب صورت عورت کی پیشانی' زبان اور سینے پر دائیں بائیں چار ڈنگ لگا چکی تھی۔ کوئی لمحہ ضائع کئے بغیر میں نے مہیب عورت کے زمین پر لوٹ پوٹ ہوتے جسم پر کوڑے سے دو ضربیں لگا دی تھیں۔

ایک عجیب سا محیر العقل منظر تھا' کوڑے کی دو ضربوں ہی میں عورت کا سینے سے نچلا دھڑ آتش فشاں کے لاوے کی طرح پگھل چکا تھا اچانک' ناگن نے اپنی گرفت ڈھیلی کر دی اور پھر چند ہی لمحوں بعد وہ انسانی روپ میں آ گئی۔

دوسری طرف مہیب عورت پوری کی پوری پگھل گئی اور پگھلا ہوا سنہرا لاوا بڑی تیزی سے کائی کی طرح گہرا سبز ہونے لگا۔

"گنزا......" میں کوڑے کو اپنی کلائی پر لپیٹتے ہوئے بولا۔ میرے لہجے میں ناراضگی کا عنصر تھا۔ "تم نے مدد نہیں کی......" میں نے جملہ مکمل کر دیا۔

"میں نے ہی تو آپ کی مدد کی تھی چغتائی صاحب۔ اگر میں بروقت اپنا آپ ظاہر نہ کرتی تو یہ حملہ آور جنی اپنی زبان سے آپ کے اوور کوٹ' کوٹ اور واسکٹ وغیرہ کو چاٹ کر آپ کے وجود میں داخل ہو جاتی اور پھر آپ کہیں کے نہ رہتے۔ میں اور میرے پانچوں ساتھی بھی آپ کی آزادی سے مایوس ہو جاتے۔

میرے محترم' آپ کو عقل استعمال کرنا چاہئے تھا۔ جس لڑکی کے باپ نے خودکشی کر لی ہو' وہ باپ کی میت چھوڑ کر آپ کے پاس کیسے پہنچی؟ آپ کی دوسری غلطی یہ تھی کہ وکٹوریہ کے دونوں گھوڑوں پر دیوانگی طاری ہو گئی تھی۔ یہ علامت تھی اس بات کی کہ وہ غیبیات کو دیکھ چکے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

میں اگر ظاہر نہ ہوتی تو آپ ہوش میں نہیں آتے' میں نے مداخلت اس لئے نہیں کی کہ میں آپ کی بہن کو محسوس کر چکی تھی۔

پتہ ہے یہ کون تھی' یہ وہی جنات تھی جسے آپ کی ناگن بہن نے رات میں آپ کے ساتھ داد عیش لینے کی کوشش میں ڈسا تھا...... ویسے مجھے آپ کی بہن سے مل کر بہت خوشی

ہوئی ہے اور یہ اطمینان بھی کہ آپ کی بہن جنات' یعنی آتشی مخلوق سے نمٹ سکتی ہے......"

☆☆☆

پندرہ منٹ بعد میں ناگن بہن سمیت چوہدری نظام کی حویلی پہنچ گیا۔ حویلی کے سامنے سینکڑوں مرد و بچے جمع تھے۔ پولیس بھی کافی تعداد میں موجود تھی۔

تحقیقات سے پتہ چلا کہ چوہدری عبدالسلام اور بہرام نے پوسٹ مارٹم کی سختی سے مخالفت کی تھی اس لئے چوہدری نظام کی آخری رسومات ادا کرنے کے بعد میت کو قبرستان لے جانے کی تیاری کی جارہی ہے۔ انتظار تھا تو صرف اطراف کے چند زمینداروں کا۔

میں جب لوگوں کے سلام کا جواب دیتے ہوئے ڈیوڑھی میں پہنچا تو مجھے دیکھ کر عبدالسلام و بہرام اور البرٹ ہیکل تیزی سے میری طرف بڑھ آئے۔

رسمی علیک سلیک کے بعد میں اور ناگن بہن ایک ہی صوفے پر بیٹھ گئے۔ بیٹھک میں کم و بیش پچیس افراد موجود تھے۔ میں بظاہر البرٹ سے باتیں کرنے میں مصروف تھا۔ کوئی شخص ایسا نہ تھا جو ناگن بہن کو پر ہوس نظروں سے نہ تک رہا ہو۔ بالخصوص عبداسلام اور بہرام ناگن بہن کے سراپا سے نظریں ہی نہیں ہٹا پا رہے تھے۔

"میجر سر......" البرٹ نے مجھے مخاطب کیا۔ "ڈھوک ٹالیاں میں چوہدری نظام نے جو ذاتی عقوبت خانہ قائم کیا ہوا تھا' وہ پورا علاقہ ڈھوک ٹالیاں کے رئیس کی ملکیت ہے۔ شاید وہ آپ کے پھوپھا ہیں۔

عقوبت خانے کے نگرانوں اور قیدیوں کے بیانات بہت ہی سنسنی خیز ہیں۔ شواہد و بیانات عبدالسلام کو بھی مجرم ثابت کرتے ہیں۔ میں انہیں بھی گرفتار کرنا چاہتا ہوں مگر حالات نے کچھ ایسا رخ اختیار کر لیا ہے کہ چوہدری نظام کی تجہیز و تدفین سے قبل کوئی قدم نہیں اٹھایا......"

"بہت اچھا کیا آپ نے مسٹر البرٹ۔ مجھے باخبر ذرائع سے پتہ چلا ہے کہ اس حویلی کے نیچے بھی ایک تہ خانہ ہے اور اسی تہہ خانے میں ایک کمرہ ایسا ہے جہاں چوہدری نظام

اور اس کے چاروں بیٹوں کے خلاف اہم ترین مواد موجود ہیں۔

وہیں پر میرے باغ' زمینوں' شوگر ملوں اور دیگر جائیداد کے اصل کاغذات موجود ہیں۔

میرے دادا مرحوم' مقتول والد صاحب اور میری دونوں بہنوں کو اسی عمارت کے انڈر گراؤنڈ حصوں میں قید کیا گیا تھا۔ اسی تہ خانے میں آٹھ آدم خور کتے بھی موجود ہیں۔ لہٰذا آپ اپنے طور پر بیرونی تحقیقات مکمل کرتے رہیں' عبدالسلام اور بہرام کو فی الحال نہ چھیڑیں' میں تہ خانے کا راز معلوم کرنے کی کوشش کروں گا......"

"وصی بھرا......" چوہدری عبدالسلام نے مجھے مخاطب کیا غالباً نہیں بلکہ یقیناً اسے میری اور البرٹ کی کھسر پھسر کھلنے لگی تھی۔ "اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو میں آپ کی ساتھی خاتون کو زنان خانے میں لے جانا چاہتا ہوں......"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے سلاما۔ میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ یہ کوئی غیر نہیں ہے بلکہ میری بہن ہے۔ جائیے آپا میں جنازے کے ساتھ ہی قبرستان جاؤں گا۔" جملے کا آخری حصہ میں نے ناگن بہن سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔



مغرب تک تدفین ہو گئی۔ ایک ایک کر کے سب ہی لوگ قبرستان سے چلے گئے۔ چوہدری نظام کے قریب و دور کے عزیز بھی روانہ ہو گئے صرف چوہدری عبدالسلام اور بہرام خان ہی باقی رہ گئے۔

"چلئے وصی بھرا۔ بہت اندھیرا ہو گیا ہے اور سردی بھی بڑھ گئی ہے ...." عبدالسلام میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

"نہیں سلامے۔ آپ دونوں جائیں میں اپنے پیاروں کی قبروں پر فاتحہ کے بعد جاؤں گا۔ رہ گیا اندھیرے کا سوال' تو وہ تو میری زندگی پر اسی وقت چھا گیا تھا جب مجھے میرے پیاروں کی اذیتناک موت کا علم ہوا تھا......"

"وصی الدین بھرا۔ جنہیں جانا ہوتا ہے وہ کسی کا انتظار کئے بغیر چلے جاتے ہیں۔ کب

تک ان کی جدائی میں ڈوبے رہو گے ...؟"" "میری زندگی میں اجالا اسی وقت ہوگا سلامے 'جب میرے پیاروں کے قاتل، مٹ جائیں گے۔ تم لوگ جاؤ میرے پاس ٹارچ بتی ہے۔ سردی مجھے زیادہ پریشان نہیں کرے گی۔

غرضیکہ تھوڑی سی بات چیت کے بعد دونوں چوہدری اپنی جیپ میں بیٹھ کر چلے گئے۔

میں ایک گہری سانس لے کر اپنے پیاروں کی قبروں کی طرف بڑھا۔ میرے ابا اور دادا کی قبریں چند ہی قدموں کے بعد تھیں۔ اندھیرا وزقعی گہرا ہو گیا تھا مگر وہ اس قدر بھی نہیں کہ مجھے ٹارچ استعمال کرنی پڑتی۔

جھاڑیوں اور کچی پکی قبروں سے بچتے بچاتے میں ابا اور دادا کی قبروں کے سرہانے پہنچ گیا۔ ہر طرف سائیں سائیں کر تا سناٹا تھا۔ حشرات الارض کی آوازیں ہر طرف سے گونج رہی تھیں اور سیاہ فضاؤں میں لاتعداد چمگادڑیں چکرا رہی تھیں۔

گو کہ گاؤں اور قبرستان کے درمیان قد آدم کھیت اور اونچے نیچے درخت حائل تھے اس کے باوجود گاؤں کے مکانوں کی روشنیاں جگنوؤں کی طرح نظر آرہی تھیں۔

ابھی مجھے پانچ ہی منٹ گزرنے پائے تھے کہ اچانک ہی میری سماعت سے ایک عجیب سی ہولناک آوز ٹکرائی۔ بالکل یوں لگا جیسے کسی درندے کے حلق میں ہڈی اٹک گئی ہو۔ فی الفور میرے ذہن میں خطرے کا احساس جاگ اٹھا۔ مجھے گنزا کے الفاظ یاد آگئے۔ اس نے کہا تھا کہ میری حویلی کے ہر کمرے سے جنات نکل گئے ہیں مگر وہ گاؤں سے نہیں گئے گمان اغلب ہے کہ وہ مجھے کسی نہ کسی طرح ضرور گھیریں گے۔ میں نے فوراً ہی پینٹ بیلٹ سے لٹکتی ہوئی انتہائی طاقتور روشنی والی ٹارچ نکال لی' ساتھ ہی کمر سے لپٹا ہوا ہنٹر بھی کھینچ لیا۔

آواز تھی کہ پھیلتی چلی آرہی تھی۔ اب تو دھب دھب کے دھماکے بھی سنائی دیئے جیسے کوئی بھاری قدموں میرے قریب پہنچ رہا ہو۔

چند لمحے آواز کی سمت معلوم کر لینے کے بعد میں نے ٹارچ روشن کرلی۔ یوں لگا جیسے اندھیرے میں دن نکل آیا ہو۔ پھر' روشنی میں اپنی نوعیت کا ناقابل یقین واقعہ دیکھ کر میرے ذہن پر بڑی زور کا چھناکہ ہوا۔ ایک ہی لمحہ کے اندر میرے جسم سے گویا جان ہی

نکل گئی لیکن ایک لمحہ گزرنے سے پہلے ہی میرے اوسان حال ہو گئے۔

وہ چوہدری نظام تھا' سر سے پیروں تک سفید کفن میں لپٹا ہوا۔ اس کی آنکھیں بند اور منہ کھلا ہوا تھا اور کھلے ہوئے منہ اور حلق سے خون بہہ رہا تھا۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ بہتا ہوا خون نہ تو اس کے کفن پر گر رہا تھا اور نہ ہی زمین پر۔

وہ اس طرح قدم اٹھا رہا تھا جیسے دنگل میں کوئی کودنے والا پہلوان اٹھاتا ہے۔

اس کے سر پر صرف چند فٹ کی بلندی پر پچاسوں چمگادڑیں لہرا رہی تھیں۔

مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ چوہدری نظام کے مردہ جسم میں آتشی مخلوق کا کوئی جن قابض ہو چکا ہے۔

''آجاؤ...... آجاؤ شیطان میں تمہارا ہی منتظر تھا......'' میرے لبوں سے حیرت انگیز طور پر سفاکی و درندگی سے بھرپور آواز نکلی۔ میں نے ٹارچ بجھا کر کمر بیلٹ سے اڑسا لی اور زائیں زائیں سے کوڑا لہراتے ہوئے قدم قدم پیچھے ہٹنے لگا۔ میں اصل میں تھوڑا سا کر اس لے کر چوہدری نظام کی قبر تک پہنچنا چاہتا تھا۔

سناٹا لرزتا رہا' ماحول بھیانک سے بھیانک تر ہوتا گیا۔ وہ میری طرف بڑھتا رہا اور میں نظام کی قبر کی طرف۔

جلد ہی میں نظام کی قبر کے قریب پہنچ گیا اور پھر ٹارچ کی روشنی میں قبر کا جائزہ لیتے ہی میں ایکشن کے لئے تیار ہو گیا۔

قبر واقعی کھلی ہوئی تھی۔ ایک لمحہ کی تاخیر کے بغیر میں نے باوجود اندھیرے کے کوڑا لہرا دیا۔ شپ سے کوڑے کی لمبی اور روشن زبان نظام کے مردے کی گردن میں لپٹ گئی۔ لپٹی رہی تھی کہ نظام کے کھلے ہوئے منہ سے آتش فشاں پھٹنے کی سی ہولناک آواز نکلی۔ ابھی آواز نے نصف فاصلہ ہی طے کیا تھا کہ میں نے دوسرا ہاتھ بھی کوڑے کے دستے پر جما کر پوری مہارت سے جھٹکا دیا کہ نظام کا مردہ دھب سے قبر کے گہرے گڑھے میں جا گرا۔ گرتے ہی قبر سے لمبی لمبی چنگاریاں نکلنے لگیں جیسے ستارے ٹوٹ رہے ہوں۔ اس کے ساتھ ہی ایسی ہولناک غیر انسانی چیخیں بھی گونجیں کہ سیاہ فضائیں تھرا کر رہ گئیں ذرا

سی دیر میں ابدی سکوت چھا گیا۔ لمبی لمبی چنگاریاں فضاء ہی میں تحلیل ہو گئیں اور چمگادڑوں کا ہجوم منتشر ہو گیا۔ میں نے ایک بار پھر ٹارچ کی روشنی قبر میں ڈالی۔ نظام کا کفن میں لپٹا ہوا مردہ اوندھے منہ پڑا تھا۔ اب ضروری ہو چکا تھا کہ میں قبر برابر کر دوں اور چوہدریوں کے الزام سے بچ سکوں۔

☆☆☆

پورا گاؤں ابدی سکوت میں ڈوبا ہوا تھا۔ اگر ڈھور ڈنگروں کی آوازیں سنائی نہ دیتیں تو زندوں کی بستی محسوس نہ ہوتی۔ کہیں بھی روشنی کی ہلکی سی رمق بھی دکھائی نہ دی۔ ویسے بھی یکے بعد دیگرے تین بڑوں کی المناک موت نے پورے گاؤں پر سحر ناک سناٹا طاری کیا ہوا تھا۔

مجھے اپنے ہی وجود پر شبہ سا ہونے لگا۔ یوں لگا جیسے میں خود بھی ویرانے میں بھٹکنے والی بدروح ہوں۔ ویسے بھی شب کا ایک بج چکا تھا۔ میرے ہاتھوں کے دونوں دستانے اور میرا لباس مٹی میں لتھڑا ہوا تھا۔ بہت محنت کرنی پڑی تھی مجھے قبر تو گورکن ہی بنا سکتے تھے۔

میں جب حویلی کی بیٹھک کے قریب پہنچا تو دروازہ ذرا سا کھلا ہوا پایا۔ اسی کھلے ہوئے حصے سے روشن لکیر بیرونی زمین سے چپکی ہوئی دیکھ کر میں نے یہی محسوس کیا کہ ناگن بہن میرے انتظار میں جاگ رہی ہو گی۔ ٹھنڈک کا یہ عالم تھا کہ میرے جسم میں کچوکے سے لگ رہے تھے۔

میں بے تحاشا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ پیٹرومیکس لیمپ جل رہا تھا مگر ناگن بہن موجود نہ تھی البتہ حاجی چاچا صوفے پر کمبلوں میں لپٹے ہوئے نیم غنودہ حالت میں پڑے تھے۔ میرے قدموں کی آواز پر انہوں نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔

''آگئے پترا......''

''السلام علیکم چاچا۔ آپ 'آپ اکیلے ہی ہیں...... ؟'' میں نے حیرت کا اظہار کیا۔

''او نہیں پترا۔ پانچ چھ منٹ پہلے ہی چند لوگ اٹھ کر گئے ہیں۔ کیا تم اکیلے ہی ہو...... ؟''

"ہاں چاچا۔ آپا کہاں ہے...... ؟" میرے تشویش بڑھنے لگی۔

"تیرے سامنے صبح کو کہیں گئی تھی۔ کیا وہ تجھ سے نہیں ملی ؟" میرے ہی ساتھ نظام کی حویلی تک گئی تھی۔ میں اسے حویلی ہی میں چھوڑ کر قبرستان گیا تھا......"

"اک گل ہو رہی پریشانی جو گی ہے گی پترا......"

"لوکی کی چاچا...... ؟" میں اوور کوٹ اور پھر کوٹ اتارتے ہوئے بولا۔ دستانے میں پہلے ہی اتار چکا تھا۔

"سویرے سدرہ تیرے نال گئی سی مگر تیری چچی کہہ رہی تھی کہ سدرہ حویلی ہی میں موجود تھی......"

"یہ ایک لمبی کہانی ہے چاچا۔ حیرت صرف اس بات پر ہے کہ آپا اب تک کیوں نہیں......"

میرا جملہ نامکمل ہی رہ گیا اس لئے کہ میں نے گھوڑے کی ٹاپوں اور ہنہناہٹ کی آواز صاف سن لی تھی۔ میں کوڑا اٹھا کر تیزی سے دروازے کی طرف بڑھا ہی تھا کہ ناگن بہن مسکراتی ہوئی در آئی اس کے ہمراہ دو قوی ہیکل اور بڑے بڑے مونچھوں والے نیزہ بردار جوان بھی تھے۔

"السلام علیکم صاحب بہادر......" دونوں جوان مجھے سلام کرتے رہ گئے مگر میں انہیں نظر انداز کر کے ناگن بہن کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ "آپا...... میں' میں آپ ہی کی تلاش میں نکلنے والا تھا......"

"تسی جاؤ جوانو چھوٹی چودھرائن سے مرا اور صاحب بہادر کا سلام کہہ دینا۔" ناگن بہن مجھے نظر انداز کرتے ہوئے دونوں سے بولی۔ "چنگا بی بی جی۔ رب راکھا......" کہتے ہوئے دونوں نیزہ بردار بیٹھک سے نکلے چلے گئے۔ ناگن بہن مسکراتے ہوئے حاجی چاچا کے ساتھ بیٹھ گئی۔ حاجی چاچا سے جملوں کے تبادلے کے بعد وہ میری طرف متوجہ ہوئی

"ہاں تو ویرا کیا کہہ رہے تھے تم...... ؟"

"چنگا پترا' میں تو چلا......" میرے کچھ کہنے سے پہلے حاجی چاچا اٹھ کھڑے ہوئے اور

میرے اصرار کے باوجود اکیلے ہی چلے گئے۔ میں نے فوراً ہی دروازہ بند کیا اور کنڈی لگا کر اپنے بیڈ کی طرف بڑھ گیا۔ "ویرا۔ تیری سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ سدرہ تجھے دیکھنے' تجھ سے ملنے اور تجھ سے بولنے کے لئے بے چین ہے۔ لگتا ہے تمہاری محبت سر چڑھ کر بولنے لگی ہے...... "ناگن بہن کوئی دو بجے تک مجھے سدرہ کے متعلق ہی بتلاتی رہی اور میں فرط مسرت سے آسمان کی بلندیوں پر پرواز کرتا رہا۔

"سدرہ ہی نے تمہارے لئے پیغام دیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ تاحال پوری حویلی عورتوں سے بھری ہوئی ہے۔ تین دن کے بعد ساری عورتیں اپنے اپنے گاؤں روانہ ہو جائیں گی۔ چوتھے روز تمہیں حویلی کے پشتی پائیں باغ میں ملنے کو کہا ہے۔ وہ تمہیں بہت کچھ بتلانا چاہتی ہے۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ چاروں بھائیوں کی بیگمات اپنے شوہروں سے سخت نفرت کرتی ہیں۔ ان میں دو تو بیوہ ہو چکی ہیں اور بقیہ دو بیوگی کی خواہش رکھتی ہیں۔ چاروں چودھرانیوں کے بارہ بچے ہیں اور بارہ کے بارہ لڑکے ہیں۔ لڑکیاں بھی ہوئیں تھیں مگر انہیں چاروں بھائیوں نے کسی نہ کسی طرح زہر دے کر مار دیا تھا......" "یہ...... یہ کیسے ممکن ہو ہے آپا؟ کوئی باپ اپنی بیٹی کو کیسے قتل کر سکتا ہے...... ؟" میں غیر یقینی سے بولا۔

"سب کچھ ممکن ہے ویرا۔ جہاں چوہدری نظام اور اس کے چاروں لالچی' شرابی اور زانی بیٹوں جیسے لوگ ہوں گے وہ کب چاہیں گے کہ لڑکیوں کو پال پوس کر جوان کریں اور ان کی شادیوں پر اپنی جائیداد کے ٹکڑے کریں۔ وہ تو اپنی دونوں بہوؤں کو بھی کئی بار قتل کرنے کی کوشش کر چکے ہیں مگر ہر بار بوڑھی چوہدرائن ان کے آڑے آتی رہی ہے......"



صبح میں آٹھ بجے بیدار ہو گیا۔ ناگن بہن جاگ ہی رہی تھی۔ ناشتے وغیرہ سے فراغت حاصل کرتے کرتے ساڑھے آٹھ بج گئے۔ نو بجے تک وہ ٹھیکیدار جسے حاجی چاچا نے میری حویلی کی صفائی مرمت اور لیپا پوچی کا ٹھیکہ دیا تھا' دس مردوں اور پانچ مزدور عورتوں کے

ساتھ پہنچ گیا۔ میں نے حویلی کے پانچوں بڑے کمروں' دالان اور اسٹور وغیرہ کے سب ہی دروازے اور کھڑکیاں کھول دیں۔ گو کہ ایسا کرتے وقت دس مزدور بھی ساتھ لئے تھے کیونکہ ہر کمرے میں جالے ہی جالے بھرے ہوئے تھے۔

غرضیکہ ٹھیکیدار کو ضروری ہدایات دے کر میں ناگن بہن کے ساتھ جیپ میں سوار ہو کر دادن خان چیک پوسٹ پہنچا اور البرٹ ہیکل کو اچھی خاصی رقم دے کر چکوال سے حویلی کی ڈیکوریشن کے لئے مطلوبہ سامان منگوا دینے کی سفارش کی اور دوپہر تک موجودہ حالات پر تبادلہ خیال بھی کیا۔



تین یوم بے انتہا مصروفیت میں گزر گئے۔ چوتھے روز میں نے سلطان بھائی کی طرف ضروری پیغام بھجوا دیا۔ ان تین دنوں میں عبدالسلام اور بہرام خان ناگن بہن کے ساتھ کئی ملاقاتیں کر چکے تھے۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ ناگن بہن کے حسن و جمال اور اداؤں پر مر مٹے ہیں۔ ان کے کسی انداز و گفتار سے ظاہر نہیں ہو رہا تھا کہ انہیں اپنے دو بھائیوں اور باپ کی موت کا ذرہ برابر بھی دکھ پہنچا ہے۔ جیسا کہ تین یوم میں حویلی کے تین کمرے مکمل ہو چکے تھے۔ یوں لگتا جیسے تینوں کمرے میں نے نئے سرے سے تعمیر کروائے ہوں۔

اس دوران کوئی غیر معمولی واقعہ بھی رونما نہیں ہوا تھا۔ نہ ہی گنزا اور اس کے پانچ مددگاروں میں سے کسی ایک سے بھی میری ملاقات ہو سکی تھی۔ نہ جانے کیوں مجھے یقین سا ہو چلا تھا کہ آتشی مخلوق سے تعلق رکھنے والے تینوں جنات و جنیاں مجھ سے کافی دور جا چکے ہیں۔ بہر حال' مغرب سے پہلے پہلے سلطان بھائی میری دونوں چھوٹی بہنوں' میرے اور میری بہنوں کے سامان سمیت پہنچ گئے تھے۔

ان کے پہنچ جانے سے وہ ذہنی خلاء جو میں شروع ہی سے محسوس کر رہا تھا' بھر گیا۔ اب تو ناگن بہن کا زیادہ تر وقت میری چھوٹی بہنوں کے ساتھ ہی گزرتا تھا۔ ایک طرح سے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ قصر چغتائی کی رونقیں بحال ہو چکی تھیں۔

ڈاکوؤں' بدروحوں اور شیطانی قوتوں کے ساتھ ساتھ چوہدری نظام اور اس کے

بیٹوں کا خوف لوگوں کے دلوں سے نکل چکا تھا اس لئے گاؤں کی رونقیں بھی بحال ہو چکی تھیں۔ فرط مسرت سے میرا رواں رواں سرشار تھا۔ اس سرشاریت میں سدرہ کی محبت میرے دل میں بام عروج پر پہنچ چکی تھی۔ چونکہ سدرہ سے ملاقات کا وقت قریب ہوتا جا رہا تھا اس لئے میرے دل میں' میرے وجود میں اور میری روح میں ایک عجیب سی کیف آور گدگدی ہو رہی تھی۔

رات کے کھانے کے ایک گھنٹے بعد ساڑھے نو بجے شب ناگن بہن کا اشارہ پا کر میں روانگی کی تیاری میں مصروف ہو گیا۔

دونوں بہوں کی طرف سے مطمئن اس لئے تھا کہ ان کے پاس ان کی بچپن کی سہیلیوں کا جمگھٹا سا لگا ہوا تھا۔ پھر یہ کہ سلطان بھائی کی موجودگی نے بھی میری کافی ڈھارس بندھائی تھی۔

اور جب شب کے دس بجے تو ناگن بہن نے مجھے مخصوص اشارہ کر دیا۔

ساڑھے دس بجے ہر طرح سے تیار ہو کر میں ناگن بہن کے ہمراہ چل دیا۔ سلطان بھائی اور دونوں بہوں سے میں نے یہی کہا کہ میں داون خان چیک پوسٹ تک جا رہا ہوں۔

غرضیکہ میں اپنے علاقے سے نکلنے کے بعد کھیتوں سے ملحقہ سنسان اور کچے راستے سے نظام کی حویلی کی طرف بڑھا ناگن بہن میرے ساتھ ساتھ تھی۔

بے پناہ اندھیرا تھا مگر چونکہ میں چند ہی روز میں گاؤں کے اندھیرے کا عادی ہو چکا تھا اس لئے مجھے اب کوئی پریشانی نہیں اٹھانی پڑتی تھی۔ اس کے باوجود بیٹری ٹارچ میرے پاس موجود تھی۔

دس منٹ تک مسلسل چلتے رہنے کے بعد میں نظام حویلی کے پشتی حصے میں پہنچ گیا۔ پشتی حصے میں ایک ہی لمبا چوڑا اور مضبوط لکڑی کا ما ہوا گیٹ تھا اور یہ گیٹ صرف حویلی کی خواتین کے استعمال میں رہتا تھا۔

جیسا کہ ناگن بہن حیثیت ناگن کے پوری حویلی کا اندرونی و بیرونی جائزہ پہلے ہی لے چکی تھی' اسی نے مجھے تہ خانے کے خفیہ راستے اور اندرونی حالات سے آگاہ کیا تھا اس لئے میں کسی تشویش کے بغیر پیپل کے درخت کے نیچے پہنچ کر رک گیا۔ یہ اور ایسے کئی

درخت حد بندی دیوار کے ساتھ تھے جن کی بہت سی مضبوط شہنیاں اندر تک پھیلی ہوئی تھیں۔ گو کہ درخت کے نیچے بے پناہ اندھیرا تھا اس کے باوجود میں اپنے آئندہ قدم کا فیصلہ کر چکا تھا۔

پھر درخت پر چڑھنے سے پہلے میں ناگن بہن کی طرف گھوما مگر ناگن بہن غائب ہو چکی تھی۔

لاپرواہی سے سر جھٹک میں نے کمر سے لپٹا ہوا کوڑا کھینچ لیا اور ایک موٹی و مضبوط شہنی کا انتخاب کر کے پوری مہارت سے کوڑا لہرا دیا۔

دو تین جھٹکے دینے کے بعد جب مجھے یقین ہو گیا کہ کوڑا میرا وزن سہار لے گا تو میں نے اچھل کر تنے سے پیر ٹکائے اور ذرا سی کوشش میں اوپر گھنی ٹہنیوں اور پتوں کے درمیان پہنچ گیا' پھر اپنی نظروں کے سامنے تقریباً ڈھائی فٹ کے فاصلے پر ایک موٹی شہنی سے لٹکا ہوا انسانی جسم دیکھ کر میرا ذہن بھک سے اڑ گیا۔

میں کسی بندر کی طرح موٹی شہنی پر اکڑوں بیٹھا تھا۔ اپنے جسم کا وزن سہارنے کے لئے میں نے دونوں ہاتھوں سے اوپر والی شہنی تھام رکھی تھی۔ میرے ایک ہاتھ میں میرا پراسرا ہنٹر بھی دبا ہوا تھا۔

وہ کوئی عورت تھی جس کا آدھا دھڑ ایک طرف اور آدھا دھڑ دوسری طرف لٹکا ہوا تھا۔ میری نظروں کے سامنے کمر سے اوپر جسم تھا۔ اس کی دونوں گوری چٹی بانہیں اور سر کے سیاہ و لمبے بال زمین کی طرف لٹکے ہوئے تھے۔ وہ بالکل ہی بے حس و حرکت تھی۔

اسی درخت کے کسی حصے سے کسی بھی پرندے کی کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی جب کہ حد بندی دیوار کی دوسری جانب والی ہریالی سے جھینگروں کی سیٹیاں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا چند لمحوں کے لئے تو میں بالکل ہی بے جان سا ہو گیا تھا۔ چند لمحوں بعد جب میں اپنے بکھرے ہوئے اوسان پر قابو پانے میں کامیاب ہوا تو میں نے بائیں ہاتھ سے تو اوپر والی شہنی مضبوطی سے تھامے رکھی اور دایاں ہاتھ جس میں میں نے ہنٹر تھاما ہوا تھا آگے بڑھا کر الٹی لٹکی ہوئی عورت کے بال پکڑ لیے۔ صرف اس

لئے کہ میں اس کا چہرہ دیکھ سکوں۔

جیسے ہی میں نے بال پکڑے الٹی لٹکی ہوئی عورت کے بال آگ کی طرح جل اٹھے اور اس کا پورا وجود ملیریا کے مریض کی طرح کانپنے لگا اور وہ انتہائی ڈراؤنی آواز میں چیخ پڑی۔ میں نے ہلکی سی کراہ کے ساتھ اس کے بال چھوڑے اور اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ میرے پوری وجود میں ہلکی سی کپکپی طاری ہو چکی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ فیصلہ کر پاتا عورت نے ایک جھٹکے سے اپنا سر اٹھالیا۔ اس کا چہرہ دیکھتے ہی میرے رگ و پے میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ وہ عجیب سے ہولناک نقش و نگار کی عورت تھی۔ انسانی ہی نقوش تھے اس کے مگر بالکل گلہری کی طرح اس کی آنکھیں زیرو وولٹ بلب کی طرح سلگ رہی تھی اور وہ کسی تھکے ہوئے گھوڑے کی طرح ہانپ رہی تھی۔

فی الفور گنزا کی ہدایت مجھے یاد آگئی۔ اس نے بتلایا تھا کہ میری حویلی پر قابض جنات' حویلی کے کمروں سے تو جا چکے ہیں مگر گاؤں سے نہیں گئے اور میری تاک میں لگے ہوئے ہیں۔ آن واحد میں میری مدافعانہ قوتیں جاگ پڑیں۔ یہ سب کچھ ایک لمحہ میں ہو گیا اور دوسرا لمحہ شروع ہونے سے پہلے ہی میں اٹھ کھڑا ہوا۔

اٹھا ہی تھا کہ گلہری کے نقوش رکھنے والی عورت نے پلک جھپکنے کی دیر میں اپنے دونوں ہاتھوں سے میری ٹانگیں پکڑ لیں۔ مجھے یوں لگا جیسے مجھے آگ کے الاؤ میں پھینک دیا گیا ہے۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ میری ٹانگیں کھینچتی' میں نے بجلی کی سی تیزی سے چھپاک سے کوڑے کی ضرب اس کی پیٹھ پر رسید کر دی۔

رسید کی ہی تھی کہ اس نے ایک اندوہناک چیخ کے ساتھ میرے پیر چھوڑ دیئے اور قلابازی لگا کر زمین کی طرف گری۔ میں صرف اتنا ہی دیکھ پایا تھا کہ جہاں اس کے جسم پر کوڑا لگا تھا وہاں ایک لمبی سی گہری اور آگ اگلتی دراڑ سی پڑ چکی تھی۔

کوئی دھماکہ نہیں ہوا' صرف اتنا نظر آیا کہ چند فٹ نیچے آگ کی لپٹیں سی اٹھ رہی ہیں اور ایسی آوازیں گونج رہی ہیں جیسے چند چوہے ایک آواز میں باہم لڑ گئے ہوں۔

چند ہی لمحوں بعد ابدی سکوت چھا گیا اور میں کوڑے کو دانتوں میں داب کر انتہائی

احتیاط سے درمیانی رکاوٹیں عبور کر کے حدبندی دیوار پر پہنچ گیا۔ دیوار اس قدر چوڑی تھی کہ ٹہنیوں کو تھامے بغیر میں باآسانی اکڑوں بیٹھ گیا۔ اندرونی جانب گھرے اندھیرے کی حکمرانی تھی۔

پھلوں کی ایسی مدہوش کن خوشبو' میرے نتھنوں سے ٹکرائی کہ چند لمحے قبل کی تمام کوفت میرے ذہن سے مٹ گئی۔

ابھی میں اندرونی زمینی جائزہ بھی لینے پایا تھا کہ ایک مدھ بھری روح پرور آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ آواز میں خوف کی کپکپاہٹ صاف محسوس ہوئی تھی۔

"کوئی ہے...... ؟"

سرگوشی کے باوجود میں اس آواز کو پہچان چکا تھا۔ گزرا جھ سے اسی جلترنگ بجاتی آواز میں باتیں کیا کرتی تھی اور ہمیشہ اسی لباس میں میرے سامنے آتی رہی تھی' جس لباس میں میں نے سدرہ کو دن کے اجالے میں 'وکٹوریہ میں کھڑے دیکھا تھا۔

میرے دل کی دھڑکنیں اچانک تیز ہو گئیں۔ گزشتہ تمام کارروائی نے میرے جسم پر کوئی اثر نہیں چھوڑا تھا مگر سدرہ کی آواز سنتے ہی میرے جسم میں لذت آمیز ٹھنڈک دوڑ گئی۔

"آپ...... آپ کون ہیں...... ؟" میں نے دل کی دھڑکنوں پر قابو پا کر سرسراتی آواز میں پوچھا۔

"آپ...... آپ کی خادمہ سدرہ ہوں۔ السلام علیکم۔" وہی رس گھولتی آواز تھی جو مجھ پر کیف آور نشہ ساطاری کر دیتی تھی۔ پھر یہ کہ سلام کی ادائیگی نے واضح کر دیا تھا کہ سدرہ بذات خود موجود ہے اس کے روپ میں کوئی مافوق الفطرت ہستی نہیں ہے۔

"واعلیکم السلام سدرہ میں' میں وصی الدین ہوں۔ ہوشیار میں نیچے آرہا ہوں......" کہتے ہوئے میں نے دیوار سے اندرونی سمت نکلی ہوئی مضبوط ٹہنی کو پکڑا اور ایک جھٹکے سے جھول گیا۔

"کیسے ہیں آپ...... ؟" وہ سر جھکائے ہوئے بولی۔ اس کے لہجے میں حوروں جیسی

معصومیت تھی۔

ہم دونوں سرسبز و شاداب صحن کے وسط میں بنے ہوئے سنگ مرمر کے حوض کی منڈھیر پر بیٹھ گئے تھے۔ گو کہ ہم اندھیرے کا ایک حصہ بنے ہوئے تھے۔ سدرہ نے اپنا پورا وجود دبیز اور سیاہ اونی کمبل میں اس طرح سمیٹ رکھا تاکہ اس کے چہرے کے علاوہ جسم کا کوئی حصہ نظر نہیں آرہا تھا۔

بلا مبالغہ کہہ سکتا ہوں کہ وہ اس قدر حسین تھی جیسے سیاہ بدلیوں سے چاند جھانک رہا ہو۔

"تھوڑی دیر پہلے تو بالکل ٹھیک ٹھاک تھا سدرہ مگر، تم سے رخصت ہونے کے بعد شاید ٹھیک نہ رہ سکوں......" میں سراپا مجنوں بن گیا۔ "کیوں جی۔ کیا میں نے آپ کے چٹکیاں بھری ہیں......؟" وہ انتہائی سادگی سے بولی۔

اور پھر ہمارے درمیان رومان پرور ڈائیلاگ کا ایسا سلسلہ چل نکلا کہ تکلف کی تمام دیواریں منہدم ہو گئیں۔ ہم ایک قالب دو جان بن گئے۔ آج میں بہت خوش تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے مجھے ہفت اقلیم کے خزانے مل گئے ہوں۔ میں نے دوران گفتگو شدت جذبات سے بے خود ہو کر تین بار سدرہ کے لبوں سے اپنے لب چپکا دیئے تھے۔ ہر بار وہ چھوئی موئی کی طرح سمٹ کر میری بانہوں میں جھول جاتی۔

"لالا سلام تے لالا ابرام شامے چکوال گئے نے۔ شاید صبح تک یا پھر رات ہی میں لوٹ آئیں۔ بہتر یہی ہے کہ آپ پہلے وہ کام کر لیں جس کے لئے میں نے آپ کو سندیسہ بھجوایا تھا......" رومان پرور ماحول سے نکلتے ہوئے سدرہ اچانک سنجیدہ ہو گئی۔

"او ہاں......" میں ریڈیم ڈائل گھڑی میں وقت دیکھتے ہوئے بولا۔ شب کے ساڑھے بارہ بجنے والے تھے۔ ٹھنڈ بھی اس قدر بڑھ گئی تھی کہ کھلے آسمان تلے، سرسبز صحن میں ہمارا مزید رکنا نقصان کا باعث بھی بن سکتا تھا۔

"ہاں ہاں کہو سدرہ۔ کیا کام لینا ہے مجھ سے......؟" میں بھی سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے بولا۔

”میں نے ایک بار شاید چار پانچ برس قبل اس وقت جب آپ کے والد صاحب کو قید سے رہا کئے ہوئے تھوڑی ہی دیر گزری تھی......“ والد صاحب کے تذکرے پر میرے جسم میں اچانک ہی انگارے دوڑنے لگے تھے۔ میرے ہاتھوں کی مٹھیاں پوری شدت سے بھنچ گئی تھیں اور سدرہ میری کیفیت سے بے خبر بولتی رہی۔

”مہرام لالا کو یہ کہتے سنا کہ ’یہ چغتائی فیملی کی مکمل تباہی کے آخری اور اصل دستاویزات ہیں جن کی بدولت ہم باغ‘ دوکانوں اور تین شوگر ملوں کو ہتھیانے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ اب بھی اگر رفیع الدین نے راضی خوشی اپنی دونوں بیٹیوں کا رشتہ دینے سے انکار کیا تو تینوں ہی بلکہ چاروں ہی عبرت کا نشان بن جائیں گے آپ سوچ رہے ہوں گے کہ میں اپنے سگے بھائیوں کے راز کیوں افشاں کرنے لگی ہوں؟ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ میرے چاروں بھائی بے غیرت ہیں۔ ان کی نظروں میں صرف اور صرف دولت و جائیداد کی اہمیت ہے انہوں نے مجھے اور آپا کو کئی بار مارنے کی کوشش کی ہے۔ صرف اس لئے کہ چوہدری نظام کی تمام جائیداد کی اصل وارث ہم دونوں بہنیں ہیں۔ میرے دادا چوہدری محمد سبحان نے پوری جائیداد ہم دو بہنوں کے نام کر دی تھی اس لئے کہ میرے ابو میرے بھائیوں سے کہیں بڑھ کر ظالم‘ مکار اور زانی تھے۔ انہوں نے نہ جانے کتنے زمینداروں کی جائیداد پر قبضہ کر کے انہیں قتل کروا دیا تھا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ انگریزوں سے محض جاگیریں حاصل کرنے کے لئے میرے بھائیوں نے ہماری عصمت تک کو داؤ پر لگا دیا تھا۔ اگر ہماری ماں ’وڈی چودھرائن اور ہماری دونوں بڑی بھر جائیاں ہماری ڈھال نہ بنتیں تو شاید انگریز ہماری عصمت بھی پامال کر چکے ہوتے۔ اور بھی سینکڑوں وجوہات ہیں۔ یہاں اس حویلی کے نیچے ایک تہ خانہ بھی ہے۔ میں نے خود دیکھا ہے کہ آپ کے والد صاحب سے حاصل کردہ دستاویزات کا فائل میرے ابو تہ خانے میں لے گئے تھے۔ اندر تہ خانہ کیسا ہے‘ کتنے کمرے ہیں اس میں اور وہاں کیا کیا رکھا ہے میں قطعی نہیں جانتی۔ میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ جس جائیداد پر میرا ابا اور میرے بھائی سانپ بنے بیٹھے تھے اس کی اصل کاغذات میری ماں وڈی چوہدرائن کی حفاظت میں ہیں اسی وجہ سے وہ اب تک زندہ بھی

ہے۔
میری ماں آپ کو لڑکپن ہی سے پسند کرتی تھی آپ کی امی مرحومہ سے انھیں میرا رشتہ دینے کا وعدہ بھی کیا تھا۔ اس راز کے افشاں ہوتے ہی میرے ابا اور میرے بھائی چغتائی فیملی کے دشمن بن گئے تھے۔ وہ میری اماں سے بذریعہ تشدد اصل دستاویزات اس لئے بھی حاصل نہیں کر سکتے تھے کہ میری ماں پنجاب کے بہت بڑے غیور اور طاقت ور نواب خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ اگر ماں جی کو ذرا بھی نقصان پہنچتا تو میرے ابا کو اس کے تمام خاندان سمیت تہس نہس کر دیا جاتا......"

"تہ خانے کا راستہ کہاں ہے......؟" میں پھنکارتی آواز میں بولا۔ پہلی بار سدرہ کو احساس ہوا کہ میرے ایک ایک لفظ سے شعلے سے برس رہے ہیں۔

حالانکہ ناگن بہن نے تہ خانے میں داخلی راستے کی تمام نشانیاں مجھے بتلائی ہوئی تھیں' جنہیں ظاہر کر کے میں سدرہ کو ناگن بہن کی طرف سے مشکوک نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"یہ...... یہ حوض ہی تہ خانے کا داخلی راستہ ہے۔ یہ پانی سے بھرا ہوا ہے لیکن...... وہ' وہ مورتی......" سدرہ ایک ہیولے کی طرف اشارہ کرتی ہوئی بولی۔ "میرا ابا اسی مورتی کے پاس کھڑا تھا اور مورتی کا سر مغربی سمت گھما تا رہا تھا۔ میں بالکونی میں کھڑی ہوئی پردے کی اوٹ سے سب کچھ دیکھ رہی تھی۔

چاندنی رات تھی اور میں یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ حوض کا سارا پانی غائب ہو گیا ہے اور وسط میں ایک گڑھا سا نظر آنے لگا تھا۔

ابا اسی گڑھے میں غائب ہو گئے تھے۔ وہ اپنی خواب گاہ میں کب پہنچے' یہ مجھے معلوم نہیں ہو سکا۔ مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ دو ڈھائی گھنٹے ابا کی واپسی کے انتظار سے اکتا کر میں اپنی خواب گاہ میں چلی گئی تھی۔

"سنو سدرہ۔ میں تہ خانے میں چلا جاؤں گا۔ شاید صبح ہونے سے پہلے لوٹ آؤں یا شاید ایک دو روز بعد لوٹوں۔ ہر دو صورتوں میں تم اپنی زبان بند رکھو گی۔ اگر اس دوران

میری آپا تم سے ملے تو اسے کہنا کہ فوزیہ 'فرحین اور سلطان بھائی کو مطمئن کر دے۔"

☆☆☆

میں نے ٹارچ روشن کر لی اور روشنی کا رخ جیسے ہی گہرائی میں ڈوبتے زینوں کی طرف کیا' بے ساختہ میرے لبوں سے اطمینان کی طویل سانس نکل گئی۔

وجہ بھی معقول تھی' پانچویں زینے سے ایک سانپ اتر رہا تھا۔ روشنی ہوتے ہی سانپ نے پھن اٹھایا' میری طرف دیکھا اور فوہ...... فوہ کی بھیانک آواز سے پھنکارتے ہوئے بڑی تیزی سے گہرائی میں ڈوبتا چلا گیا۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہ ناگن بہن ہے اور مجھے محتاط رہنے کی تاکید کر رہی ہے۔

میرا اندازہ ہے کہ دس فٹ گہرائی میں اترنے کے بعد میرے قدم زمین سے لگے تھے۔ یہ ایک راہداری تھی جس کے دونوں طرف دروازے نظر آئے۔ دروازے بند تھے بلکہ کھڑکیاں بھی بند تھیں۔ صرف آخری دائیں جانب والے کمرے میں روشنی نظر آ رہی تھی۔

روشنی راہداری میں بھی تھی۔ کچھ کچھ فاصلے پر دیواروں میں روشن بلب لگے ہوئے تھے جو یقیناً بیرونی جنریٹر سے کرنٹ حاصل کرتے ہوں گے۔

چند لمحے کچھ سوچتے رہنے کے بعد میں نے روشن کمرے ہی کی طرف قدم بڑھا دیئے۔

پھر' جیسے ہی میں روشن کمرے کی کھلی ہوئی کھڑکی کے قریب پہنچا' اندرونی منظر دیکھتے ہی میرے سر پر کشت و خون کا جنون سا سوار ہو گیا۔

کافی کشادہ کمرہ تھا۔ ایک کونے میں شاندار پلنگ مع بستر کے رکھا تھا۔ زمین پر قیمتی قالین بھی بچھا ہوا تھا اور قالین پر مادر زاد برہنہ ایک جوان سی عورت اپنے ہی خون میں لت پت ایڑیاں رگڑ رہی تھی۔ اس کے قریب ایک دراز قد مرد اپنے خون آلود ہاتھوں میں خون آلود چھری لئے گھٹنوں کے بل بیٹھا ہوا وحشیانہ انداز میں بڑبڑا رہا تھا۔

"مجھے بدنام کر دے گی' میری بیوی کو بتلائے گی' پولیس میں میرے خلاف کمپلین

کرے گی۔ جا' میں نے تجھے ساری تکلیفوں سے آزاد کر دیا۔ اب جا کر مجھے بدنام کر' میری بیوی کو میری اصلیت بتلا اور ...... اور جا کر پولیس میں میرے خلاف رپورٹ لکھوا۔

میں نے صرف تیری جوانی سے لطف اندوز ہونا تھا۔ سو ہو لیا اب ...... اب میرے شکاری کتوں کی باری ہے ......''

وہ بڑبڑاتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا اور مقتولہ کا چہرہ میرے سامنے آگیا۔ گو کہ قاتل نے اس کا نرخرہ کاٹ دیا تھا۔ اس کے باوجود میں اسے پہچان گیا تھا یہ فرحہ تھی ڈھوک ٹالیاں کے ڈاکٹر تجمل حسین کی کمپاؤنڈر ایاز حسین کی بہن' جسے میں نے پنڈت دھرم راج کے زمین دوز اڈے سے رہائی دلوائی تھی۔

ابھی تک میں قاتل کا چہرہ نہیں دیکھ سکا تھا۔ وہ میری طرف پیٹھ کئے ہوئے تھا اور ستر پوشی کے لئے تہبند باندھے ہوئے تھا۔ سچویشن ایسی تھی کہ میری قوت برداشت جواب دے گئی میں نے کھڑکی سے ہٹ کر ایک زوردار ٹھوکر دروازے پر رسید کر دی کھٹاک کی تیز آواز پورے تہ خانے میں گونجتی رہ گئی اور اس غیر متوقع افتاد سے بہت بری طرح گھبرا کر ایک کراہ کے ساتھ قاتل پلٹا۔

وہ ...... وہ' چوہدری بہرام تھا۔ ڈائریکٹر آف روینیوں جس کے متعلق سدرہ نے بتلایا تھا کہ وہ چکوال گیا ہوا ہے۔

''تو ......'' مجھ پر نظر پڑتے ہی بہرام کے لبوں سے حیرت میں ڈوبی ہوئی آواز نکلی۔ ایک لمحہ کے لئے تو اس کے چہرے پر مردنی چھا گئی تھی لیکن پھر ایک لمحہ گزرنے سے پہلے ہی وہ سراپا درندہ بن گیا۔

''تو یہاں تک کیسے پہنچا ...... ؟'' بہرام کی آواز کسی باؤلے کتے سے مختلف نہ تھی اور سناٹے میں ایک گونج سی لئے ہوئے تھی۔

''میری محبوبہ سدرہ نے مجھے پہنچایا ہے۔'' میں نے دونوں ہاتھ اپنی کمر سے لگاتے ہوئے کہا۔ میرے لہجے میں بے پناہ خونخواریت تھی۔

''بہت خوب کیا سدرہ نے۔ میرا بہت بڑا مسئلہ حل ہو گیا۔ اب تو یہاں سے تیری

روح ہی جائے گی۔ اس سے پہلے کہ تو میرے ہاتھوں عبرت کی موت مر جائے' میں کچھ راز کی باتیں تجھے بتلانے لگا ہوں۔

یہ 'یہ کمرہ جو تم دیکھ رہے ہو اس میں تمہارے ابا رفیع الدین بھی چھتیس گھنٹے گزار چکے ہیں۔ اسی کمرے میں اس نے اسٹامپ پیپرز پر دستخط کئے تھے۔

وہ...... وہ جو سامنے دروازے دیکھ رہے ہو اس میں تمہاری دونوں پری چہرہ بہنیں قید تھیں۔ ہم دو...... دو بھائی یہاں آتے اور رات بھر ان کے ساتھ داد عیش گزار دیتے۔ وہ چیختیں' چلاتیں مگر اس تہ خانے کی دیواروں سے ٹکرا کر ان کی آواز ان ہی کے گلے میں اٹک جاتی۔

آٹھ روز بعد جب تمہارے ابا نے اصل ڈاکومنٹس فائل ہمارے سپرد کر دیا تو...... ہم نے انگریزی افسروں کو بھی تمہاری بہنوں کی جوانی سے سیراب ہونے کا موقع فراہم کیا اور پھر انہیں شکاری آدم خور کتوں کے سامنے ڈال دیا۔

جب تمہارے ابا تمہاری بہنوں کے کفن دفن سے فارغ ہوئے تو میں نے اپنے ہاتھوں سے اسے قتل کیا۔"

بہرام کا ایک ایک لفظ میرے دماغ پر ہتھوڑے کی ضرب بن کر برستا رہا۔ میری رگوں میں لہو آتش فشاں کے لاوے کی طرح دوڑنے لگا تھا۔

"بہرام......" میرے لبوں سے خون پینے والے ویمپائر کی سی آواز نکلی۔ "جو کچھ تم نے مجھے بتلایا ہے' وہ سب کچھ مجھے معلوم تھا۔ تم کو روکا ٹوکا اس لئے نہیں کہ تم دنیا سے حسرتیں سمیٹ کر نہ جاؤ......"

"نہیں۔ تم جھوٹ بول رہے ہو......"

"چلو جھوٹ ہی سہی لیکن سن لو۔ ارسلان کو' انسپکٹر ڈیوڈ اور دیگر لوگوں کو میں نے قتل کیا تھا۔ دھیراج اگھوری اور اس کے چیلوں سے میں نے ہی انتقام لیا تھا......" میں بہرام کو پوری تفصیل بتلانے کے بعد بولا۔

"ملو گے میری بہن سے۔ یہ میری وہ بہن ہے جس نے بہت سے ظالموں کو ڈھانچے

میں بدل دیا تھا۔

"آپا...... اگر آپ اس وقت موجود ہیں تو پلیز سامنے آ جاؤ......" میں بہرام پر نظریں جمائے ہوئے بولا۔

میرا جملہ مکمل ہوا ہی تھا کہ کمرہ دہشت ناک پھنکاروں سے گونج اٹھا۔ بہرام کے چہرے پر پہلی بار خوف کے آثار چھا گئے وہ پلکیں جھپکائے بغیر ناگن کو تکنے لگا جو پھنکارتی ہوئی کھلے ہوئے دروازے سے کمرے میں داخل ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے انسانی روپ میں آ گئی۔

"یہ میری بہن ہے بہرام۔ شیش ناگن۔ یہ تمہیں اور سلامے کو بھی ہڈیوں کے ڈھانچے میں بدل دیتی مگر میں نے ان سے وعدہ لیا تھا کہ تمہیں اور سلامے کو میرے لئے چھوڑ دیں۔ چلو' آگے بڑھو اور مجھے ختم کر دو یا خود مٹ جاؤ......" میرے چمکارنے پر بہرام میری طرف متوجہ ہو گیا مگر وہ ناگن بہن کی وجہ سے اس قدر خوفزدہ ہو چکا تھا کہ اس کا پورا جسم کپکپانے لگا تھا۔

چند لمحے اس کے حملے کا انتظار کرتے رہنے کے بعد میں نے ہی پہل کر دی۔ میں نے امریکن اسٹائل میں اچھل کر پیر کی ایک زبردست ٹھوکر اس کی پسلیوں پر رسید کر دی۔ وہ خارش زدہ کتے کی طرح بلبلاتے ہوئے پسلیاں تھام کر شدت درد سے دوہرا ہو گیا۔ چھری اس کے ہاتھ سے گر چکی تھی' وہ جیسے ہی جھکا میں نے عقاب کی طرح جھپٹا مار کر اس کی گردن دبوچ لی۔

المختصر' پانچ منٹ کے تابڑ توڑ حملوں سے میں نے اس کے تمام کس بل نکال دیئے اس کا چہرہ لہولہان ہو گیا۔ کئی جگہ سے اس کی پسلیاں ٹوٹ گئیں۔ وہ زمین پر پڑا خارش زدہ کتے کی طرح بلبلانے لگا۔

پھر' مجھے اس پر رحم آ گیا۔ میں نے وہی خون آلود چھری اٹھائی اور اسے ذبح کرنا ہی چاہتا تھا کہ..

"نہیں ویرا......" ناگن بہن چلا اٹھی۔

''اسے اتنی آسان موت نہ مارو۔ اس کے شکاری کتے بھوکے ہیں مالک کا گوشت بڑی رغبت سے کھائیں گے......''

بات سمجھ میں آنے والی تھی۔ میں نے اپنا ہنٹر کھینچا اور چھپاک سے بہرام کی گردن پر رسید کر دیا۔

''آپا...... کتوں کے ٹھکانے تک میری رہنمائی کرو......

ناگن بہن کمرے سے نکلی اور میں بھی بہرام کو کتے ہی کی طرح گھسیٹتے ہوئے تعاقب میں چلا۔

بہرام اپنی تمام اذیتیں بھول کر گھٹی گھٹی آواز میں التجائیں کرتا رہا۔ واسطے دیتا رہا۔ بڑی بڑی لالچیں دیں۔ وہ چاہتا تھا کہ میں اسے خود ماروں' کتوں کے سامنے نہ ڈالوں۔

آخری کمرے کے بند دروازے پر پہنچ کر ناگن بہن نے جیسے ہی دروازہ کھولا' چند کتوں کے بھونکنے کی ملی جلی آوازوں نے میرے جسم پر کپکپی سی طاری کر دی۔

''ویرا۔ تم دروازے سے اندر نہیں جاؤ گے۔ اس لئے کہ دروازے کے پار زمین نہیں ہے بلکہ دس فٹ گہرائی اور کئی مربع فٹ چوڑی کھڈ ہے اور کتے اسی کھڈ میں ہیں......''

ناگن بہن کے سمجھانے پر مجھے احساس ہوا کہ کتوں کی مشترکہ آوازیں اس قدر دہشتناک کیوں ہیں۔

جو کچھ بھی تھا' بہرام کی چیخوں اور فریادوں کی پرواہ کئے بغیر میں نے اسے دروازے سے اندر والے کھڈ میں گرا دیا۔ چند ہی لمحوں بعد میں کتوں کی غراہٹوں میں تیزی اور بہرام کی کربناک چیخوں کی آوازیں سن کر میں سکتے کی سی کیفیت میں مبتلا ہو گیا۔

ناگن بہن پھر غائب ہو چکی تھی۔ اب جو کچھ بھی کرنا تھا مجھ ہی کو بغیر رہنمائی کے کرنا تھا۔

میں نے کتوں کے کھڈ والا دروازہ بند کر دیا اور بالمقابل دروازے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ایک ایک کر کے میں سارے کمرے دیکھ لینا چاہتا تھا۔

ایک اور خلش بھی مجھے بے چین کئے ہوئے تھی' وہ یہ کہ جب کسی انسان کو بھوکے

کتوں کے کھڈ میں پھینکا جاتا ہوگا تو اس مظلوم کی ادھڑی ہوئی لاش کو کھڈ سے کس طرح نکالا جاتا ہوگا اور کون سے خفیہ راستے سے نکال کر وہ لاشیں کھیتوں میں پھینکی جاتی ہوں گی۔

انہی خیالات میں الجھا ہوا میں بالمقابل بند دروازے کے قریب پہنچا کواڑ پر ہلکا سا دباؤ ڈالا ہی تھا کہ دروازہ کھل گیا۔ یہ بھی کافی لمبا چوڑا کمرہ تھا اور اس کمرے میں صرف تپائیاں ہی تپائیاں رکھی تھیں اور تپائی پر ڈھیر سارے طلائی زیورات رکھے تھے میرا اندازہ تھا کہ اس وقت یعنی سن انیس سو چھیالیس میں بھی ان زیورات کی مالیت کروڑوں روپے رہی ہوگی۔ یقیناً یہ تمام زیوارت ڈاکہ زنی اور لوٹ مار سے حاصل کئے گئے ہوں گے۔ میں نے دروازہ بند کر دیا اور دوسرے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ اس طرح یکے بعد دیگرے تمام کمرے دیکھ ڈالے اور مجھے میری تمام منقولہ و غیر منقولہ جائیداد کے کاغذات مل گئے۔ وہ اسٹیمپ پیپر بھی پا لینے میں کامیاب ہو گیا' جو میرے ابا سے بلیک میلنگ کے ذریعے لکھوائے گئے تھے۔

ابھی میں کسی حتمی فیصلے پر بھی نہیں پہنچا تھا کہ اچانک میری سماعت سے کسی مرد کے چلانے کی آواز ٹکرائی۔ میں بری طرح چونک پڑا اس لئے کہ یہ آواز میری جانی پہچانی تھی۔

میں نے کمرے سے نکلنے کی حماقت نہیں کی اور جلدی سے دروازہ بند کر کے کھڑکی کے قریب دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ احتیاطاً میں نے کھڑکی کا پردہ برابر کر دیا تھا۔

چند لمحے ہی گزرنے پائے تھے کہ میں نے قدموں کے دھماکے سنے پھر' پھٹے ہوئے پردے کی اوٹ سے میں نے دو افراد کی صرف جھلک دیکھی۔

آگے آگے دادن خان چیک پوسٹ کا پولیس افسر البرٹ ہیکل تھا اور اس کے پیچھے چوہدری عبدالسلام ریوالور تانے ہوئے تھا۔ آوازیں مجھے اس طرح سنائی دے رہی تھیں جیسے میرے قریب ہی کوئی بول رہا ہو۔

البرٹ ہیکل عبدالسلام کو انگریزی میں خوفناک نتائج کی دھمکی دے رہا تھا اور عبدالسلام اس سے اس کی آزادی کے عوض تمام ثبوت اور شخصی بیانات کا اصل فائل

طلب کر رہا تھا۔

جونہی وہ میرے کمرے کے دروازے سے گزرے میں ہر ممکن احتیاط کا مظاہرہ کرتے ہوئے دروازے کے قریب پہنچ گیا اور یہ دیکھ کر مطمئن ہو گیا کہ عبدالسلام نے البرٹ کو اسی کمرے میں دھکیل دیا ہے جس میں پہلے سے فرحہ کی گردن کٹ لاش پڑی تھی۔ پھر یہ دیکھ کر میں فوراً ہی محتاط ہو گیا کہ عبدالسلام دروازہ لاک کرنے کے بعد میرے ہی کمرے کی طرف بڑھ رہا ہے۔۔وہ اپنا ریوالور ہولسٹر میں رکھ چکا تھا۔

میں نے سانس روک لی اور دیوار سے پیٹھ ٹکا کر کھڑا ہو گیا۔ دھب دھب قدموں کی آوازیں میرے دماغ پر دھماکے سے کرتی رہیں چند ہی لمحے گزرنے پائے تھے کہ دروازہ کھل گیا۔ جیسے ہی کواڑ میرے قریب ہوا میں نے دونوں ہاتھوں کے زبردست جھٹکے سے کواڑ بند کر دیا۔

کھٹاک کی آواز ہوئی اور عبدالسلام غراتا رہا گیا۔ اس کے چہرے اور پیشانی پر زبردست چوٹ آئی تھی۔ ایک لمحہ کی تاخیر کے بغیر میں نے اپنے چرمی شوز سے خنجر کھینچ لیا اور عقاب کی طرح جھپٹا مار کر عبدالسلام کے گلے پر پھیر دیا وہ خرخرایا۔ پولیس کی وردی ہی پہنے ہوئے تھا اور خرخراتے ہوئے شدید حیرت سے مجھے تک رہا تھا۔ اس کے نرخرے سے بے تحاشہ خون بہنے لگا تھا۔

ایک لمحہ کی تاخیر کے بغیر میں نے اس کے ریوالور پر قبضہ کر لیا اور اس کے سینے پر ایک زبردست پیر کی ٹھوکر رسید کر دی۔

وہ لڑکھڑا ہی رہا تھا کہ میری ٹھوکر نے اسے زمین چاٹنے پر مجبور کر دیا۔

''ویرا......'' اپنی پشت سے ناگن بہن کی آواز سن کر میں چونکے بغیر امڑا۔

''اندر آجاؤ اور دروازہ بند کر کے چٹخنی لگا دو......''

ناگن بہن کا جملہ مکمل ہونے تک میں نے اس کے حکم کی تعمیل کر دی لیکن میں یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ ناگن بہن نے کُنڈی کیوں لگوائی ہے۔

جلد ہی وجہ بھی سمجھ میں آگئی۔ میں نے راہداری کے سناٹے میں بھیانک ترین

غرّاہٹوں کی آوازیں سن لیں۔ یوں لگا جیسے کئی بھیڑ یئے راہداری میں جمع ہو گئے ہوں۔

میں ہمت کر کے کھڑکی تک پہنچا اور پردہ ہٹا کر جیسے ہی راہداری میں جھانکا' میرا دل یکبارگی اچھل کر میرے حلق میں آ اٹکا۔

وجہ بھی معقول تھی' چار کتے' جن کی جسامت بھیڑ یئے سے بھی بڑی تھی' چوہدری عبدالسلام کی لاش کو بھنبھوڑ رہے تھے اور چار بڑے کتے میری کھڑکی کے سامنے والی دیوار سے پنجے گاڑے چپکے ہوئے میری ہی طرف تک رہے تھے۔

فرط خوف سے میرے جسم کا لہو سمٹ کر میرے چہرے پر آ جما' مگر صرف ایک لمحہ کے لئے اسی ایک لمحے میں میرا ذہن از خود جاگ اٹھا' میرے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں لوٹ آئیں۔ پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ کتے زمین سے چند فٹ اوپر چھلانگ تو لگا سکتے ہیں' دیوار سے چپکے نہیں رہ سکتے' پھر یہ کہ یہ آٹھوں کتے اتنی گہری کھڈ سے کیسے نکل سکتے ہیں۔ سوئم یہ ناگن بہن کمرے میں موجود ہونے کے باوجود غائب کیوں ہو گئی ہے۔

ابھی میں کسی ایک سوال کا جواب بھی سوچنے نہیں پایا تھا کہ اچانک' دیوار سے چپکے ہوئے چاروں کتوں نے تہ خانے کے درو دیوار کو لرزا دینے والی آواز میں غراتے ہوئے چھلانگیں لگا دیں۔ دو کتے گدھ کی طرح اڑتے ہوئے دروازے پر اور دو میری کھڑکی کی طرف جھپٹے۔ ان کی چھلانگیں اس قدر خوفناک تھیں کہ میں غیر ارادی طور پر اکڑوں بیٹھ گیا۔

اگر حفظ ماتقدم کے طور پر میں فوراً ہی بیٹھ نہ جاتا تو کھڑکی کی جانب سے چھلانگ لگانے والے کتوں کے خوفناک دانت میرے نرخرے میں پیوست ہو چکے ہوتے۔

تعجب خیز بات یہ تھی کہ کتے گوشت پوست کا جسم رکھتے تھے' جب کہ کھڑکی میں موٹی آہنی سلاخیں لگی ہوئی تھیں' ان حالات میں وہ مجھ پر کس طرح قابض ہو سکتے تھے' کمرے میں کس طرح داخل ہوئے ان سوالات کے جوابات کے لئے میں ذہنی طور پر بالکل تیار تھا۔ وہ یہ کہ کتوں کے جسم پر آتشی مخلوق کے چند شر غالب ہو چکے تھے اور وہ ہر قسم کی رکاوٹ سے بھاپ بن کر پار ہونے پر قادر تھے۔

پورا کمرہ دو اور دو چار کتوں کی ہیبت ناک غراہٹوں سے جھنجھنے کی طرح گونج رہا تھا۔ چار اس لئے کہ دو کتے بند دروازے سے بھاپ بن کر اندر آئے تھے۔ جیسا کہ میں خطرات سے کھیلنے کا عادی ہو چکا تھا اس لئے ہر غیر متوقع حالات انسان ہونے کے ناطے مجھے وقتی طور پر تو خوف زدہ کر دیتے مگر غلبہ نہیں پا سکتے تھے۔ لہٰذا اس سے پہلے کہ حالات میرے لئے مزید خطرناک ثابت ہو جاتے یا بقیہ چار کتے جو چوہدری عبدالسلام کی لاش کو نوچ رہے تھے، کمرے میں داخل ہو جاتے، میں نے کوڑے پر گرفت مضبوط کر لی اور اکڑوں بیٹھے ہی بیٹھے برقی تیزی سے لٹو کی طرح گھومنا شروع کر دیا۔

اب کمرے میں کتوں کی لرزہ خیز غراہٹوں میں میرے کوڑے کے زناٹے بھی شامل ہو چکے تھے۔

عجیب سچویشن تھی، کتے پرندوں کی طرح اڑ اڑ کر مجھ پر حملہ آور ہوتے رہے اور میرے کوڑے کی لمبی زبان شڑاپ شڑاپ سے گونجتی رہی۔ چھپاک سے کوڑے کی ضرب ایک کتے کی پیٹھ پر پڑی اور پیٹھ سے پھسل کر دوسرے کی گردن سے لپٹ گئی۔

ایک طرح کی قیامت سی مچ گئی۔ دونوں کتے زمین پر اس زوردار دھماکے سے گرے کہ زمین کانپ اٹھی۔ وہ چھت کی طرف منہ اٹھائے رونے لگے۔ ان کی زبانیں لٹک گئیں، زبان اور ہونٹوں کے گوشوں سے کریہہ رال کے ساتھ جھاگ بھی بہنے لگی تھی۔ مگر میری تمام تر توجہ بقیہ دو حملہ آور کتوں کی طرف مرکوز رہی جو میرے لہراتے ہوئے ہنٹر سے بچنے کی کوشش میں کبھی دیواروں سے ٹکرا جاتے اور کبھی کمرے میں رکھے ہوئے کاٹھ کباڑ سے۔

بالآخر ان کے جسم سے میرا ہنٹر بڑی زور سے ٹکرا گیا اور وہ بھی سماعت شکن بلبلاہٹوں کے درمیان زمین پر گر کر جل مچھلی کی طرح تڑپتے رہ گئے۔

ایک لمحہ کی تاخیر کے بغیر میں اٹھ کھڑا ہوا۔ مسلسل جدوجہد کے باعث میری سانس پھول چکی تھی اور جسم سے پسینے کے سوتے سے پھوٹ پڑے تھے تاہم میرے عزم و حوصلے میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ میں نے فوراً ہی کنڈی ہٹائی اور کواڑ کھول دیا اور راہداری کا منظر

دیکھتے ہی میرا کلیجہ منہ کو آگیا۔

چوہدری عبدالسلام کا یونیفارم چیتھڑوں میں بدل چکا تھا اور اس کے پورے جسم کا گوشت خونخوار آسیبی کتوں کے پیٹ میں جا چکا تھا۔ چاروں کتے چھت کی طرف منہ اٹھائے ایسی دہشت ناک آواز میں رو رہے تھے کہ میرا دماغ' میرے کانوں کے پردے پھٹتے محسوس ہوئے۔ وہ لڑکھڑا رہے تھے اور جھوم رہے تھے۔ ان ہی کے قریب میری ناگن بہن بھی کھڑی تھی۔ فرط غضب کے ایسے بھیانک کن انداز میں کہ میرا رواں رواں کانپ اٹھا۔ کم از کم اس سے قبل میں نے ناگن بہن کا یہ خوفناک روپ نہیں دیکھا تھا۔

''سوچو مت ویرا......'' ناگن بہن کی پھنکارتی آواز نے میرے ڈوبتے ذہن کو ابھار دیا۔

''میرے ڈسنے سے صرف چاروں کتے زہر آلود ہوئے ہیں' ان کے قلوب میں سمائے ہوئے آتشی مخلوق کے شیطان صرف متاثر ہوئے ہیں۔ اس سے پہلے کہ وہ مرتے کتوں کے قالب سے باہر نکلیں' انہیں اپنے کوڑے سے کتے ہی کی طرح مار ڈالو......''

ناگن بہن کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی میرا ہاتھ بجلی کی سی تیزی سے حرکت میں آ گیا۔ ایک لمحہ کے نصف حصے میں میرے کوڑے نے چاروں کتوں کی چمڑی ادھیڑ کر رکھ دی۔ چاروں ہی کتے زمین پر گرے اور لوٹ پوٹ ہونے لگے۔

''ویرا......'' ناگن بہن نارمل ہوتے ہوئے بولی۔ اس کا سینہ اب بھی زیروبم کی کیفیت میں تھا۔ ''مقتولہ فرح والے کمرے کی طرف چلو' البرٹ ہیکل کو تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔''

ناگن بہن کے توجہ دلانے پر میرے قدم اسی طرف اٹھ گئے۔ قریب پہنچ کر میں نے عبدالسلام کے ریوالور سے تالے پر گولی چلا دی گو کہ بند خانے میں فائر کی آواز نے ہر شے پر لرزہ طاری کر دیا تھا تاہم تالا ٹوٹ گیا۔

چند لمحوں بعد جب میں اندر داخل ہوا تو البرٹ ہیکل بستر پر اوندھے منہ بے سدھ پڑا ہوا تھا۔

میں گھبرا کر آگے بڑھا اور اس کی کلائی تھام کر نبض پر انگلی رکھ دی اور پھر لبوں سے

اطمینان کی سانس خارج کرتے ہوئے میں تیزی سے کونے میں گھڑونچی پر رکھے ہوئے مٹکے کی طرف بڑھ گیا۔

☆☆☆

دس منٹ کی محنت کے بعد البرٹ ہیکل مکمل طور پر ہوش میں آ گیا۔ مجھے اور ناگن بہن کو سامنے پاکر اس کے چہرے پر چھائی ہوئی خوف کی زردی سرخی میں بدل گئی۔

ہم تینوں اس قدر اطمینان سے پلنگ پر بیٹھے تھے جیسے خوفناک تہ خانے میں نہیں بلکہ اپنے گھر میں بیٹھے ہیں۔

میرے متعدد سوالات کے جواب میں ہیکل نے مجھے بتایا کہ ''میں چیک پوسٹ کی بالائی منزل والے آفس میں بیٹھا ہوا ماضی' حال اور مستقبل کا ریکارڈ مرتب کر رہا تھا کہ عبدالسلام پہنچ گیا۔ اسے دیکھ کر میں نے تمام ریکارڈ جو میں ترتیب دے چکا تھا' آہنی الماری میں محفوظ کر لیا۔

میرے استفسار پر اس نے بتلایا کہ اس کی بیوی جنگلی جھاڑیوں میں بے ہوش پڑی ہے اور اس کے قریب وصی الدین کی منہ بولی بہن بھی بے سدھ پڑی ہے۔

میں آپ کی بہن کے حوالے پر بن سوچے سمجھے عبدالسلام کے ساتھ اسی کی جیپ میں بیٹھ گیا اور اپنے نائٹ ڈیوٹی عملے کو ضروری ہدایات دے کر عبدالسلام کے ساتھ چل دیا۔

تھوڑی ہی دیر میں جیپ درختوں اور قد آدم جھاڑیوں کے درمیان بہت ہی چھوٹے سے میدان میں پہنچ کر رک گئی اور پھر اچانک اس نے اپنے ریوالور کی نال میری گردن سے لگا کر میرا ریوالور میرے ہولسٹر سے نکال لیا اور گولیاں چیمبر سے نکال کر ریوالور جھاڑیوں میں پھینک دیا۔

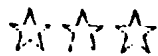
اس کے بعد اس نے مجھے حکم دیا کہ جھاڑیوں کے کنارے پڑی ہوئی سل کو گھماؤں۔ میں نے سل گھمادی تو سپاٹ زمین میں ایک جگہ خندق نما گڑھا پڑ گیا۔ وہ گڑھا اصل میں زیر زمین زینوں کا ابتدائیہ تھا۔ جب میں ریوالور کے ٹارگٹ پر آخری زینے پر پہنچا تو اوپر والی خلا خود بخود بند ہو گئی۔ چوہدری عبدالسلام نے مجھے بتایا کہ یہ زیر زمین دنیا چوہدری

نظام نے بنوائی تھی اور انجینئر سمیت اس کے آٹھوں ماتحتوں کو قتل کروا کر تہ خانے ہی میں دفن کروادیا تھا تاکہ تہ خانے کا راز راز رہے۔"

میرے لئے البرٹ کی یہ اطلاع حیران کن ہی ثابت ہوئی تھی اس لئے کہ میں تو سدرہ کی نشاندہی پر حویلی والے سرسبز صحن کے حوض والے خفیہ راستے سے زیرزمین پہنچا تھا جب کہ اس کا دوسرا راستہ بھی تھا جو ویرانے سے متعلق تھا اور شاید اسی راستے سے ادھڑی ہوئی لاشیں کھیتوں وغیرہ میں پھینکی جاتی رہی تھیں۔

نصف شب کے ساڑھے تین بجے ہم ویرانے والے راستے ہی سے تہ خانوں سے باہر نکل آئے تھے۔ البرٹ ہیکل نے فرح' عبدالسلام اور کتوں وغیرہ کی لاشوں یا ڈھانچوں کے متعلق مجھ سے رائے طلب کی تھی لیکن میں نے اسے فی الوقت خاموشی اختیار کرنے کی ہدایت کر دی ساتھ ہی اسے مصروف بھی کر دیا کہ چکوال اور بھلا کریالہ گاؤں سے چودہ سیدن شاہ تک کی پولیس چوکیوں سے معلومات حاصل کریں کہ کن کن لوگوں کے گھروں میں ڈاکے پڑتے رہے تھے اور نقدو جنس کی صورت میں کیا کچھ لوٹ چکے تھے۔

اسی کے ساتھ البرٹ ہیکل کو یہ ہدایات بھی دیں کہ وہ چوہدری نظام کی حویلی پر عبدالسلام اور بہرام خان کی گرفتاری کے لئے بار بار چھاپے مارے تاکہ چکوال سے چودہ سیدن شاہ تک کی آبادیوں کے باسی سکھ وسکون کا سانس لیں اور بے خوف ہو کر معمولات زندگی میں مصروف ہو جائیں۔



چار بجے سحر تک میں قصر چغتائی پہنچ گیا واپسی کے لئے میں نے متبادل راستہ اختیار کیا تھا۔ عبدالسلام کی جیپ جھاڑیوں کے درمیان ہی رہنے دی تھی البرٹ کو چیک پوسٹ والے راستے پر چھوڑ کر میں ناگن بہن کے ساتھ اپنی حویلی پہنچا تو سلطان بھائی نے گیٹ کھولا تھا۔

دوسرے' تیسرے اور چوتھے روز میں اپنی حویلی تک ہی محدود رہا تھا۔ پوری حویلی کی مرمت اور لیپا پوتی کا کام ختم ہو چکا تھا۔ پانچویں روز حویلی کی ڈیکوریشن کا تمام سامان بھی

پہنچ گیا۔ پرانا سامان میں نے حاجی چاچا اور دیگر غریب لوگوں میں بانٹ دیا تھا۔ پانچویں روز ہی چوہدری نظام کی حویلی سے میرا بلاوا آ گیا۔ دراصل بڑی چوہدرائن نے اپنے منشی کو میری طرف مدد کے لئے بھیجا تھا۔ مغرب کے بعد میں سلطان بھائی کو ساتھ لے کر نظام حویلی پہنچ گیا۔ گو کہ پوری حویلی جگمگا رہی تھی مگر ہر طرف ایک وحشت سی برستی محسوس ہوئی۔

مجھے اور سلطان بھائی کو حویلی کی ملازماؤں کے ذریعے زنان خانے ہی میں بلوا لیا گیا۔

بڑی چوہدرائن حالانکہ بوڑھی تھیں' ان کے سر کے سب ہی بال دودھ کی طرح سفید ہو چکے تھے تاہم ان کے سرخ و سفید چہرے پر جوان عورتوں کی سی تازگی تھی۔ وہ طلائی زیورات پہنے تھیں اور چھت کے ساتھ جھولتے ہوئے بڑے 'کشادہ اور قیمتی جھولے میں گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھی تھیں۔ ان کے ساتھ چھ بچے بھی بیٹھے تھے جن کی عمریں پانچ سے بارہ برس کے درمیان تھیں۔

ان کے دائیں جانب شاندار صوفے پر چوہدری کی دونوں پری چہرہ بیٹیاں نوشابہ اور سدرہ بیٹھی تھیں۔ بائیں جانب کے دو صوفوں پر نظام کی چاروں حسین جوان اور سدا بہار چہروں والی بہوئیں بیٹھی تھیں۔ ان کے ہمراہ بھی چند بچے تھے جو دو سے چار برس کی عمریں رکھتے تھے۔

قالین پر آٹھ جوان و ادھیڑ عمر دیگر دیہاتی عورتیں بھی بیٹھی تھیں۔ وہ سب حسب مرتبہ دیہاتی لباس پہنے تھیں۔

مجھ پر اور سلطان بھائی پر نظریں پڑتے ہی نہ صرف یہ کہ تمام عورتیں اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"ماں صدقے۔ میرا پترا' سہڑاں پترا......" چوہدرائن والہانہ انداز میں کہتی ہوئی مجھ سے لپٹ پڑیں۔ سلطان بھائی کو بھی لپٹانے میں انہوں نے کوئی عار محسوس نہیں کی۔ ہم دونوں کو اس قدر عزت و محبت دی گئی کہ ہماری تمام جھجک دور ہو گئی۔

سدرہ مجھے اور نوشابہ سلطان بھائی کو شرمگیں نظروں سے تکتی رہیں اور جب ہماری

نظریں ان کی نظروں سے ٹکراتیں تو ان کے چہروں پر قوس قزح کے رنگ بکھر جاتے تھے۔

آدھ گھنٹہ رسمی گفتگو کی نذر ہو گیا اور پھر چوہدرائن اصل موضوع پر آ گئیں۔

"وصی الدین پترا۔ اج تن دن گزر گئے نیں۔ عبدالسلام تے بہرام دا کوئی پتہ نہیں چل سکیا۔ پولیس تین دنوں میں کئی بار حویلی کے چکر لگا چکی ہے۔ پولیس کا موقف یہ ہے کہ سلامے اور بہرام کے خلاف کئی لوگوں کے اغواء اور قتل کے ثبوت مل چکے ہیں۔ دونوں ہی کی سرکاری ملازمتیں بھی ختم ہو چکی ہیں اس لئے ان کی گرفتاری یقینی ہے۔

وصی الدین پترا' میرے سینے میں ماں کا دل ہے صرف اپنے پیٹ کی اولاد ہی کے لئے نہیں دھڑکتا بلکہ پورا گاؤں میری اولاد ہے۔ میں مانتی ہوں کہ میرا شوہر' میرے بیٹے عزتوں کے دشمن' لالچی اور قاتل ہیں' یہی وجہ ہے کہ ارسلان' امام دین اور وڈے چوہدری کی اموات نے مجھے کوئی دکھ نہیں پہنچایا۔ میری بیٹیوں اور بہوؤں کو بھی ان کی موت کا کوئی غم نہیں ہے۔ سلامے اور بہرام کی گرفتاری یا پھانسی چڑھ جانے کا بھی ہمیں غم نہیں۔ غم ہے تو صرف دو جوان بیٹیوں اور چار بہوؤں کی عزت' شرافت اور عصمت کا۔

جس ڈیوڑھی پر انگریز' زمیندار اور وڈے وڈے افسران اپنا ماتھا ٹیکتے تھے' آج اسی حویلی کی عزت و عظمت کی آخری رات ہے۔ میں نہیں جانتی کہ سلامے اور بہرام کہاں ہیں' زندہ بھی ہیں یا کتے کی موت مر چکے ہیں۔

البرٹ ہیکل نے صرف صبح تک کی چھوٹ دی ہے اس کے بعد وہ اس حویلی پر ریڈ کرے گا' عورتوں کو گرفتار کرے گا اور بچوں کے ذہنوں پر وہی اثرات مرتب کرے گا جو ان معصوموں کو اپنے باپ دادا کی طرح عزتوں کے سوداگر بنا دیں گی۔ میں نے ان معصوموں پر ان کے باپ دادا کا سایہ بھی پڑنے نہیں دیا۔

وصی الدین پترا تو بہت چھوٹا تھا' میں نے تیری ماں کو وعدہ دیا تھا کہ سدرہ تیری بہو بنے گی۔

وہ وقت آ گیا ہے پترا' گھر میں کوئی مرد نہیں ہے' منشی وغیرہ پر مجھے کوئی اعتماد نہیں

بے۔ دانشن جا پترا ہماری لاج رکھ لے ان کڑیوں کا محافظ بن جا ان معصوموں کا......"

چوہدرائن نے اس کے الفاظ اس کی محبت نے مجھے بے چین کر کے رکھ دیا۔ میں فرط جذبات سے مغلوب ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"ماں جی، میں ایک التجا لے کر آیا ہوں ..... " میں نے پاس ادب کے باوجود جی کڑا کر کے کہا۔

"او ناں پترا التجا نہیں حکم کرو۔ تمہیں وارث بنا دیا ہے ان سب کا......"

"ماں جی۔ میں ...... میں اپنے سلطان بھرا کے لئے آپ سے نوشابہ کا ہاتھ مانگتا ہوں......"

"غلط پترا بالکل غلط......" چوہدرائن کے الفاظ نے نہ صرف مجھے نروس کر دیا بلکہ سلطان بھائی اور نوشابہ کی امیدوں پر بھی اوس پھیر دی۔ "تو مانگنے والی بات نہ کر جو مناسب سمجھتا ہے کر لے جا میں نے نوشابہ کے لئے سلطان کو خوشی سے قبول کر لیا۔ جملے کے آخری حصے نے سلطان بھائی کو بالخصوص شادی مرگ کی کیفیت میں مبتلا کر دیا تھا۔



"آپ ؟......" البرٹ ہیکل مجھے دیکھ کر چونک پڑا۔

یوں تو وہ میری بے انتہا عزت کرتا تھا لیکن اس کی جان بچا کر میں نے جو اس پر احسان کیا تھا' اس سے وہ میرا زر خرید غلام بن چکا تھا۔ "تشریف رکھئے آفیسر۔ میں ایک ضروری مسئلے کے سلسلے میں حاضر ہوا ہوں......" کہتے ہوئے میں کرسی پر بیٹھ گیا۔

سلطان بھائی کو میں نے راستے ہی میں ڈراپ کر دیا تھا اور جیپ ڈرائیو کرتے ہوئے داد ان خان چیک پوسٹ پر پہنچ گیا تھا۔

آٹھ بجے میں چیک پوسٹ پر پہنچا اور ایک گھنٹے تک البرٹ کو تمام پروگرام سمجھا کر نو بجے شب چیک پوسٹ سے روانہ ہوا۔

وہی ٹھنڈک' وہی اندھیرا اور وہی روایتی ویرانی پورے ماحول پر مسلط تھی۔ ابھی میری جیپ کھیتوں کے درمیان ہی تھی کہ ہیڈ لائٹس میں' میں نے چھ نفوس دیکھے۔ تین

عورتیں اور تین مرد جو میری طرف پیٹھ کئے راستہ روکے کھڑے تھے۔

حفظ ماتقدم کے طور پر میں نے ایک ہاتھ سے اسٹیئرنگ تھامے رکھا اور دوسرے ہاتھ سے کمر بیلٹ سے اڑسا ہوا خنجر کھینچ لیا اور ہارن پر دباؤ ڈال دیا۔ ہارن کی آواز کھلی فضا میں دور تک گونج کر رہ گئی۔

وہ چھ کے چھ میری طرف پلٹے اور روشنی میں ان کے چہرے دیکھ کر میرے لبوں سے اطمینان کی سانس نکل گئی۔

وہ گنزا تھی' صابرہ اور جمائمہ تھیں۔ دیجور تھا اور افراہیم و شرجیل تھے۔ ان کے لبوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی لیکن چہروں پر اداسی چھائی ہوئی تھی میں نے ان کے قریب ہی جیپ روک دی اور رسمی علیک سلیک کے بعد ایک دم سے غائب رہنے پر شکایت کی۔

''وصی الدین صاحب...... '' دیجور بولا۔ ''ہم جنات ہیں۔ آپ کے سائے کے ساتھ ساتھ تھے۔ آپ کے مکان کی مرمت مزدور بن کر کرتے رہے جب ہی تو پندرہ یوم کا کام ایک ہفتے میں مکمل ہوا ہے۔ نظام حویلی کے تہ خانے میں بھی ہم آپ کا سایہ بنے رہے تھے۔ ہماری وجہ ہی سے شیطان جنات کتوں کے وجود میں مخفی ہو گئے تھے۔ ہم آپ کی خود اعتمادی اور شیش ناگن کی ماورائی قوتوں کا امتحان لینے کے لئے آپ کی نظروں سے چھپے رہے مگر آپ کی ناگن بہن سے اپنے آپ کو محفوظ نہ رکھ سکے۔ آج بلکہ ابھی ہم آپ سے جدا ہو رہے ہیں۔ ہماری آپ کے ساتھ مدت ملازمت ختم ہو چکی ہے اب ہم تب آئیں گے جب آپ دولہا بنیں گے۔ جانے سے پہلے آپ پر ایک راز آشکار کر رہا ہوں۔

یہ جو گنزا ہے ناں' میری بیوی ہے اور ..... صابرہ شرجیل کی بیوی ہے جب کہ جمائمہ افراہیم کی بیوی ہے۔''

انکشاف ہوتے رہے اور میرے ذہن پر بجلیاں گرتی رہیں۔ ندامت کے باعث نظریں چراتا رہا۔

''اس خوش فہمی میں نہ رہیے گا کہ آتشی مخلوق سے تعلق رکھنے والے سب ہی شریر جنات اس گاؤں سے بھاگ گئے ہیں۔ اب وہ بھی چھوٹی سی تعداد میں جانوروں کے باڑوں

میں بسے ہوئے ہیں۔ ان ہی میں دو چار وہ بھی ہیں جو آپ کے دشمن ہیں۔

مجھے یقین ہے کہ آپ شیش ناگن کی مدد سے انہیں بھی مٹا دیں گے۔ آپ کو مستقبل کی خوشیاں مبارک ہوں۔ الوداع .... ''آخری الفاظ کے ساتھ ہی چھ تجلی کے کڑامے ہوئے اور وہ آسماں کی بیکراں وسعتوں میں غائب ہو گئے۔

☆☆☆

میں جیپ ڈرائیو کرتے ہوئے گنزا وغیرہ کے متعلق سوچ رہا تھا۔ ان ہی سوچوں میں غلطاں و پیچاں میں قصر چغتائی پہنچ گیا۔

دوسرے روز صبح ہی صبح میں نظام حویلی پہنچ گیا۔ میرے ساتھ سلطان بھائی' ناگن بہن اور میری دونوں چھوٹی بہنیں بھی تھیں۔

بے پناہ عزت و پیار ملا ہمیں۔ سلطان بھائی کو میں نے بیٹھک ہی میں البرٹ ہیکل کے انتظار میں بٹھا دیا تھا۔

حسب پروگرام البرٹ ہیکل پولیس کی بھاری نفری کے ساتھ دس بجے تک پہنچ گیا میں البرٹ کے پہنچ جانے کی اطلاع پر چوہدرانی وغیرہ کو تسلی دے کر نظام حویلی کی بڑی بیٹھک میں پہنچ گیا اور حسب پروگرام جھاڑیوں کے درمیان پارک کی ہوئی جیپ پولیس نے تحویل میں لے لی۔

جب ہم چور راستے سے تہ خانے میں داخل ہوئے تو تہ خانے کا ذرہ ذرہ بدبو میں رچا بسا ہوا تھا۔ بدبو ایسی جان لیوا ثابت ہو رہی تھی کہ ہم سانس نہیں لے پا رہے تھے۔ یہ تو البرٹ نے عقلمندی کی کہ خالص فنائل کی بھری ہوئی ہلکی مشینیں چھ سپاہیوں کی پیٹھ سے اڑسوا دی تھیں۔

چار کانسٹیبل پیٹرومیکس لیمپ تھامے ہوئے تھے۔ ان لیمپوں کی سائیں سائیں کرتی روشنی نہ ہوتی تو ہم تہ خانے کے پرہول اندھیرے میں کچھ بھی حاصل نہ کر پاتے۔

تین گھنٹے کے آپریشن کے بعد تہ خانے کے ہر کمرے سے ہر قسم کا سامان اٹھا کر نظام حویلی کے سرسبز صحن میں ترتیب سے سجا دیا گیا۔ گو کہ انسانوں اور کتوں کی لاشوں کو فنائل

اسپرے سے نہلا دیا گیا تھا اس کے باوجود لاشوں سے اٹھنے والا تعفن ناقابل برداشت تھا۔ توں کی پھولی اور پگھلی ہوئی لاشوں کو جھاڑیوں کے درمیان ہی کی زمین میں گڑھا کھود کر دفن کر دیا گیا تھا۔

تہ خانے سے حاصل ہونے والی ہر شے کی فہرست بنالی گئی تھی اور تمام چیک پوسٹوں سے ماضی کی ڈکیتیوں کا پورا ریکارڈ بھی حاصل کر لیا گیا تھا۔

نہ بھی کیا جاتا تب بھی تہ خانے سے ایک ایسا رجسٹر بھی مل چکا تھا جس میں چوہدری عبدالسلام کی تحریر میں پورے اندراج موجود تھے۔ ان اندراج سے بخوبی پتہ چل جاتا کہ کس کس گاؤں سے کس کس گھر سے کتنی کتنی رقم اور کیا کیا زیورات لوٹے گئے تھے۔ کن کن لوگوں کے مویشی ہانکے گئے اور کن کن لوگوں نے کتنی رقم کی ادائیگی پر چوری کے مویشی خریدے۔

چوہدری نظام اور اس کے چاروں بیٹوں نے کن کن زمینداروں ساہوکاروں اور سیٹھوں کو کس طرح بلیک میل کر کے ان کی جائدادوں پر قبضہ کیا تھا ان جائدادوں کے اصل دستاویزات بھی برآمد کر لئے گئے۔ بالخصوص چکوال کے بڑے تاجر ملک صفدر حسین کے چوکیدار دینو چاچا کی بے گناہ موت نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ میں نے البرٹ ہیکل کو تاکید کی کہ دینو چاچا کے پسماندان کو اس قدر مالی امداد سے نواز دے کہ وہ خوش حال ہو جائیں۔ میں نے ان تمام حقیقتوں سے چوہدرائن کو آگاہ کر دیا اور یہ بھی بتلایا کہ اس کے دونوں بیٹے بھی ایاز حسین کمپاؤنڈر کی بہن فرح کو بے عزت کر کے مار چکے ہیں اور خود بھی عبرتناک انجام کو پہنچ چکے ہیں۔

چوہدرائن نے کسی رد عمل کا اظہار نہیں کیا بلکہ مجھ سے درخواست کی کہ اس کے دونوں بیٹوں کو دفنانے کے بعد حویلی کے نیچے تہ خانے کو پاٹ دیا جائے پولیس کی یہ تمام کارروائی گاؤں کے سینکڑوں لوگوں نے دیکھی اور سنی اور چوہدریوں کے ظلم و ستم پر ہاتھ اٹھا اٹھا کر انہیں بد دعائیں دیتے رہے۔ دو بجے تک پولیس بمعہ مال اسباب کے روانہ ہو گئی۔ چار بجے تک میں نے گاؤں والوں کے ساتھ مل کر دونوں چوہدریوں کی لاشیں دفنا

دیں۔ اس کے بعد چوہدرائن کے بے حد اصرار پر کھانا کھا کر اپنی تینوں بہوں اور سلطان بھائی کے ہمراہ اپنی حویلی کی طرف روانہ ہو گیا۔

:::::::

ایک ہفتہ مزید گزر گیا۔ اس ایک ہفتے کے اندر کوئی قابل ذکر واقعہ میرے ساتھ پیش نہیں آیا۔

چونکہ میری حویلی میں میلے کا سماں بندھ گیا تھا۔ میری خالہ اپنے بچوں سمیت اور میری پھوپھی اپنے بچوں سمیت میری حویلی میں پہنچ گئی تھیں۔ اس لئے ہمہ تن خوش رہنے کے باعث میں ماضی کے تلخ تجربات اور مستقبل کے پیش آئندہ حالات کو یکسر فراموش کر گیا۔ اکثر سدرہ سے میری ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ چوہدری نظام کی بہوئیں اور پوتی پوتیاں مجھ سے اور میری بہوں سے اس قدر مانوس ہو گئے کہ میں بلا روک ٹوک ہر وقت نظام حویلی میں جاتا رہا۔ میں نے نرینہ بچوں کو چکوال کے ایک مشنری اسکول میں داخل بھی کروا دیا تھا اور ان کی آمد و رفت کے لئے ایک جیپ اور ایماندار ڈرائیور کا انتظام بھی کر دیا تھا۔

آٹھویں روز مغرب کے بعد میں بلا وجہ ہی یک و تنہا گاؤں کی بارونق گلیوں کی سیر کو نکل کھڑا ہوا۔ میرے گاؤں کی رونقیں بے پناہ سردی کے باوجود عروج پر پہنچ چکی تھیں۔ دکانیں نو بجے تک کھلی رہنے لگیں۔ ہوٹلیں اور قہوہ خانے رات کے بارہ بارہ بجے تک کھلے رہتے اور گاؤں والے چھوٹی بڑی محفلوں میں مشغول رہتے۔

آباد و بارونق گلیوں میں گھوم پھر لینے کے بعد میں کھیتوں کے درمیان اس سنسان راہ گزر پر پہنچ گیا جس کا اختتام میرے ہی محلے میں ہوتا تھا ٹھنڈ اپنے پوری عروج پر تھی۔ حالانکہ میں گاؤں کی ٹھنڈک کا عادی ہو چکا تھا اس کے باوجود میں نے اپنے اوور کوٹ کے کالر کھڑے کر لئے تھے ہاتھوں پر چرمی دستانے بھی چڑھے ہوئے تھے اس کے باوجود سردی میرے جسم میں چوکے سے لگا رہی تھی۔

اندھیرے کا یہ عالم تھا کہ پگڈنڈیں بھی محض سائے کی مانند نظر آنے لگی تھیں۔ تنہے

یوں محسوس ہوا جیسے میں انسانوں کی بستی میں نہیں بلکہ ایک سنسان و ویران علاقے میں ہوں حالانکہ میرے بائیں جانب کچھ فاصلے پر گاؤں کے مکانات کی روشنیاں جگنوؤں کی مانند نظر آ رہی تھیں۔ میرے اطراف سے جھینگروں کی سیٹیاں اور درختوں پر بسیرا کئے پرندوں کی خوابناک آوازیں گونج رہی تھیں۔

تاحال زیادہ وقت بھی نہیں گزرا تھا۔ شب کے نو ہی بج رہے تھے اور میں تیز تیز قدموں سے اپنے محلے کی طرف بڑھ رہا تھا کہ اچانک میری پشت پر سدرہ کی رومانسی آواز ابھری۔

"وصی الدین......"

میں ٹھٹک کر مڑا۔ باوجود اندھیرے کے میں نے سدرہ کو اس کے حسن و جمال اور چال ڈھال سے پہچان لیا' لہٰذا میں فوراً ہی رک گیا۔

"وصی الدین۔ میں' میں بہت پریشانی کے عالم میں آئی ہوں......" وہ میرے قریب پہنچ کر گھبرائی ہوئی آواز میں بولی۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی اس کا نرم گداز سینہ لوہار کی دھونکنی بنا ہوا تھا۔

"کیا ہوا سدرہ کیوں پریشان ہو؟......" میں نے فوراً ہی سدرہ کو اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا اور موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کے گالوں کو چومنے لگا۔

"وڈی چوہدرائن بھی بہت پریشان ہے گی۔ بچے اجی تلک شہروں نہیں پہنچے نیں......"

"کیا؟......" میرے لبوں سے تحیر خیز آواز نکل گئی۔

"ہاں وصی۔ وہ زیادہ سے زیادہ دو بجے تک پہنچ جایا کرتے ہیں مگر آج اتنا وقت ہو جانے کے باوجود نہیں پہنچے ہیں......"

"یہ...... یہ کیسے ممکن ہے سدرہ؟ چلو...... میرے گھر چلو' جیپ لے لوں تو چیک پوسٹ چلتے ہیں......"

"نہیں وصی۔ میرے ساتھ چلو' چوہدرائن کو تسلی دو اور وہیں سے جیپ میں بیٹھ کر چلے جانا......"

بات سمجھ میں آنے والی تھی اس لئے میں سدرہ کے ساتھ چل دیا۔ اس وقت تسلی و تشفی کے جو جملے میں ادا کر سکتا تھا' کرتا رہا۔ اس سے یہ فرق ہوا کہ سدرہ مطمئن ہو گئی۔

میں نے اس دوران کئی بار اس کے ہونٹ چوم لئے تھے۔ وہ بھی مجھ سے لپٹی رہی۔

نتیجہ یہ ہوا کہ ہم دونوں ہی جذبات سے بے قابو ہو گئے اور ایک دوسرے سے اس طرح لپٹ گئے کہ تمام احتیاط کو ترک کرتے ہوئے میں نے اسے گود میں اٹھا لیا۔

ہماری سانس اکھڑ رہی تھی۔ شیطان پوری طرح ہمارے ذہنوں پر مسلط ہو چکا تھا۔

"وصی......" سدرہ شدت جذبات سے پھنکتی آواز میں بولی۔ "آج نہیں تو کل میں تمہاری ہو ہی جاؤں گی اس لئے کل کا انتظار کیوں کیا جائے؟ چلو' کھیتوں میں لے چلو مجھے اور...... میری آگ بجھا دو۔"

جیسا کہ میں بھی جذبات کے سمندر میں غوطہ زن ہو چکا تھا اس لئے سدرہ کے حکم کی تعمیل میں قد آدم کھیتوں میں داخل ہو گیا۔



میں نے جیسے ہی قد آدم کھیتوں کے درمیان نرم مٹی پر سدرہ کو ڈالا' باوجود بے پناہ اندھیرے کے میری نظریں پھن کاڑھے ناگ پر پڑیں۔

بے ساختہ میرا دل اچھل کر میرے حلق میں آ اٹکا۔ اس خدشے نے میرے تمام جذبات پر اوس ڈال دی کہ ناگ سدرہ کی پیشانی پر ڈنک مار دے گا۔ میں نے فی الفور اپنا ہاتھ ہولسٹر کی طرف بڑھا دیا۔ پھر یہ جان کر میرے جسم سے گویا جان ہی نکل گئی کہ ہولسٹر بمعہ ریوالور کے میرے گھر میں رکھا رہ گیا تھا۔

اس سے پہلے کہ میں کوئی دوسرا فوری قدم اٹھاتا' ناگ نے اپنے پھن کو اس طرح حرکت دی جیسے انکار میں گردن ہلا رہا ہو۔

میرے ذہن پر بڑی زور کا چھناکہ ہوا۔ میں فوراً ہی پہچان گیا کہ یہ ناگ نہیں بلکہ ناگن بہن ہے۔ مزید یقین کی وجہ میرا ہنٹر تھا جو گنے کی لمبی ٹہنی کے ساتھ لٹک رہا تھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں زیادہ وقت نہ لگا کہ میرا کوڑا ناگن بہن ہی لے کر مجھ سے پہلے پہنچ گئی ہے۔

اس دوران سدرہ نہ صرف لذت انگیز نے کاریاں بھرتی رہی بلکہ اس نے اپنا لاچہ بھی اٹھالیا تھا۔

اٹھایا ہی تھا کہ ایک بھیانک پھنکار کے ساتھ ناگن نے اس کی پیشانی پر ڈنک مار لیا اس نے ڈنک مارا اور میں نے عقاب کی طرح جھپٹا مار کر اپنا کوڑا اٹھالیا۔ اف...... ڈنک پڑتے ہی سدرہ کے لبوں سے ایک غیر انسانی اور طویل چیخ نکل گئی۔ بیک وقت دو تیز جھماکے ہوئے۔ پہلا جھماکہ سدرہ کی پیشانی سے ایسا ہوا جیسے اچانک ہی آسمانی برق چمک پڑی ہو۔

دوسرا جھماکہ دودھیائی دھویں کا تھا' دونوں جھماکوں کا اثر آن واحد میں ظاہر ہو گیا۔ یعنی یہ کہ سدرہ کی ہیئت بدل گئی۔ وہ سدرہ کی بجائے لمبے لمبے دانتوں اور گھنے گھنے مگر آگ کی طرح سلگتے بالوں والی ریچھنی بن گئی جب کہ ناگن کا روپ چھوڑ کر ناگن بھن عورت بن گئی۔

''ای...... ای...... عاہ'' کی خوفناک ترین چیخ کے ساتھ ریچھنی نے مجھے اپنی بانہوں میں دبوچنے کے لئے جیسے ہی جھپٹا مارا' میرا ہاتھ بجلی کی سی تیزی سے حرکت میں آگیا۔

شپاک سے میرا کوڑا ریچھنی کی کمر کے گرد لپٹ گیا۔ لپٹا ہی تھا کہ میں نے ایک زبردست جھٹکا دے کر ریچھنی کو ایک دھماکے سے گرا دیا۔ گرایا ہی تھا کہ اس نے اپنے لمبے لمبے ناخنوں والے دونوں ہاتھوں سے میرے پیروں کی طرف جھپٹا مارا مگر میں چھلاوے کی طرح اچھل کر ایک طرف ہٹ گیا ہٹتے ہٹتے بھی میں نے کوڑے کی ایک اور شدید ضرب اسے رسید کر دی تھی۔ اف...... اف۔ ہر چہار سمت سے ریچھوں کی دہشت ناک چنگھاڑیں گونجنے لگیں۔

حالانکہ چیخ صرف مغلوب ریچھنی کی تھی۔ وہ جل مچھلی کی طرح تڑپنے لگی اس کے ہاتھوں پیروں کی پٹخنیاں زمین کو دہلاتی رہیں اور اس کے پورے جسم سے لاوے کی طرح کا سلگتا ہوا سیال سا نکلنے لگا۔ وہ پگھلتی رہی اور اس کی آواز معدوم ہوتی گئی۔ ہوتی گئی اور ہوتی ہی گئی۔

ایک منٹ کے قلیل وقفے میں ریچھنی پوری کی پوری پگھل گئی۔ سناٹا چھا گیا'

اندھیرے مسلط ہو گئے اور میں لبوں سے سکون کی طویل سانس خارج کرتا رہ گیا۔

"ویرا......" ناگن بہن کی سرسراتی پھنکار میری سماعت سے ٹکرائی لیکن وہ خود مجھے کہیں بھی نظر نہ آئی۔ "ایک لمحہ کے لئے بھی غفلت نہ برتنا۔ بیک وقت دوہرا خطرہ تمہاری طرف بڑھ رہا ہے......"

☆☆☆

جیسا کہ مسلسل چند روز کی مصروفیات کے باعث میں نے اپنے ریوالور اور ہنٹر کو بالکل نظر انداز کر دیا تھا' کچھ اس قدر خوش فہمی میں مبتلا ہو گیا تھا کہ ماضی کے تمام واقعات محض دھندلکے سائے بن کر میرے تحت الشعور تک محدود ہو کر رہ گئے تھے۔ اگر ناگن بہن بھی میرے طرف سے غیر محتاط ہو جاتی تو آج آتشی مخلوق کا وجود میرے جسم میں داخل ہو کر میرے دل و دماغ پر قابض ہو چکا ہوتا۔

میں کھیتوں کے درمیان سے نکل کر دوبارہ اسی راہ گزر پر چل دیا جو میرے ہی محلے پر ختم ہو جاتی تھی۔

پانچ منٹ بعد میں نکڑ والی جھگی نما ہوٹل کے سامنے پہنچ گیا۔ یہاں تین چارپائیاں خالی تھیں' بقیہ دو چارپائیوں پر چند بوڑھے و جوان بیٹھے گرم گرم دودھ کے سپ بھر رہے تھے یہ واحد ہوٹل تھا جہاں زعفرانی دودھ کے علاوہ تازہ بتازہ چائے اور کافی بھی مل جاتی تھی۔ جھگی نما اس ہوٹل کے اندرونی حصے میں چند باکڑے بھی تھے جو فی الحال خالی تھے۔ صرف ایک باکڑے پر دو افراد بیٹھے ہوئے تانبے کے پیالوں میں دودھ پی رہے تھے۔

میں انہیں پہچان چکا تھا۔ یہ نمبردار رستم سنگھ اور اس کا بیٹا رمھیر سنگھ تھے۔

"لو جی سردار۔ وصی باؤ آ گئے نیں......" مجھ پر نظر پڑتے ہی ہوٹل کا مالک فضل محمود بول اٹھا۔

میرا نام سن کر یوں تو سب ہی لوگ سلام کرنے لگے مگر میں ان کے سلام کا جواب دے کر والہانہ انداز میں رستم سنگھ و رمھیر سنگھ کی طرف لپکا بڑی گرمجوشی سے ملاقات ہوئی۔ خیر خیریت کا تبادلہ ہوا اور میں شکایتی لہجے میں بولا۔

"چاچا جی۔ آپ کو تو میری بیٹھک میں ہونا چاہئے۔ یہاں کیوں بیٹھ گئے؟"

"اوہ ناں پترا۔ ابھی ابھی پہنچے ہیں۔ سوچا پہلاں گرم گرم دودھ پی کے تے پھیر اگے ودھانگے اب شکایتیں چھوڑو اور ہمارے ساتھ چیک پوسٹ تک چلو......" رستم سنگھ بولا۔

"کیا ہوا چاچا۔ چیک پوسٹ تک کیوں جانا ہے؟" میں کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں بولا۔

"او پترا تیری بہن کلپنا کو تیرے دوست ابرٹ ہیکل نے روک لیا ہے ہم تیرے ہی"

رستم سنگھ کے بقیہ الفاظ میں نہ سن سکا اس لئے کہ ایک خیال کے ذہن میں ابھرتے ہی میرے رگ و پے میں چیونٹیاں سی رینگ گئی تھیں۔ مجھے سب کچھ یاد آ گیا تھا یعنی یہ کہ رستم سنگھ یعنی کلپنا کے باپ کو تو چوہدری ارسلان نے قتل کر دیا تھا' پھر یہ رستم سنگھ کیسے زندہ ہو گیا۔

شاید نہیں بلکہ یقیناً رستم سنگھ نے میرا ذہن پڑھ لیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے ایک دم سے مجھے باکڑے سمیت اٹھا کر ہوٹل سے باہر پھینک دیا۔

یہ سب پلک جھپکنے کی دیر میں ہو گیا۔ فضل محمود اور دیگر لوگ اس انوکھی تبدیلی پر بری طرح گھبرا گئے اور پھر سنبھل کر پنجابی میں گالیاں بکتے ہوئے دونوں سکھوں کی طرف لپکے۔

قطع نظر اس کے میں غلیل سے نکلے ہوئے پتھر کی طرح ہوٹل کی روشن فضاء سے نکل کر بیرونی اندھیرے میں جا گرا۔

یہ تو بہتر ہوا کہ زمین نرم تھی۔ اس کے باوجود میرے جسم میں گویا انگارے سے دوڑ گئے تھے۔ باکڑے کے تو ٹکڑے ہو چکے تھے۔ شدید درد کے باوجود میں بندر کی طرح قلابازی لگا کر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اتنا ہی تھا کہ میں نے فضل محمود وغیرہ کو شدید خوف کے عالم میں کراہتے دیکھا ان میں سے کوئی ایک بھی دونوں حملہ آوروں کے قریب نہیں پہنچ

سکا تھا۔ وہ مبہوت کھڑے تھے۔

وجہ یہ تھی کہ رستم سنگھ اور رمھیر سنگھ کی ہیئت بدل چکی تھی۔ ان کے قد آٹھ فٹ سے زیادہ ہو چکے تھے ان کے جسم بالکل بلوری ہو گئے اور ان کے بلوری جسموں میں انگارے دوڑتے ہوئے نظر آئے۔ ان کے چہروں کے کوئی نقوش نہ تھے تاہم ان کے وجود سے ایسی آوازیں نکلنے لگیں جیسے ایک وقت کئی فوجی ٹرکوں کے انجن دھاڑ رہے ہوں۔

"پراں ہٹ جاؤ تسی......" میرے لبوں سے چنگھاڑتی آواز نکلی اور مبہوت کھڑے لوگ اس طرح چونک پڑے جیسے ڈراؤنا خواب دیکھ کر بیدار ہوئے ہوں۔

اچانک ہوٹل کے سب ہی باکڑے اور چارپائیاں از خود بلند ہونے لگے پھر اس سے پہلے کہ وہ باکڑے اور چارپائیاں مزید بلند ہوتے کہ اچانک ہی انسانی شبیہہ رکھنے والا ایک دودھیائی ہالہ ہوٹل میں تیزی سے لہراتا ہوا دونوں بلوری اور سلگتے ہوئے جسموں سے ٹکرا گیا۔ ٹکر لگتے ہی دونوں بلوری خشک پتے کی طرح لرزے اور ان کے وجود سے ایسی ہولناک سمجھ میں نہ آنے والی آواز نکلی کہ خوف وو حشت کا سماں بندھ گیا۔ اطراف کے درختوں پر گہری نیند پڑے پرندوں کے لئے بھونچال سا آگیا اور مکانوں کے دروازے' زمین اور درخت وغیرہ جھنجھنے کی طرح بجنے لگے۔

پلک جھپکنے کی دیر میں دونوں بلوری میری نظروں سے اوجھل ہو گئے جب کہ دودھیائی ہالہ بھی ہوٹل سے نکل کسی جانب اندھیرے میں غائب ہو گیا۔

ٹھیک اسی وقت چاروں طرف سے انسانی آوازیں اور دوڑتے قدموں کے دھماکے گونج اٹھے۔

ڈیڑھ دو سو مرد' عورتیں اور بچے' نیزے' کلہاڑیاں' تلواریں اور خنجر لئے میرے گرد جمع ہو گئے۔ ان میں ناگن بہن بالکل نمایاں تھی اور وہ بڑے ہی دلآویز انداز میں مسکرا رہی تھی۔

فضل محمود اور وہ لوگ جو ہوٹل میں موجود تھے' لوگوں کو پوری تفصیل بتلانے میں مصروف تھے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ وہ بد روحیں تھیں' بھوت تھے' چھلاوے تھے لیکن میں

ہی جانتا تھا کہ وہ کون تھے۔

وہ آتشی مخلوق سے تھے۔ جن تھے۔ وہی جن' جن کے متعلق گنزا وغیرہ نے مجھے خبردار کیا تھا۔ جو میرے ہی گھر پر قابض ہوئے تھے۔ ڈیڑھ دو بجے کہیں جا کر میں اپنے گھر پہنچا۔ میری دونوں بہنیں' خالہ زاد بہنیں' خالہ اور پھوپھی بھی شدید اضطراب میں مبتلا تھیں۔ مجھ پر سوالات کی بوچھاڑ سی کرتی رہیں۔ بالآخر ان کو بتلانا ہی پڑا کہ مجھ پر دو جنات حملہ آور ہو گئے تھے۔ لیکن چونکہ میری پشت پر بھی ایک زبردست ان دیکھی قوت موجود ہے جو چوبیس گھنٹے میری حفاظت کرتی رہتی ہے' اسی نے دونوں جنوں کو بھاگنے پر مجبور کر دیا تھا۔

اگر عورتوں کو میں حقیقت نہ بتلاتا تو وہ ایک لمحہ کو چین کی نیند نہ سو سکتیں اور مجھے پیروں' فقیروں اور تعویذوں گنڈوں کے چکر میں پھنسا دیتیں۔

باتوں ہی باتوں میں چارج گئے اور جب ہر ایک کے ذہن پر نیند کی دیوی غالب آگئی تو میں بھی اپنے کمرے میں جا کر لباس بدل کر لیٹ گیا۔ ویسے بھی مارے سردی کے میرے دانت بجنے لگے تھے۔

تنہائی اور یکسوئی ملتے ہی میرے دماغ پر چھائی ہوئی غنودگی بے چینی میں بدل گئی۔

میں سوچتا رہا اور میرا ذہن الجھتا رہا۔ پہلی تشویش یہ تھی کہ آتشی مخلوق کے کتنے شیطان ابھی زندہ ہیں' کہاں کہاں ہو سکتے ہیں اور کیا کیا روپ دھار کر مجھے زک پہنچانے کی کوشش کرتے رہیں گے۔

سب سے اہم یہ کہ دونوں بلوری جن فی الحال بھاگ گئے ہیں یا مر چکے ہیں" اور...... دودھیائی مجسمے کا روپ دھارنے والی میری ناگن بہن تھی یا...... یا وہ گنزا تھی؟

"نہیں ویرا......"

اپنے سرہانے کی جانب سے ناگن بہن کی آواز سن کر میں بری طرح چونک پڑا۔ "وہ گنزا نہیں بلکہ میں تھی۔" جملہ مکمل کرتے ہی ناگن بہن بے تکلفی سے میرے پلنگ پر بیٹھ گئی۔

"گنزاا اپنے شوہر اور ساتھیوں سمیت چودہ سیدن شاہ کے کبھی ویران جگے میں موجود ہے۔ ان کو تمہارے ساتھ جتنا رہنا تھا زہ لئے۔"

"آپا جی۔ آپ نے اچانک مداخلت کیوں کی جب کہ میں ان پر کوڑا برسانے والا تھا؟......" میں نے نیم خفگی سے کہا۔

"اوناں ویراناں' ناراض نہیں ہوا کرتے۔ ہماری اور انسانی سوچ میں یہی تو ایک فرق ہے۔ ہمیں جو موروثی شکتی یا ماورائی قوتیں ملی ہوئی ہیں اس سے ہم انسانی ذہن پڑھ لیتے ہیں۔ جیسے ابھی میں نے تمہاری سوچوں کو پڑھا ہے۔ پتہ ہے اگر میں فوری مداخلت نہ کرتی تو فضل محمود اور دیگر لوگوں کے جسموں کے پرخچے اڑ گئے ہوتے۔ حملہ آور جنات نے باکڑے اور چارپائیاں انہیں مارنے کے لئے بلند کی تھیں......"

"اوہ......" میرے لبوں سے پر تاسف آواز نکل گئی۔

"مگر آپا۔ کیا وہ دونوں زندہ ہیں؟"

"ہاں ویرا۔ میرے حملے سے وہ صرف زخمی ہوئے ہیں۔ بھاگ گئے ہیں۔ ان ہی میں سے ایک کی بہن سدرہ کا روپ بھر کر تم پر قابض ہونے پہنچی تھی' جسے میرے ڈنک اور تمہارے کوڑے کی ضرب نے مار ڈالا تھا......"

"تو آپا۔ میں کب تک جنات سے بھڑ تا رہوں گا؟......"

"اوہو۔ بڑی جلدی پڑی ہے تمہیں اپنی شادی کی بہر حال فکر نہ کرو بالآخر کامیابی تم ہی کی ہوگی۔

پہلے اپنی دونوں بہنوں کی رخصتی کر دو۔ اس کے ساتھ نوشابہ کی رخصتی کا بھی انتظام کر دو پھر تمہیں میں اپنے ہاتھ سے دولہا بناؤں گی۔"

☆☆☆

صبح دس بجے تک گذشتہ شب کے واقعات پورے گاؤں والوں میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئے۔ میری بیٹھک میں گاؤں والوں کی آمد و رفت کا تانتا سا بندھ گیا۔ لوگ آتے' میری خیریت دریافت کرتے اور دعائیں دیتے ہوئے چلے جاتے۔

نظام حویلی سے بھی تین مرتبہ لوگ مجھے بلانے کے لئے پہنچے تھے اور میں نے انہیں مطمئن کرنے کے بعد روانہ کر دیا تھا۔

نصف گھنٹے میں ناشتے سے فارغ ہو کر میں ناگن بہن کے ہمراہ حویلی کی طرف چل دیا۔

دھوپ نے پورے گاؤں کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا تھا۔ لوگ باگ اپنے اپنے کام میں مصروف ہو چکے تھے۔ زندگی اپنی تمام بے فکریوں کے ساتھ متحرک تھی۔

پندرہ منٹ بعد میں ناگن بہن سمیت نظام حویلی پہنچ گیا۔ بڑی چوہدرائن ممتا کے جذبات سے سرشار مجھ سے ملی۔ ذرا سی دیر میں انہوں نے بہت سارو پیہ میرے صدقے کے طور پر غرباء میں بانٹ دیا تھا۔ سدرہ کسی نہ کسی کھڑکی' دروازے اور چلمن سے مجھے دیکھتی رہی تھی۔ اس کے چہرے پر میں نے ایک بار بھی تشویش کے آثار نہ دیکھے بلکہ جب بھی ہماری نظریں چار ہوئیں اس نے دایاں ہاتھ اٹھا کر اپنی مٹھی بھینچ کر اس طرح ہاتھ کو جھٹکے دیئے تھے جیسے وہ مجھے بے خوف و مضبوط مقابلے کا حوصلہ دے رہی ہو۔ دوپہر کا کھانا میں نے نظام حویلی ہی میں کھایا اور پھر دو بجے کے قریب ناگن بہن کے ہمراہ سب سے رخصت ہو گیا۔

"ویرا......" راہ چلتے ہوئے ناگن بہن نے مجھے مخاطب کیا۔ "بہرام اور عبدالسلام کی بیویوں کے چہرے پر میں نے ایک عجیب سی مایوسی اور وحشت دیکھی ہے......"

"مایوسی تو سمجھ میں آتی ہے آپا۔ ظاہر ہے وہ جوانی ہی میں بیوہ ہو چکی ہیں لیکن وحشت والا معاملہ میری سمجھ میں نہیں آسکا۔" "سمجھ تو میں بھی نہیں سکی لیکن جلد ہی سمجھ جاؤں گی......" ناگن بہن مزید کچھ کہنا چاہتی تھی مگر سامنے ہی سے البرٹ ہیکل کو پولیس جیپ میں آتے دیکھ کر خاموش ہو گئی۔

جیپ میرے قریب ہی آ کر رک گئی تھی۔ البرٹ ہیکل کے چہرے پر محاورتاً ہی نہیں حقیقتاً ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اس کے منتشر الحواس ہونے کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا تھا کہ وہ علیک سلیک کے بغیر ہی مجھ سے لپٹ گیا۔ "میجر۔ آپ خیریت سے تو

ہیں ؟.....“

”ارے رے ..... رے۔ البرٹ صاحب میں بالکل خیریت سے ہوں کیا ہوا آپ کو اس قدر بوکھلائے ہوئے کیوں ہیں ؟.....“

میں اس کے خلوص سے متاثر ہوتے ہوئے بولا۔ ناگن بہن اس کی کیفیت پر مسلسل مسکرا رہی تھی۔

اس کے بعد البرٹ ہیکل نے وہی کچھ دوہرا دیا جو اسے توہم پرست یا پھر سادہ لوح دیہاتیوں سے معلوم ہوا تھا۔

”نہیں انسپکٹر‘ کوئی بدروح یا بھوت، نہیں تھے۔ یہ صرف گاؤں والوں کی ذہنی اختراع ہے بے چارے ڈاکوؤں اور چوروں کے ستائے ہوئے ہیں۔ گو کہ اب انہیں کسی قسم کا خوف نہیں ہے‘ برعکس اس کے وہ اس قدر نڈر اور دلیر ہو چکے ہیں کہ کلہاڑیاں اور نیزے لے کر گھروں سے نکل آتے ہیں اس کے باوجود ان کے تحت الشعور پر اب بھی پنڈت دھیراج اگھوری اور اس کی تابع بدروحوں کا ہلکا سا عکس موجود ہے۔

آپ خود ہی سوچئے کہ اگر وہ بھوت ہوتے تو بھاگتے کیوں۔ گاؤں والوں ہی سے لپٹ پڑتے ؟.....“

غرض یہ کہ میں نے کچھ ایسی ایسی مثالیں دیں کہ البرٹ وقتی طور پر قائل ہو گیا لیکن میں نے صاف محسوس کیا کہ وہ مطمئن نہیں ہوا۔

☆☆☆

میری دونوں بہنوں فوزیہ اور فرحین کی نہ صرف یہ کہ زمان خان اور فرحان سے نسبت طے ہو گئی بلکہ تین روز بعد منگنی کی رسم بھی ہو گئی۔

ساتھ ہی سلطان بھائی کی بھی نوشابہ سے منگنی ہو گئی۔ سلطان بھائی بہت خوش ہوئے‘ میرے خالو کمال الدین چغتائی اور خالہ بھی بے حد مسرور تھے۔

مزید تین روز بعد میری خالہ زاد بہنوں جبینہ اور ثمینہ کی رسم منگنی میرے پھوپھازاد بھائیوں علاؤالدین اور امیر جان کے ساتھ ہو گئی۔ میرے شب و روز بے انتہا مصروفیات

میں گزرتے رہے۔ میں اپنے گاؤں سے کبھی ڈھوک ٹالیاں کبھی بھلاکریالہ اور کبھی چکوال جاتا آتا رہا۔ ان تمام مصروفیات میں ناگن بہن مجھ سے ایک لمحہ کو جدا نہ ہوئی۔ میں جو کچھ بھی کر رہا تھا ناگن بہن کے مشوروں ہی پر۔

آٹھ دس روز بعد جب مجھے مکمل یکسوئی حاصل ہو گئی تو ایک شام میں اکیلا ہی نظام حویلی کی طرف روانہ ہو گیا۔

کافی دیر تک بیٹھے رہنے کے بعد جب میں نے بہرام کی بیوہ عظمت اور عبدالسلام کی بیوہ رفعت جہاں کی خیریت معلوم کی تو پتہ چلا کہ دونوں بیواؤں کی حالت بہت بگڑ چکی ہے انہوں نے کھانا پینا تک چھوڑ دیا ہے۔ جسمانی صفائی ستھرائی اور لباس سے بھی بیگانی ہو چکی ہیں۔ انہیں نوکروں کی مدد سے بالائی منزل پر انہی کے کمروں میں زنجیروں سے جکڑ دیا گیا ہے۔ زنجیروں سے اس لئے کہ وہ اپنے ہی بچوں کا گلا دبا کر انہیں مار ڈالنا چاہتی تھیں۔ ان پر دن رات میں اکثر دوڑے پڑتے تھے۔ ان کی آوازیں اس قدر ڈراونی ہو جاتی تھی جیسے پاگل بھینسیں ڈکارنے لگی ہوں۔ غرضیکہ ایسی ہولناک باتوں کا مجھے علم ہوا کہ میں شدید ذہنی کشمکش میں مبتلا ہو گیا۔

چوہدرائن نے بتلایا کہ دونوں بیواؤں کے والدین کو بھی اطلاع دی گئی تھی لیکن انہوں نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی کہ والدین کے گھر سے بیٹی کی ڈولی نکلتی ہے اور سسرال سے میت۔

انہوں نے یہ سب کچھ اس لئے کہا کہ وہ بھی بڑے زمیندار ہیں۔ ایسے زمیندار جو بیٹیوں کو پسند نہیں کرتے بلکہ انہیں ایک بوجھ سمجھتے ہیں۔ میں چوہدرائن سے اجازت لے کر چوہدری امام دین کی بیوی کشور جہاں کی رہنمائی میں بالائی منزل کی طرف چلا گیا۔

تیسرا بڑا کمرہ عظمت آراء کا تھا۔ ویسے بالائی منزل پر قدم رکھتے ہی مجھے اندازہ ہوا کہ برآمدے میں آخر تک ایک ایسی وحشت' اداسی اور ویرانی چھائی ہوئی ہے جسے صرف محسوس کیا جا سکتا ہے۔ پورا برآمدہ روشن تھا مگر روشنی پر بھی محسوساتی آسیبت چھائی ہوئی تھی۔

"بھائی جی ......" کشور جہاں میرا بازو تھامتے ہوئے بولی۔ میں نے صاف محسوس کیا کہ اس کا ہاتھ کانپ رہا ہے اور اس کی آواز میں شدید خوف ہے۔

"آپ ...... آپ اندر جائیں ......" وہ جملہ مکمل کر کے پیٹھ پھیر کر اس طرح بھاگی جیسے واقعی کسی بدروح کو دیکھ لیا ہو۔

میں نے لاپرواہی سے شانے اچکائے اور کواڑ پر ہاتھ کا ہلکا سا دباؤ ڈال کر اندر داخل ہو گیا۔

سامنے مخملی بستر پر عظمت آراء لیٹی ہوئی تھی۔ اب پتہ نہیں وہ سوئی ہوئی تھی یا صرف آنکھیں بند کئے پڑی تھی۔

"عظمت! ......" میں نے اسے متوجہ کیا۔

"آپ ...... آپ کب آئے؟ ......" وہ آنکھیں کھول کر خوابناک لہجے میں بولی۔ اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دھاریں بہہ نکلیں۔

"ابھی ابھی پہنچا ہوں ...... یہ تم نے کیا حال بنا رکھا ہے؟ ......"

"یہ ...... یہ دیکھئے بھائی۔ میرے دونوں ہاتھ اور دونوں پیر پلنگ کے ساتھ جکڑ دیئے گئے ہیں۔ میں ...... میں کروٹ بھی نہیں بدل سکتی۔ میری پیٹھ' میرے کولہے زخمی ہو چکے ہیں۔ محسوس کریں نہ بھائی کس قدر شدید سردی ہے۔ میرا جوڑ جوڑ اکڑ چکا ہے۔ میں نوکرانیوں کو پکار پکار کر تھک چکی ہوں۔ کوئی نہیں آئی مجھے باتھ روم جانا ہے۔ آپ ہی بتلایئے بھائی۔ کوئی اپنی بہوؤں کے ساتھ ایسا ظلم بھی کرتا ہے؟ ......"

وہ ہچکیاں بھر بھر کر روتی رہی۔ میرا کلیجہ پسیج گیا لیکن چونکہ میں ذہنی طور پر پورے آسیبی کمرے کا جائزہ لینے میں مصروف تھا اندازہ لگا چکا تھا کہ نڈھال عظمت کسی بھی جن بھوت یا شر شیطان کی قید سے آزاد ہے مگر ان دیکھی قوت کے احاطے سے باہر نہیں ہے۔ کمرے کی آسیبی روشنی' آسیبی ماحول چیخ چیخ کر بتلا رہا تھا کہ آسیب کمرے ہی میں موجود ہے اور صرف میرے اگلے قدم کا منتظر ہے اس لئے میں غیر محسوس طور پر اپنی کمر کے گرد لپٹا ہوا ہنٹر کھول چکا تھا۔

ابھی میں عظمت کی ہتھکڑیاں کھولنے کے لئے جھکا ہی تھا کہ میری سماعت سے بہت سے قدموں کی آوازیں ٹکرائیں۔

میں رک گیا' مڑ کر دیکھا تو چوہدرائن معہ دو بیٹیوں اور دو بہوؤں کے کمرے میں داخل ہوئی تھیں۔ ان کے پیچھے میری ناگن بہن تھی جو مجھے باتھ روم کی طرف خفیہ اشارہ کر چکی تھی۔

''ماں جی' تہاں نوں رب دا واسطہ ہے' مجھے آزاد کر دو ورنہ بستر گندا ہو جائے گا......'' عظمت گڑگڑائی۔

''لے پترا چابی۔ تے اینو کھل دے......'' چوہدرائن دوپٹے سے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔

''ماں جی......'' ناگن بہن نے کہا۔ ''آپ سب لوگ نیچے جائیں۔ چاہے حویلی کے بالائی کمروں پر قیامت کیوں نہ ٹوٹ پڑے کوئی بھی اوپر نہیں آئے گا۔ میں خود عظمت بی بی کو لے کر پہنچتی ہوں......'' جملہ مکمل کرنے تک ناگن بہن نے مجھے کچھ خفیہ اشارے کر دیئے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ میں ٹہلتے انداز میں باتھ روم کے دروازے تک پہنچ چکا تھا۔

کمرہ خالی ہو گیا۔ صرف ناگن بہن باقی رہ گئی اور مجھ سے چابی لے کر عظمت کی طرف بڑھ گئی۔

''فکر نہ کرو عظمت بہن۔ ہم دونوں بھائی بہن تم کو ہر قسم کی تکلیف سے نجات دینے کے لئے آئے ہیں۔ شروع ہو جاو ویرا......''

آخری کاشن کے ساتھ ہی میں نے ہینڈل پکڑ کر باتھ روم کا دروازہ ایک جھٹکے سے کھول دیا۔

بے ساختہ میرے ذہن پر بڑے زور کا چھناکا ہوا۔ وجہ وہی بلوری مجسمہ تھا' جسے صرف محسوس کیا جا سکتا تھا۔ وہی مجسمہ جس نے رستم سنگھ کا روپ دھار کر مجھے فضل محمود کے جنگل نما ہوٹل میں گھیرا تھا۔

جیسے ہی دروازہ کھلا۔ بلوری دھویں والی شبیہہ مجھ پر لپک پڑی۔ یہ علیحدہ بات تھی کہ

میں نے بجلی کی سی تیزی سے کوڑے کی زبردست ضرب شبیہہ کے ماتھے پر رسید کر دی تھی۔

پلک جھپکتے کی دیر میں بلوری شبیہ آگ بن گئی۔ جسامت واعضاء تو اس کے انسانی ہی تھے لیکن لگتا یوں تھا جیسے آگ سے بنا ہوا ہو۔ جس طرح کوئی بھی انسان آگ کو نہیں چھو سکتا بالکل اسی طرح آگ کے مجسمے سے ٹکرا کر بلکہ گزر کر میرا کوڑا میرے ہاتھ ہی میں جھولتا رہ گیا۔

بہر حال آگ کا مجسمہ بنتے ہی اس کے دہانے سے آگ کی ایک لمبی چوڑی زناٹے دار زبان نکلی۔ اگر میں فوراً ہی اکڑوں نہ بیٹھ گیا ہوتا تو شاید آگ کی زبان مجھے اپنی لپیٹ میں لے چکی ہوتی۔

ناکامی کی صورت میں آگ کا مجسمہ بغیر کسی آواز کے چہرے کے بل باتھ روم سے کمرے کے فرش پر گر چکا تھا۔

دوسری طرف ناگن بہن عظمت کی زنجیریں کھولنے کے بعد اسے اپنی بانہوں کا سہارا دیئے دروازے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ناگن بہن نے عقلمندی یہ کی تھی کہ عظمت کی آنکھوں کے گرد سیاہ کمبل اس طرح لپیٹ دیا تھا کہ وہ کمرے میں ہونے والی کارروائی دیکھنے سے قاصر تھی۔

بہر حال میں جمپ لگا کر پرے ہٹ گیا اور آگ کا مجسمہ فرش پر لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ ہوتا رہا...... ہوتا رہا اور پھر آگ از خود بجھنے لگی۔ آگ کی جگہ کھولتے ہوئے سیال نے لے لی۔

چند ہی لمحوں بعد پورا مجسمہ سیال بن گیا اور پھر مزید چند لمحوں بعد سلگتا ہوا سیال بھی کمرے کی روشن فضاء میں تحلیل ہوتا چلا گیا۔ اب کمرے کی روشنی اپنا اصل وجود پا چکی تھی۔ تھوڑی دیر پہلے کمرے میں جو آسیبیت، نحوست و ویرانی چھائی ہوئی تھی وہ یکسر مٹ گئی۔ اس کے باوجود میں کوڑا لیے کمرے کے ایک ایک حصے میں گھومتا رہا۔ میں نے اٹیچڈ ڈریسنگ روم اور اسٹور تک کا جائزہ لے لیا۔

"جانتے ہو ویرا یہ کون تھا؟......" معا ناگن بہن کمرے میں داخل ہوتے ہوئے سرگوشیانہ لہجے میں بولی۔

"ہاں آپا۔ یہ وہی تھا جس نے فضل محمود کے ہوٹل میں باکڑے سمیت مجھے اٹھا کر باہر پھینک دیا تھا......"

"بلے بھئی بلے۔ بہت ہوشیار ہو چکے ہو......" ناگن بہن تعریفانہ انداز میں بولی۔

"آپا جی۔ ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی......"

"وہ کیا؟......"

"وہ یہ کہ عظمت کے وجود میں جن تھا۔ وہ عظمت کے وجود سے نکل کر باتھ روم میں کیوں جا چھپا اور یہ کہ وہ مٹ گیا مگر اس کے وجد سے کوئی آواز کیوں نہ نکل سکی؟......" میں نے اپنے خدشات کا اظہار کر دیا۔

"تمہیں یاد ہو گا کہ فضل محمود کے ہوٹل میں جب وہ دوسرا اور انتہائی خوف ناک حملہ تم پر کرنے والا تھا تو میں غبار بن کر دونوں سے لپٹ پڑی تھی۔ یہ میری اپنی طاقت کا اثر ہے کہ دونوں آتشی مخلوق بہت بری طرح زخمی ہو کر بھاگ گئے تھے۔ میں نے ان کا آخر تک تعاقب کیا اور جہاں بھی موقع ملا' میں نے ان کو ڈس لیا۔

یہ میرے زہر کا اثر تھا کہ وہ کراہنے کے قابل بھی نہیں رہے۔ وہ سیدھے یہیں آ گئے اور عظمت و رفعت ان کی جھپٹ میں آ گئیں۔

جانتے ہو ویرا۔ اگر مزید دو روز تم اس حویلی میں نہ آتے تو دنیا کی کوئی طاقت انہیں ٹھیک نہیں کر سکتی تھی اور وہ دونوں عظمت و رفعت کو لے کر نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہو جاتے۔

وہ تمہاری بہنوں کے ساتھ یہی سلوک کر سکتے تھے مگر وہاں میرا وجود ان کے لئے رکاوٹ بنا ہوا تھا۔"

"اوہ۔ مگر آپا۔ آپ یہاں کب پہنچیں؟"

"او جھلیا میں تمہارے ساتھ ساتھ ہی پہنچی تھی۔ اچھا بس اب رفعت کی خبر لے

لو......"

☆☆☆

رفعت کا کمرہ درمیان کے دو کمروں کے بعد تھا۔ حیرت انگریز طور پر ناگن بہن ایک دودھیائی غبار بن چکی تھی۔ میرے شانہ بشانہ ساتھ تھی مگر نہ تو اس کا چہرہ دکھائی دیا نہ ہی گوشت پوست ورنگت۔ وہ انسانی جسامت پانے والا محض ایک غبار تھی۔

میں نے رفعت کے کمرے پر ہلکا سا دباؤ ڈالا ہی تھا کہ کواڑ کھل گیا۔ "آؤ...... آؤ وصی الدین آجاؤ......" رفعت کے لبوں سے ایک بھاری بھرکم اور پھٹی ہوئی آواز نکلی جیسے دو بلڈ ہاؤنڈ کتے غرانے لگے ہوں۔

آواز سے قطع نظر رفعت کی آنکھیں ابلی ہوئی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے دونوں ڈھیلے حلقوں پر چپکے ہوئے ہوں۔ حیرت انگریز طور پر ڈھیلوں کے درمیان کی کالی پتلی سرے سے نہیں تھی۔ صرف دو بلور سے ابلے ہوئی دکھائی دیئے۔

اس کے دانت بالکل زرد تھے اور وہ اس طرح اوپری دانتوں سے نچلے دانت کررٹ...... کررٹ کر کے رگڑ رہی تھی جیسے چھالیہ چبا رہی ہو۔ اس کے ہونٹوں کے گوشوں سے جھاگ بہہ رہا تھا گدلا گدلا اور بدبودار جھاگ اور وہ اپنے ہی ہاتھوں سے اپنے نرم و گداز سینے کو سہلا رہی تھی' پمپ کر رہی تھی۔

یہ سب کچھ میں نے ایک لمحہ کے اندر دیکھ لیا۔ دیکھتے ہی میرے ذہن پر بڑی زور کا چھناکہ ہوا۔

مجھے تو یہ بتلایا گیا تھا کہ رفعت کے ہاتھ پیر بھی زنجیروں سے جکڑے ہوئے ہیں مگر یہاں تو وہ بالکل آزاد بیٹھی تھی۔ زنجیریں فرش پر پڑی ہوئی تھیں۔

"آجاؤ وصی الدین۔ میرے پاس آؤ۔ یہ...... یہ دیکھو میری رانیں......" بدستور غراہٹ آمیز بھاری بھرکم آواز میں کہتے ہوئے اس نے اپنا لاچہ اٹھا دیا۔

بے ساختہ میرے لبوں پر حقارت بھری مسکراہٹ بکھر گئی۔

"ایک پاک دامن عورت کو بدکار بنا کر تو نے مجھے متاثر کرنے کی ناکام اور گندی

حرکت کی ہے کتے......"

میرا جملہ مکمل ہوا ہی تھا کہ رفعت کی آنکھوں کے بلوری ڈھیلے سلگتے ہوئے انگارے بن گئے۔ اس کا منہ نہ صرف اژدہے کے دہانے کی طرح کھل گیا بلکہ گوشے بھی پھیل کر رہ گئے۔ وہ اپنے بستر سے اس طرح اڑی جیسے اس کے پر نکل آئے ہوں۔

وہ اڑتی ہوئی سی مجھ پر جھپٹی‘ جھپٹی ہی تھی کہ میرے جسم کو ایک زوردار جھٹکا لگا اور میں توازن برقرار نہ رکھنے کی بنا پر دائیں کروٹ زمین پر گر پڑا۔

میرے لبوں سے بے ساختہ قہرناک آواز نکل گئی اور میں قہر برساتی نظروں سے دھکیلنے والے کو تکنے لگا اور...... میرے لبوں سے سکون کی سانس نکل گئی۔

وجہ یہ تھی کہ غبار بنی ہوئی ناگن بہن رفعت کے چھلانگ لگاتے ہی پہنچ گئی‘ مجھے دھکیل دیا اور رفعت کو اس طرح اپنے غبار نما بازوؤں میں جکڑ لیا جیسے وہ ہلکی پھلکی گڑیا ہو۔

بے ساختہ رفعت کے حلق سے ایک غیر انسانی طویل چیخ نکلی۔ یوں لگا جیسے آتش فشاں ابل پڑا ہو۔ پورا کمرہ لرز کر رہ گیا۔

"اس روز بچ گئے تھے شیطان......" ناگن بہن کی پھنکارتی آواز کمرے میں گونجی۔

"مت بھولو کہ بنانے والے نے آتشی مخلوق کی موت بھی یقینی بنائی ہوئی ہے۔ تم...... یہ سمجھے کہ عورت کے وجود میں داخل ہو کر موت کے شکنجے سے بچ جاؤ گے......"

"اے...... ای...... عاہ۔ چھوڑ دو...... مجھے چھوڑ دو‘ میں...... میں چلا جاؤں گا۔ اس علاقے سے بہت دور......" درد کرب‘ کراہیں اور سسکیوں بھری غیر انسانی آواز سنائی دی۔

میں کوڑے پر گرفت مضبوط کئے ایک ہی چھلانگ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ میں ناگن بہن کی اسکیم کو سمجھ چکا تھا۔

"ٹھیک ہے شیطان۔ میں گرفت ڈھیلی کئے دیتی ہوں۔ تو اس مظلوم عورت کے جسم سے نکل جا......" ناگن بہن بولی۔

"میں...... بہت زخمی ہو چکا ہوں‘ مجھے رفعت کے وجود سے نکلنے میں وقت لگے

گا......"

"نہیں۔ میرے پاس وقت نہیں ہے۔ میں تمہیں یہیں پیس کر رکھ دوں گی......"

"ناں......ناں...... عاہ۔ تم......ایسا نہیں کر سکو گی' اگر تم نے ایسا کیا تو رفعت بھی مر جائے گی......" بھیانک آواز ابھری۔

"کوئی بات نہیں' ایک رفعت کے مر جانے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا......"

"ٹھہرو...... تمہیں تمہارے خدا کا واسطہ ہے۔ رفعت کو پلنگ پر ڈال دو میں آن واحد میں اسے چھوڑ دوں گا۔"

میرا ذہن بری طرح الجھ کر رہ گیا تھا۔ مجھے نہ تو ناگن بہن نظر آئی اور نہ ہی وہ جن جسے ناگن بہن نے اپنی ماورائی قوتوں میں جکڑ رکھا تھا۔ میں نے صرف اتنا دیکھا کہ ناگن بہن نے رفعت کو اس کے پلنگ پر اچھال دیا ہے۔

ایسا ہوتے ہی رفعت کے سر پر تالو کی جگہ سے ایک آگ کی طرح سلگتا ہوا بلوری دھواں سا نکلنے لگا۔

ایک لمحہ کی تاخیر کے بغیر میں نے کوڑا لہرا دیا۔ بڑی زور کا چھناکا ہوا۔ جیسے آگ پر پانی ڈال دیا گیا ہے۔ چھناکے کے ساتھ ہی میرے کوڑے کی زبان بلوری دھوئیں کے گرد لپٹ گئی اور جونہی میں نے اپنا ہاتھ کھینچا' ایک پورے کا پورا' سلگتا ہوا مجسمہ رفعت کے وجود سے نکل کر چھپاک سے فرش پر گر پڑا۔

اف خدایا۔ پورا کمرہ گویا جھنجھنے کی طرح ڈولنے اور بجنے لگا۔ ہر چہار سمت سے ایسی ہولناک آوازیں ابھری کہ میں نے بھی گھبرا کر اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس دیں۔

آوازیں مدھم پڑتی گئیں اور بلوری وجود آگ کی طرح سیال بن کر پگھلتا رہا...... پگھلتا رہا اور...... پھر' حرف غلط کی طرح مٹ گیا۔

☆☆☆

عظمت آراء گلاب کے پھول کی طرح دمک رہی تھی۔ ایک ہی گھنٹے میں وہ غسل وغیرہ سے فارغ ہو کر' لباس بدل کر اپنے دونوں بیٹوں کے ساتھ بیٹھی ہوئی بار بار انہیں

پیار کر رہی تھی۔ کھانا بھی وہ خوب سیر ہو کر کھا چکی تھی جب کہ رفعت جہاں ہنوز غسل خانے میں تھی۔

چوہدرائن میرے ساتھ صوفے پر بیٹھی تھی۔ ناگن بہن بھی میرے ساتھ ہی صوفے پر بیٹھی تھی۔ سدرہ میرے سامنے نہیں آئی لیکن میں دیکھ چکا تھا کہ وہ بالمقابل کمرے کے دروازے کے پیچھے کھڑی ہوئی سب کی نظریں بچا کر مجھے چڑا رہی ہے۔

نوشابہ' امام دین کی بیوہ کشور جہاں اور سلطان کی بیوہ بتول النساء اور چند ملازمائیں سب کی سب بیٹھی تھیں۔ ہر ایک کا چہرہ کھلا ہوا تھا۔ مسکراہٹیں اور مسرتیں بٹ رہی تھیں بلکہ یوں کہنا مناسب ہے کہ نظام حویلی کے ہر ذرے سے نحوست' اداسی اور اذیتیں چھٹ چکی تھیں۔

چوہدرائن بار بار دامن اٹھا اٹھا کر مجھے دعائیں دیتی رہیں اور بڑے فخر سے کہتیں۔ "میں نے وصی الدین کو اس حویلی اور اس میں بسنے والوں کا وارث و محافظ بنا کر غلطی نہیں کی۔"

تھوڑی دیر بعد رفعت بھی بن سنور کر آگئی۔ میں نے پہلے ہی حویلی کے ہر فرد کو محتاط کر دیا تھا کہ عظمت اور رفعت کو یہ قطعی نا بتلایا جائے کہ ان پر دیوانگی کے دورے پڑتے تھے۔

ساڑھے نو بجے شب سب کو ہنستا مسکراتا ہوا چھوڑ کر میں اور ناگن بہن روانگی کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"وصی پترا...... "چوہدرائن ہمارے ساتھ دروازے تک بڑھتے ہوئے بولیں۔ "پتہ نہیں میری زندگی کتنی ہے اس لئے۔ بس چاہتی ہوں کہ حصے وکھرے ہو جائیں......"

"م' میں سمجھا نہیں ماں جی......"

"او پترا سدھی سی گل ہے گی۔ چوہدری نظام کی زندگی ہی میں میرے چاروں بیٹے چھپ چھپ کر سازشیں کرتے رہتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ جائداد میں سے ان کے حصے وکھرے کر دیئے جاون۔

پترا۔ میں نہیں چاہتی کہ میرے پوتے بھی بڑے ہو کر اسی ڈگر پر چل نکلیں۔

تم تو جانتے ہو کہ میرے آٹھ پوتے اور چھ پوتیاں ہیں۔ چار بہوئیں اور دو بیٹیاں بھی ہیں اس لئے میری خواہش ہے کہ ہر ایک کو شرعی قوانین کے تحت ان کا حصہ دے دیا جائے۔ میرا مطلب ہے ان کے نام کر دیا جائے......"

"ٹھیک ہے ماں جی۔ میں کل ہی سے اس کام پر لگ جاتا ہوں......" میں نے مستعدی سے جواب دیا۔

دوران گفتگو ہم حویلی کے پائیں باغ تک پہنچ چکے تھے۔ یہاں اتنی ہی روشنی تھی کہ بڑے پھاٹک پر متعین چاروں پہرے دار صاف دکھائی دے رہے تھے۔

یوں تو پورے گرین اسپاٹ ماحول میں طرح طرح کے پھولوں کی خوشبو رچی بسی ہوئی تھی مگر ان سب میں نمایاں رات کی رانی کی خوشبو تھی "اک گل اور پترا۔ سلطان دے والدین نوں آکھ دے کہ جلد توں جلد اپنی امانت مجھ سے لے جائیں۔"

"ٹھیک ہے ماں جی۔ میری بھی یہ دلی خواہش ہے کہ فوزیہ اور فرحین کی رخصتی کر دوں۔ اب آپ نے حکم دیا ہے تو سلطان خان' زمان خان اور فرحان خان کے ساتھ ہی دولہان کر آجائے......" بہنوں کی شادی کے تصور ہی سے میرا وجود گدگدانے لگا تھا۔

"وصی الدین......" چوہدرائن کے مخاطب کرنے پر میں چونک پڑا۔ "تم جانتے ہو کہ میرے دو پوتے بارہ تیرہ برس سے زیادہ عمر کے نہیں ہیں اس لئے میں چاہتی ہوں کہ ان کے جوان ہونے تک سکندر خان ہمارے ساتھ ہی رہے......"

"ماں جی۔ میرے خیال سے سکندر خان اس پیش کش کو کسی حالت میں منظور نہیں کرے گا۔ پھر یہ کہ آپ کو پریشانی ہی کیا ہے۔ میں ہوں ناں......"

"ہوں...... چنگا پترا' جیویں تیری مرضی......"

"ماں جی......" چوہدرائن کے خاموش ہوتے ہی ناگن بہن بول اٹھی۔ "جی دھیئے......"

"فروری کا مہینہ ختم ہو رہا ہے۔ پندرہ مارچ تک نوشابہ کی رخصتی ہو جائے گی۔ میں

چاہتی ہوں کہ نوشابہ کی رخصتی کے ایک ہفتہ بعد آپ سدرہ کی رخصتی بھی کر دیں......"

میں ناگن بہن کے ہونٹوں پر کھیلنے والی شریری مسکراہٹ پر جھینپ گیا۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ خوش آئند تصور نے میرے دل کی دھڑکنیں تیز کر دی تھیں۔

"ماں صدقے دھی اے۔ جو گل میں ناں کہہ سک دی۔ تم نے کہہ دی ہے اور میں نے قبول کر لی ہے۔"

☆☆☆

سارے معاملات حسن و خوبی طے پا گئے۔ خالو کمال الدین نے پوری چاہ سے اپنے تینوں بیٹوں کی شادی کی تیاریاں شروع کر دیں۔ میں نے بھی اپنی دونوں بہوں کے جہیز کی زور و شور سے تیاری شروع کر دی۔

چونکہ ان تیاریوں کے سلسلے میں مجھے بار بار چکوال اور جہلم تک جانا پڑتا تھا۔ اس لئے ایک پنتھ دو کاج کے مصداق اپنا اثر رسوخ استعمال کرتے ہوئے میں نے چوہدری نظام کی جائداد میں سے ہر فرد کے لئے ان کے حصے دستاویزی صورت میں تیار کروا کر چوہدرائن کے سپرد کر دیئے۔

میں نے اپنی تین شوگر ملوں میں سے' جنہیں میں قانونی طور پر حاصل کر چکا تھا' فوزیہ اور فرحین کے نام کر دیں۔ اس دوران گاؤں میں شادیانے گونجتے رہے' جگہ جگہ بھنگڑے ہوتے رہے' غرباء و مساکین کو نوازا جاتا رہا اور پھر پندرہ کی جائے بیس مارچ تک نوشابہ' فوزیہ اور فرحین کی شاندار طریقے پر رخصتی ہو گئی۔

فوزیہ اور فرحین کو رخصت کر دینے کے بعد میں بہت ہی پریشان سا رہنے لگا تھا۔ حالانکہ میں تنہا نہیں تھا۔ ناگن بہن میرے ساتھ رہ رہی تھی۔ میں نے ناگن بہن کے لئے بالکل الگ کمرے کا انتظام کر دیا تھا اس کے باوجود وہ میرے کمرے ہی میں الگ پلنگ پر سونا پسند کرتی تھی اس کا کہنا تھا کہ جب تک سدرہ اس گھر میں نہیں آجاتی' وہ میرے ہی کمرے میں سونے کو ترجیح دے گی۔

اس نے مجھے حقیقی بہن اور حقیقی ماں کا پیار دیا۔ میں گھنٹوں اس کے ساتھ اپنے دادا'

والدین اور بہنوں کے تذکرے کرتے نہیں تھکتا تھا۔

ایک روز میں حاجی نور الدین اس کے بیٹوں اور محلے کے چند بزرگوں کے ساتھ بیٹھا ہوا گپیں ہانک رہا تھا اور ناگن بہن نظام حویلی میں چوہدرائن کے ساتھ بیٹھی میری اور سدرہ کی شادی کی بات و تاریخ طے کر رہی تھی۔

شام کو جب وہ واپس آئی تو مجھے پورے پروگرام سے مطلع کر دیا اس نے بتلایا کہ دس اپریل سے میری شادی شروع ہونی ہے۔ سترہ اپریل کو نکاح ہو گا اور شام سے پہلے پہلے رخصتی ہو جائے گی۔

چونکہ سدرہ میری مسرتوں کا محور تھی۔ دراصل سدرہ کے حصول کا تصور اس سے میری محبت کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر آتشی مخلوق، یعنی جنی گنزا کا مرہون منت تھا اس لئے مجھے گنزا کی یاد بھی بہت ہی شدت سے آنے لگی۔

یہ گنزا ہی تھی جو اول ملاقات ہی سے سدرہ کا روپ دھار کر میرے سامنے آتی رہی تھی۔ مجھے اس لئے گنزا سے بے پناہ محبت ہو گئی تھی۔ یقیناً گنزا نے بھی میری بے رخی کو محسوس کر لیا تھا' شاید اسی لئے وہ محتاط بھی ہو گئی تھی اس کے بعد وہ جب بھی میرے سامنے آئی، محض ایک ننھی سی گڑیا کی صورت میں۔

بہر حال میں نے شادی کی تیاریاں، شروع کر دیں۔ آہستہ آہستہ میرے گھر مہمانوں کے قافلے آنے شروع ہو گئے اور میرے گھر کی رونقیں بڑھنے لگیں۔

یہاں یہ بھی بتلاتا چلوں کہ میں نے بھی ایک طاقتور جنریٹر خرید لیا تھا۔ اسی جنریٹر سے میں نے ایک سپلائی لائن محلے کی مسجد اور حاجی چاچا کے گھر تک بچھادی تھی۔

تین روز کے اندر ہی میرے گاؤں کے نائیوں نے ہر جگہ پیغام دے دیا تھا چوہدری نظام کی حویلی میں شادی کے تمام انتظامات میرے خالہ زاد بھائی سلطان نے سنبھال لئے تھے۔

جوں جوں وقت قریب آتا گیا' مجھے گنزا اور اس کے ساتھیوں کی یاد بڑی شدت سے آنے لگی تھی۔

جیسا کہ میرا گھر اتنا بڑا نہ تھا کہ میں قیام پذیر کئی خاندانوں کی ضرورت کو پورا کر سکتا اس لئے البرٹ ہرکل سے استدعا کر کے میں نے پندرہ خیموں کا انتظام کر لیا تھا۔ چھ خیمے مردوں کے لئے وقف تھے اور نو خیمے عورتوں اور بچوں کے لئے وقف کر دیئے گئے تھے۔ شادی شروع ہو گئی۔ شادی کا پہلا دن شروع ہوتے ہی میں جھ کر رہ گیا۔ آج مجھے میرے پیاروں کی یاد نے تڑپا کر رکھ دیا تھا۔ لہٰذا اپنے دل کی تسلی کے لئے عین دوپہر کے دو بجے میں قبرستان کی طرف چل پڑا۔ یہ دوپہر دس اپریل کی تھی۔ بہار کا موسم تھا اس لئے ہر جاندار و بے جان چیز پر شباب آیا ہوا تھا۔ کھیتوں کھلیانوں میں بھی بہت کم مزارعے رہ گئے تھے ورنہ اکثریت میرے گھر پر کھانے پر مدعو تھی۔ سینکڑوں مزارعے نظام حویلی میں بھی موجود تھے۔



پانچوں قبروں پر پھولوں کی چادریں چڑھانے اور رو رو کر دعائیں مانگنے کے بعد میں نے واپسی کا ارادہ کر لیا۔

ابھی میں قبرستان ہی میں تھا کہ میں نے چار سپیروں کو ایک گھنے اور پھیلے ہوئے درخت کی چھاؤں تلے اپنے پٹارے رکھتے ہوئے دیکھا۔ چاروں سپیرے لمبے تڑنگے اور قوی ہیکل تھے۔ ان کی مونچھیں اس قدر گھنی، نوکیلی اور مڑی ہوئی تھیں کہ بچے دیکھ لیں تو ڈر جائیں۔

وہ زرد کرتے، زرد پگڑیاں اور زرد دھوتیاں پہنے تھے۔ انہوں نے کانوں میں کسی جانور کی ہڈیوں کے بنے ہوئے چوڑے رنگ پہنے ہوئے تھے۔ ان کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں موروثی وحشت سمائی ہوئی تھی اور جسمانی رنگت نہ تو سیاہ کہی جا سکتی تھی نہ ہی سرخ۔

جیسے ہی میں ان کے قریب سے گزرا چاروں سپیرے ہاتھ جوڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ شاید وہ میری شخصیت سے متاثر ہوئے تھے یا پھر ہو سکتا ہے میرے بھڑکدار لباس کے باعث مجھے بہت بڑا زمیندار سمجھ بیٹھے ہوں۔

"پرنام رئیس بابو..."

چاروں ہیک زبان بولے۔ میں نے اندازہ لگالیا کہ چاروں سپیرے ہندو ہیں۔

''کون ہو بھئی آپ لوگ' کہاں سے آئے ہو اور کہاں جا رہے ہو ؟......'' میں نے نارمل لہجے میں کہا۔

''سپیرے ہیں رئیس بابو۔ کشمیر سے چلے ہیں۔ ہمیں چند سپیروں سے معلوم ہوا تھا کہ اس گاؤں میں ایک شیش ناگن بستی ہے۔ بس اسی کو تلاش کرنے پہنچے ہیں......''

میرے ذہن پر بڑے زور کا چھناکا ہوا۔ ایک لمحہ کے لئے تو میری آنکھوں کے گرد اندھیرا سا چھا گیا لیکن' جلد ہی میں اپنی حالت پر قابو پا گیا۔

''سنو بھئی۔ اس گاؤں میں کوئی شیش ناگن وغیرہ نہیں ہے۔ آپ برائے مہربانی یہیں سے واپس چلے جائیں......'' میرے لہجے میں تھوڑی سی سختی آ گئی۔ ''نہیں رئیس نہیں۔ ہم ڈوگرو' جس کام کے لئے آئے ہیں اسے پورا کئے بغیر نہیں جائیں گے......'' ایک سپیرا عاجزانہ انداز میں بھی دھمکی دیتے ہوئے بولا۔

''ضد نہیں کرتے ڈوگرو۔ بہتر ہے کہ واپس چلے جاؤ......'' میں ان سے محو گفتگو رہا اور زمین پر اطراف کی جھاڑیوں کی ڈالیاں سانپ کی طرح رینگتی ہوئی میرے پیروں کی طرف بڑھتی رہیں۔

''ہم واپس ضرور جائیں گے رئیس بابو مگر شیش ناگن کو حاصل کئے بغیر نہیں جائیں گے......''

''تمہارے پاس کیا ثبوت ؟......'' میں یہیں تک کہنے پایا تھا کہ ٹخنوں کے گرد تیز سی سرسراہٹ محسوس کر کے جملہ مکمل کئے بغیر پیروں کی طرف نظریں جھکائیں۔

اچانک مجھے ایک زبردست جھٹکا لگا اور توازن برقرار نہ رکھنے کی بناء پر دھب سے پیٹھ کے بل ایک قبر پر گر پڑا۔ گرتے گرتے میرا دایاں ہاتھ از خود میرے کوڑے کے دستے پر پڑ گیا تھا اور جھٹکا لگنے سے کوڑا کمر سے نکل کر میرے ہاتھ میں رہ گیا۔

آن واحد میں ساری سچویشن میری سمجھ میں آ چکی تھی مجھے یقین سا ہو گیا کہ آتشی مخلوق سے تعلق رکھنے والے چاروں شیطان میری جان لینا چاہتے ہیں۔

پھر اس سے پہلے کہ میرے ٹخنوں سے لپٹی ہوئی ٹہنیاں دائیں بائیں سمٹتیں' میں نے ہوا کے بگولے کی طرح اپنے ہاتھ کو حرکت دی۔ چھپاک چھپاک سے ہنٹر کی زبان ٹہنیوں سے ٹکرائی اور چٹاخ کی کریہہ آواز سے دونوں ٹہنیاں کٹ گئیں۔

یہ سب کچھ آن واحد میں اور دیکھتے ہی دیکھتے ہو گیا۔ میں جمناسٹک ایکسپرٹ کی طرح اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

چاروں شیطان بھوکے بھیڑیوں کی طرح سہکنے لگے۔ ان کی آنکھیں انگارے سے اگلنے لگی تھیں۔

ٹھیک اسی لمحے پورے قبرستان پر آندھی چھا گئی۔ گرد و غبار مرغولے کی صورت اختیار کر گئے' زناٹے دار آوازیں ابھرنے لگیں۔ جھاڑیاں اور ٹہنیاں اس طرح جھولنے لگیں جیسے ابھی ٹوٹ پڑیں گی۔

اسی آندھی و طوفان میں روشن غبار اور انسانی جسامت رکھنے والا ایک مرغولہ آسمانی برق کی طرح کڑکتا ہوا میرے اور چاروں سپیروں کے درمیان حائل ہو گیا۔

''شیطانو......'' ہیولے سے برق گراں کی سی کوندتی ہوئی آواز نکلی۔ آواز سنتے ہی میری تمام حسیات بیدار ہو گئیں۔ یہ آواز میری ناگن بہن کی آواز تھی۔ ''تمہیں میری تلاش تھی ناں۔ تو لو میں خود آ گئی ہوں۔ میں ہی شیش ناگ ہوں......''

ناگن بہن کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی میں حرکت میں آ گیا۔ مجھے خدشہ ہوا کہ کہیں چاروں سپیرے اپنی شیطانی قوتوں سے ناگن بہن کو کوئی نقصان نہ پہنچا دیں۔

چھپاک کی آواز کے ساتھ میرے کوڑے کی زبان ایک سپیرے کی پیشانی کی چمڑی ادھیڑتی ہوئی دوسرے کی گردن کا بوسہ لے بیٹھی۔

اف خدایا۔ دونوں کے لبوں سے دہشت ناک آوازیں نکلیں۔ دونوں سپیرے گر پڑے ایک کی پیشانی اور دوسرے کی گردن سے کھولتے ہوئے لاوے کی طرح سلگتا ہوا سیال بہنے لگا تھا۔

بیک وقت ناگن بہن کا ہیولہ بھی متحرک ہو گیا تھا بلکہ یوں کہنا مناسب ہے کہ بقیہ

دونوں سپیروں کے گرد اس تیزی سے چکرانے لگا کہ آنکھیں ٹکانی مشکل ہو گئیں۔

دیکھتے ہی دیکھتے وہ دونوں بھی زمین پر گر پڑے اور جل مچھلی کی طرح تڑپنے لگے۔ ان کے جسم پلک جھپکنے کی دیر میں آگ کے وجود بن گئے۔

اب ایسی ہولناک آوازیں اٹھنے لگیں جیسے زمین پر زلزلہ آ گیا ہو۔ آندھی اور مرغولوں میں اس قدر شدت آ گئی کہ آنکھیں کھولنا مشکل ہو گیا۔

چند لمحوں بعد جب میں نے آنکھیں کھولیں تو پورے قبرستان پر ازلی اور ابدی سکوت چھایا ہوا تھا۔ آندھی تھی نہ مرغولے اور نہ ہی چاروں سپیروں کا وجود تھا۔

صرف ناگن بہن درخت کے تنے سے کندھا ٹکائے' پسینے میں لت پت بہت بری طرح ہانپ رہی تھی۔ اس کا سینہ بڑی تیزی سے پھول پھول کر پچک رہا تھا۔

"آپا۔" میں بیتابانہ ناگن بہن کی طرف بڑھا۔ "آپ...... آپ ٹھیک تو ہیں؟....

کہتے ہوئے میں نے کرتے کی جیب سے رومال نکال کر ناگن بہن کے چہرے سے پسینہ پونچھنا شروع کر دیا۔ "ہاں صدقے ویرا میں بالکل ٹھیک ہوں۔" وہ میرے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔ اس کے سرخ لبوں پر مسحت بھری مسکراہٹ عود کر آئی تھی۔

"آپا۔ آپ...... آپ کیسے پہنچیں؟......

"ویرا۔ میں مہمان عورتوں کو کھانا کھلا رہی تھی کہ آتشی مخلوق کے چاروں شیطانوں کو تمہارے گرد ماورائی قوتیں پھیلاتے دیکھ لیا۔ یہ چاروں حقیقتاً میری ہی تلاش میں پہنچے تھے۔ ان کے بہت سے ساتھیوں کی موت نے انہیں یقین دلا دیا تھا کہ میں' یعنی شیش ناگن تمہاری معاونت کر رہی ہوں۔

ویرا' اگر میں بروقت نہ پہنچ پاتی تو اس درخت کی شاخیں تمہارے بازوؤں سے لپٹ جاتیں اور تم کوڑا چلانے کے قابل نہ رہتے اور...... اور نہیں بس' کچھ نہیں......" ناگن بہن کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

میں نے بیتاب ہو کر ناگن بہن کو اپنی آغوش میں سمیٹ لیا اور تسلی کے جتنے الفاظ مجھے

یاد تھے 'اداکر تا رہا۔

ناگن بہن مطمئن ہو گئی۔ اسی طرح ہم باتیں کرتے ہوئے قبرستان کی حدود سے نکل کھڑے ہوئے۔

"ویرا۔ میں نے ڈھوک نالیاں اور کنگر گاؤں کے درمیان ایک ویران جگہ پر بہت بڑے خزانے کا پتہ لگایا ہے۔ یہ خزانہ صرف تمہارے لئے ہے۔ صرف ایک بات خطرناک ہے وہ یہ کہ اس خزانے پر ہندوؤں کی روایتی دیوی درگا مائی کا قبضہ ہے۔ اس دیوی کے قبضے میں دنیا کے خطرناک ترین سانپ بھی ہیں اور بید بھی......"

"چھوڑیں آپا۔ کیا کرنا ہے خزانے کا۔ آپ کو معلوم ہی ہے کہ میرے پاس بہت کچھ ہے......"

ناگن بہن نے کوئی جواب نہیں دیا۔ شاید وہ کچھ سوچنے لگی تھی۔



دن گزرتے گئے۔ مایوں کی رسم ہو گئی' مہندی کا دن بھی گزر گیا۔ یہ سولہ اپریل کی ایک شام کی بات ہے۔ میں حاجی چاچا اور دیگر بہت سے افراد کے ساتھ تمبو میں بیٹھا تھا۔ گو کہ میری اپنی شادی ہو رہی تھی اور ایسی لڑکی کے ساتھ ہو رہی تھی جو ہر لحاظ سے میرا مرکزی تصور تھی۔ مجھے بے انتہا خوش رہنا چاہئے تھا مگر میں اداس تھا۔ گنزا' دیجورو غیرہ کی غیر موجودگی کو میں شدت سے محسوس کرنے لگا تھا۔

کبھی مجھے یوں محسوس ہوتا کہ وہ پہنچ چکے ہیں اور روپ بدل کر میرے آس پاس ہی کہیں موجود ہیں۔

اچانک میرا ذاتی ملازم تمبو میں آیا اور مجھے بتلایا کہ پنجاب کا وائسرائے رائن ہڈسن آیا ہے۔

میں چونک کر اٹھ کھڑا ہوا۔ چونکہ اس لئے کہ میں نے اسے اپنی شادی کی کوئی اطلاع نہیں دی تھی۔

بہر حال میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا جیسے ہی ڈیوڑھی پر پہنچا' بیری کے درخت کے

سائے میں پارک کی ہوئی جیپ سے ٹیک لگائے رابن ہڈسن کھڑا تھا۔ اس کے ہمراہ دو باوردی فوجی بھی تھے اور جیپ میں تین فقید المثال انگریز عورتیں بھی بیٹھی تھیں۔

''ہیلو میجر۔ شادی کی خوشیاں مبارک ہوں......'' رابن ہڈسن بڑی گرمجوشی سے مصافحہ کرتے ہوئے بولا۔

''شکریہ مسٹر ہڈسن۔ آیئے ڈرائنگ روم میں چلتے ہیں......''

''ضرور چلیں گے۔ پہلے تعارف تو مکمل ہونے دیں۔ ان سے ملئے یہ ہے میرا دوست وائیٹ مسٹر شرجیل......''

''وہاٹ......'' میری چیخ نکل گئی۔ یک بیک ہی میری تمام حسیات سمٹ کر میری آنکھوں میں آ جمیں۔ لیکن ہڈسن لبوں پر پراسرار مسکراہٹ لئے تعارف کرواتا رہا۔

''یہ ہیں میرے دست چپ' مسٹر فراہیم اور وہ سرخ لباس میں ملبوس خاتون گنزا ہیں۔ آسمانی لباس والی جمائمہ ہے اور آتشی لباس والی صابرہ ہے......''

''اور آپ ہیں دیجور' کیوں؟......'' تعارف کے دوران ہی میں اپنی حالت پر قابو پا چکا تھا میرے انگ انگ سے مسرتوں کا سمندر سا ٹھاٹھیں مار رہا تھا جب کہ ہڈسن کے بہروپ میں موجود دیجور کے لبوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ میں اس کی مسکراہٹ کو نظر انداز کر کے بلا امتیاز ہر ایک کو دیوانہ وار سینے سے لپٹا رہا تھا۔ ''بہت انتظار کروایا آپ لوگوں نے......'' میں شکایتی لہجے میں بولا۔ ''......خواہ مخواہ ہی۔ ارے بھئی ہم شادی کے پہلے روز ہی پہنچ چکے تھے۔ گنزا' صابرہ اور جمائمہ آپ کی ہونے والی زوجہ سدرہ کی حفاظت کر رہی تھی اور ہم آپ کی بہنوں کی حفاظت کر رہے تھے وہ چاروں جنات' جنہوں نے قبرستان میں آپ پر حملہ کیا تھا پہلے سدرہ ہی کی طرف بڑھے تھے۔ گنزا وغیرہ نے جب انہیں وہاں سے بھگایا تو وہ کتوں کا روپ بھر کر تمہاری بہنوں کی طرف لپکے اور جب ہم نے انہیں وہاں سے بھی بھگا دیا تو وہ سپیروں کا روپ بھر کر تم پر حملہ آور ہو گئے۔

بھئی تمہاری بہن کی ماورائی قوتوں کے ہم بھی قائل ہو گئے ہیں......''

ٹھیک ہے یار و ٹھیک ہے۔ اب کیا یہیں کھڑے رہو گے؟ چلو گھر میں چلو......'' میں

حقیقتاً شادی مرگ کی کیفیت میں مبتلا ہو گیا تھا۔

"نہیں میجر۔ ہم تینوں اپنے انداز میں آپ کے گھر کی رکھوالی کریں گے اور یہ تینوں عورتیں سدرہ کی حفاظت کریں گی......"

"تو...... تو کیا اب بھی کوئی ...... کوئی خطرہ ہے؟......" میں فکر مند ہو گیا۔ "وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا میجر۔ ویسے آپ تو خطرات سے کھیلنے کے عادی ہو چکے ہیں۔"

"آں...... ہاں مگر اب میں سکون چاہتا ہوں دیجور۔ سدرہ کے ساتھ کمپنی کرنا چاہتا ہوں......"



رات بھر جاگنا پڑا۔ گاؤں والوں نے وہ وہ کرتب کئے، وہ وہ ڈانس کئے کہ میں ان کی محبتوں کو بھلا ہی نہیں سکتا۔

سولہ اپریل کی رات گزر گئی اور سترہ اپریل کا دن روشن ہو گیا۔ آج شام چھ بجے میرا نکاح تھا اور سدرہ ہمیشہ کے لئے میری ہونے والی تھی۔ میرے خالو کمال الدین، پھوپھا ریشم خان بڑی تندہی کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ مجھے کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ سارے انتظامات میرے دونوں بزرگوں نے سنبھال لئے تھے۔

اناج کا بہت بڑا ذخیرہ میرے گودام میں موجود تھا۔ گوشت وغیرہ کی بھی پریشانی نہیں ہوئی۔ بھیڑ بکریاں اور گائیں میرے اپنے باڑے کی تھیں۔

میں چونکہ رات بھر کا جاگا ہوا تھا اس لئے اپنے کمرے میں سونے کے لئے چلا گیا مگر عورتوں، بچوں کے شور اور ڈھول گانوں کی آوازیں میرے سر میں درد کر چکی تھی۔ لہٰذا میں ماموں اور پھوپھا کو مطلع کر کے اپنے باغ کی طرف روانہ ہو گیا۔

باغ میں میرا بہترین ڈاک بنگلہ بنا ہوا تھا۔ وہاں سکون ہی سکون تھا لہٰذا میں چند گھنٹے سکون کی نیند سو سکتا تھا۔

میں نے ناگن بہن کو بھی کچھ نہیں بتلایا اور سات منٹ بعد یعنی صبح دس بجے باغ والے ڈاک بنگلے میں پہنچ گیا۔ باغ کے چھ رکھوالوں اور ڈاک بنگلے کے چوکیدار نے میرے لئے

تمام سہولتیں مہیا کر دیں اور میں بے فکری کی نیند سو گیا۔

میں سو سکتا تھا سوتا ہی رہتا کہ ڈاک بنگلے کی صفائی پر مامور سادھنا نے مجھے جھنجھوڑ کر بیدار کر دیا۔

سادھنا اصل میں راموچاچا کی بیٹی تھی اور راموچاچا میرے دادا مرحوم کے دور سے ڈاک بنگلے کی چوکیداری کرتا تھا۔ وہ سادھنا کے ساتھ ڈاک بنگلے ہی کے سرونٹ کوارٹر میں رہتا تھا جب چوہدری نظام نے ہمارے ڈاک بنگلے پر قبضہ کر لیا تھا تو راموچاچا کو سادھنا سمیت سرونٹ کوارٹر سے نکال دیا گیا تھا۔ لیکن جب باغ پر میرا قبضہ ہوا تو میں نے راموچاچا کو دوبارہ ملازمت پر رکھ لیا تھا۔

''بابو جی۔ تن وج گئے نے۔ شام کو آپ کا نکاح ہے اور آپ سوئے ہوئے ہیں......''

''شکریہ سادھنا۔'' کہتے ہوئے میں اٹھ کھڑا ہوا۔

میں نے رسٹ واچ میں دیکھا واقعی تین بجنے والے تھے لیکن مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ مجھے جگانے کے لئے کوئی کیوں نہیں آیا تھا۔

''بابو جی......'' سادھنا میرے بستر کی چادر درست کرتی ہوئی بولی۔ میں جیسے ہی اس کی طرف گھوما' میرے جسم میں چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ وجہ یہ تھی کہ سادھنا کے سینے کے دونوں ابھار' جھکنے کی وجہ سے صاف نظر آ رہے تھے۔

ویسے بھی سادھنا نہ صرف جوان تھی بلکہ خوبصورت بھی تھی۔

''آپ کا خالہ زاد بھائی دو مرتبہ آ چکا ہے مگر آپ کو گہری نیند سوتا دیکھ کر چلا گیا۔ دوسری مرتبہ جاتے ہوئے اس نے مجھے تاکید کی تھی کہ تین بجے آپ کو......'' جملہ مکمل کئے بغیر سادھنا خاموش ہو گئی۔ مجھے اپنے سینے کی طرف تکتے پا کر اس کے چہرے پر قوسِ قزح کے رنگ بکھر گئے۔ وہ شرمگیں مسکراہٹ سے سیدھی ہو گئی اور چھوئی موئی کی طرح سمٹتی ہوئی جیسے ہی دوسری طرف دوڑی اس کی گھاگھر تپائی سے الجھ گئی اور وہ توازن برقرار نہ رکھنے کی بنا پر میرے ہی بستر پر الٹ گئی۔ الٹنے سے اس کے جسم کے کئی اور حصے ظاہر ہو گئے میں ایک آہ سرد سی بھر کر اسے سہارا دینے کے لئے جونہی جھکا' وہ تڑپ کر سیدھی ہو

گئی اور اپنی دونوں بانہیں میری گردن کے گرد لپیٹ دیں۔

"بابو جی ..." وہ پھنکتی آواز میں بولی۔ اس کا تپتا جسم بری طرح مچل رہا تھا۔ "آپ نے ...... میرا پورا جسم دیکھ لیا ہے۔ ویسے بھی آپ آج دولہا بن کر گھوڑی چڑھنے والے ہیں' میری آگ بھی بجھا دو یہ آگ تم ہی نے لگائی ہے ......" "سادھنا ......" میں اس کی چکنی بانہوں کو سہلاتے ہوئے اکھڑی ہوئی سانسوں کے درمیان بولا۔ "تو ...... تو بہت خوب صورت ہے ......" کہتے ہوئے میں جیسے ہی سادھنا کے ہونٹ چومنے کے لئے جھکا' سادھنا اذیت ناک کراہ کے ساتھ میرے نیچے سے چکنی مچھلی کی طرح نکل گئی۔

وہ نکلی ہی تھی کہ میرے ذہن پر ایک زوردار چھناکا ہوا۔ میں اس طرح چونک پڑا جیسے ڈراؤنا خواب دیکھ لیا ہو میرے دل و دماغ پر چھائے ہوئے تمام شیطانی خیالات حرف غلط کی طرح مٹ گئے۔

میں پھرکی کی طرح گھوما اور سادھنا کی ہیئت دیکھ کر میرا دل دھک سے ہو کر رہ گیا۔

وہ سادھنا نہیں بلکہ خوفناک و سیاہ چہرے اور لمبے لمبے نوکیلے دانتوں والی چڑیل تھی۔ اس کے مٹی سے گوندھے ہوئے بال اسی پراسرار نوجوان کی مٹھی میں جکڑے ہوئے تھے جس نے لاری والی چڑیل راجوڑی کو بے بس کیا تھا۔ اسے دیکھتے ہی میرے چہرے پر شرمندگی کے آثار چھا گئے۔

"آپ بے قصور ہیں وصی الدین صاحب۔ اس بدبخت نے آپ کو تنویمی گرفت میں لے رکھا تھا۔ غور سے دیکھئے' تین نہیں بلکہ دو بجنے والے ہیں۔ وہ شرفائیل تھا۔

میں نے رسٹ واچ میں دیکھا۔ واقعی دو بجنے میں ہنوز دس منٹ باقی تھے۔ قطع نظر اس کے کہ چڑیل شرفائیل کی گرفت میں کسی پرندے کی طرح پھڑپھڑا رہی تھی اس کے پھیلے ہوئے دہانے سے جھلسا دینے والی سانسیں نکل رہی تھیں' اس کے چہرے پر کچھ ایسی مکروہ جھریاں پڑی تھیں کہ میں جھرجھرا کر رہ گیا تھا۔

وہ اپنے دونوں ہاتھوں سے شرفائیل کی کلائی تھامے رہائی کی جدوجہد کر رہی تھی۔

"میں گنزا وغیرہ کے ساتھ ہی یہاں پہنچ گیا تھا ......" شرفائیل کہتا رہا۔ "میری یہی

ڈیوٹی ہے کہ کوئی چڑیل آپ پر غلبہ نہ پا سکے۔ جانے سے پہلے میری گزارش ذہن نشین کر لیں۔ کسی حالت میں بھی ہنٹر کو اپنی کمر سے الگ نہ کریں۔

ایک بات اور' یہ پروفیسر دمیراج اگھوری کی لے پالک دوسری چڑیل ہے اور مرگھٹ میں واقع برگد کے بوڑھے درخت پر اس کا ٹھکانہ تھا...... '' آخری لفظ کے ختم ہوتے ہی شرفائیل چڑیل سمیت میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

میں کف افسوس ملتے ہوئے باتھ روم کی طرف مڑ گیا۔ کف افسوس اس لئے کہ آج پھر میں اپنا ہنٹر لینا کیوں بھول گیا تھا۔

دس منٹ بعد جب میں باتھ روم سے نکلا تو کمرے میں میرے دونوں خالہ زاد بھائی' جو میرے بہنوئی بھی ہیں بیٹھے تھے۔ ان کے ساتھ راموچاچا اپنی بیٹی سادھنا کے ساتھ موجود تھا۔

''وصی بھائی۔ جلدی چلئے سارے مہمان آپ کے منتظر ہیں...... '' زمان خان علیک سلیک کے بغیر بول اٹھا۔

''بھئی میں بہت تھک گیا تھا اس لئے سوتا ہی رہا۔ اب بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں۔ کیسی ہو سادھنا...... '' جملے کے آخری لفظ میں نے سادھنا سے مخاطب ہو کر کہے۔

''ٹھیک ہوں باؤ جی۔ آپ واقع جلدی جائیے آپ کی بڑی بہن آپ کے لئے بہت پریشان تھیں...... ''

''تمہیں کیسے معلوم ہوا؟...... '' میں سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔

''میں وہیں سے آ رہی ہوں باؤ جی۔ سارے بھانڈے میں نے ہی مانجھے ہیں...... ''

''اوہ اچھا اچھا۔ چلو بھئی...... ''

ڈاک بنگلے میں جیپ موجود تھی۔ یہ میری اپنی جیپ تھی جسے میں خود ڈرائیو کرتا تھا۔ ہم جیپ میں سوار ہو گئے اور دس ہی منٹ میں میرے گھر پہنچ گئے۔ مجھ پر نظریں پڑتے ہی ناگن بہن دیوانہ وار میرے قریب آ گئی۔ ''روز بروز لاپرواہ ہوتے جا رہے ہو...... '' وہ میری بلائیں لیتی ہوئی بولی۔ ''کیا ہوا آپا۔ کوئی غلطی ہو گئی مجھ سے؟...... '' میں

لاپرواہی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔

"اے ہائے۔ اتنے بھولے نہیں ہو جتنے بن رہے ہو کیوں چھوڑا اپنا ہنٹر؟ اگر......اگر شر فائیل تمہاری مدد کو نہ پہنچتا تو کیا ہوتا تمہارا حشر؟......" "غلطی ہو گئی آپا معاف کر دو......" میں نے کان پکڑتے ہوئے کہا۔ "جانتے ہو نظام حویلی میں کیا ہوا ہے؟......" وہ میری پیشانی چومتے ہوئے بولی۔

نظام حویلی کے حوالے پر میں ذہنی طور پر جھنجھنا کر رہ گیا۔

"کیا ہوا آپا؟......" میں نے گھبرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"ابھی نہیں۔ جاؤ کھانا کھالو۔ تھوڑی ہی دیر میں نوشابہ اپنی سہیلیوں سمیت تمہارے نکاح کا جوڑا اور سہرا لے کر پہنچنے والی ہے۔ اسی سے سب کچھ پوچھ لینا۔ ویسے گھبرانے والی بات نہیں ہے۔ گنزا' صابرہ اور جمائمہ نے اسے ختم کر دیا ہے......"

ناگن بہن تو اتنا کہنے کے بعد میرے لئے کھانا لینے چلی گئی جب کہ میں مبہوت سا بنا کمرے کی فضاؤں میں گھورتا رہ گیا۔



مجھ پر باہر نکلنے کی پابندی عائد کر دی گئی اور یہ پابندی میرے خالو اور میرے پھوپھا پھوپھی کی طرف سے عائد کی گئی تھی۔

چار بجے کے قریب نوشابہ ڈھیر ساری عورتوں سمیت میرا سہرا اور نکاح کا لباس لے کر پہنچ گئی۔

میرا پورا مکان نقرئی قہقہوں سے گونجنے لگا۔ بھانت بھانت کی زنانی آوازوں کے شور میں کان پڑے آواز بھی سنائی نہیں دے رہی تھی۔ ڈھول پٹتے رہے' نغمے گونجتے رہے اور پائل کھنکتی رہی۔ رنگ و نور کی بارش سی ہو رہی تھی۔ ہر عورت' بھڑکدار اور خوشبوؤں میں بسا ہوا لباس پہنے ہوئے تھی۔

بدقت تمام مجھے نوشابہ سے تنہائی میں گفتگو کرنے کا موقع مل گیا۔ تنہائی سے مراد غیر متعلق عورتیں ہیں ورنہ ناگن بہن سمیت میری دونوں بہنیں بھی موجود تھیں۔

"نوشابہ بھابھی۔ مجھے بتاؤ' بتاؤ حویلی میں کیا ہوا تھا' سدرہ کو کوئی نقصان تو نہیں پہنچا؟......" میں نے شدید اضطراب سے پوچھا۔

"اوہ......" نوشابہ کا چہرہ فرط خوف سے زرد پڑ گیا۔

"آپ کو...... آپ کو کیسے پتہ چلا؟......" وہ سرسراتی آواز میں بولی۔

"بس چل گیا پتہ کسی نہ کسی طرح تم صرف یہ بتلاؤ کہ ہوا کیا تھا؟......"

"وہ...... وہ بہرام بھائی تھے......" نوشابہ سرسراتی آواز میں بولی۔ "بہرام...... وہ تو مر چکا ہے اس کا ماس کتے کھا چکے تھے' میں نے خود اپنے ہاتھوں سے اسے دفن کیا تھا......

"یہی تو خوفزدہ کر دینے والی بات ہے میں اپنی سہیلیوں کے ساتھ سدرہ کے کمرے میں بیٹھی کھانا کھا رہی تھی کہ اچانک ایک زوردار کڑاکا ہوا۔ ہم سب چونک کر سماعت شکن کڑاکے کی طرف متوجہ ہو گئیں اور یہ دیکھ کر ہماری گویا جان ہی نکل گئی کہ دیوار توڑ کر بہرام بھائی نمودار ہوئے ہیں۔ وہ سر سے پیروں تک سیاہ لباس پہنے تھے۔ ان کی آنکھیں آگ و خون کا ملا جلا تاثر تھیں۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ان کا منہ کھلا تھا اوپر کے دونوں دانت سانپ کے دانتوں کی طرح مڑے ہوئے تھے جن سے ٹپ ٹپ خون کے قطرے ٹپک رہے تھے۔

"میرے دشمن سے شادی کر رہی ہو؟......" وہ پھٹی ہوئی غیر انسانی آواز میں بولے۔

"ویرا۔ ان کی آواز اور لہجہ اس کے ساتھ ہی ان کی شکل اس قدر ڈراؤنی تھی کہ میری سب ہی سہیلیاں بے ہوش ہو گئیں' مجھ پر سکتہ سا طاری ہو گیا۔ میں صرف دیکھ رہی تھی اور سن رہی تھی۔ باقی کچھ بھی نہ تھا۔ مانتی ہوں ویرا۔ سدرہ بہادر لڑکی ہے۔ وہ بہرام کے بھوت کو دیکھ کر نہ تو خوف زدہ ہوئی اور نہ گھبرائی بلکہ لمبا سا خنجر نیام سے کھینچ کر بہرام سے بھڑ جانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئی۔

"وہ تیرا دشمن ہو گا بہرام مگر میرا اسجل ہے' ہاں میں اسی کی بیوی بن رہی ہوں......"

بہرام نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ اس کی ہیبت ناکی میں کئی گنا اضافہ ہو گیا وہ بڑے ہی بھیانک انداز میں سدرہ کی طرف بڑھا اور سدرہ بھی خنجر تھام کر بھوکی شیرنی کی طرح

اس کے سامنے ڈٹ گئی۔

پھر اس سے پہلے کہ وہ سدرہ کے قریب پہنچ پاتا' اچانک ہی کمرے میں بجلی کے تین کڑاکے ہوئے۔ میں نے دیکھا' کئی فٹ لمبی اور بال برابر تین بجلیاں بہرام پر جھپٹ پڑی ہیں' ایک بجلی بہرام کی گردن کے گرد لپٹ گئی اور اس کا سر کٹ کر فرش پر جا گرا۔

باقی دو بجلیاں بہرام کی کمر اور ٹانگوں سے لپٹ پڑیں۔ اب صورت حال یہ تھی بہرام کا پورا وجود باریک ذرات میں بدل گیا اور پھر وہ ذرات بھی آن واحد میں غائب ہو گئے اس کے بعد تینوں بجلیاں بے ہوش ہو جانے والی لڑکیوں کا طواف کرتی ہوئی غائب ہو گئیں۔

"دیکھا نوشابہ آپا......" سدرہ مجھ سے فخریہ لہجے میں بولی۔ "میرے سر داسائیں کتنا حوصلہ مند ہے گا۔ ان کے پیچھے غیبی قوتوں کا ہاتھ ہے۔ وہی غیبی قوتیں میری بھی حفاظت کر رہی ہیں......" سدرہ کے یہ الفاظ میں نے بہ ہوش و حواس سنے۔ ساری لڑکیاں ہوش میں آچکی تھیں' کسی کو یاد نہ رہا کہ ان پر کیا گزری۔ کمرے کی دیوار بھی اپنی اصلی حالت میں تھی۔"



پانچ بجے مجھے گھوڑے پر سوار کر دیا گیا۔ میں نے صرف سہرا باندھنے سے انکار کر دیا تھا۔ شاید اس لئے کہ مجھے یہ رسم فرسودہ لگتی تھی۔ میرے گھوڑے کی لگام میری ناگن بہن نے پکڑ رکھی تھی۔ وہ بہت خوش تھی' اس قدر خوش کہ میں نے اس سے پہلے اتنا خوش اسے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

فرط مسرت سے بے قابو ہو کر وہ میری بارات کے سینکڑوں مردوں کی پرواہ کئے بغیر رقص کرتی رہی۔ میرے دونوں بہنوئی اور بہت سے دوسرے لوگ بھی رقص میں اس کا بھرپور ساتھ دے رہے تھے مگر میں بلا مبالغہ کہہ سکتا ہوں کہ ناگن بہن کے رقص نے مجھے بھی مدہوش کر دیا تھا۔ کم از کم میں نے بلکہ چشم تصور نے بھی ایسا ہیجان انگیز رقص نہیں دیکھا تھا۔

رقص کے ساتھ ہی وہ سکوں کی بارش سی برسائے ہوئے تھی۔ اس وقت میں نے یہ

سوچنے کی زحمت بھی محسوس نہیں کی کہ اس کے پاس اس قدر ریزگاری کہاں سے آرہی ہے۔

باراتیوں کا ایک ہجوم سا تھا۔ ڈھول باجوں اور شہنائیوں کی گونج نے پورے گاؤں کو محو رقص کر رکھا تھا۔ ہجوم کا یہ عالم تھا کہ دس منٹ کا راستہ ایک گھنٹے میں طے ہوا۔

نظام حویلی میں تمام تیاریاں مکمل تھیں۔ میرے پہنچتے ہی نکاح شروع ہو گیا۔ نکاح کے بعد کئی من شیرینی تقسیم ہوئی اور پھر مغرب ہوتے ہوتے شامیانے خالی ہو گئے۔ گنتی کے چند مرد جو میرے عزیز و قرابت دار تھے باقی رہ گئے۔

عشاء تک دیگر رسومات ہوتی رہیں اور پھر سدرہ کو ڈولی میں بٹھادیا گیا۔ ڈولی کو میرے ہی خالہ زاد اور پھوپھازاد کندھوں پر اٹھائے میرے گھر تک پہنچ گئے۔

دلہن کو میری بہنوں اور دیگر عورتوں نے گھیرا ہوا تھا اور مجھے میرے بھائیوں اور دوستوں نے ڈیوڑھی میں گھیر رکھا تھا۔

تقریباً رات کے بارہ بجے میں حجلہ عروسی میں داخل ہوا سامنے ہی سیج پر سرخ لباس میں ملبوس گھونگھٹ کئے میری سدرہ سکڑی سمٹی بیٹھی تھی۔ مجھے چٹخنی لگاتے دیکھ کر سیج پر بیٹھے بیٹھے کسمسائی۔

رعب حسن و جمال سے میں اس قدر متاثر ہو رہا تھا کہ میرے قدم ڈگمگانے لگے۔ میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہونے لگیں اور سانس لوہار کی دھونکنی سی بن گئی۔

جوں توں میں نے پگڑی اتاری' ہاروں کے بلندے اتارے اور شیروانی اتار کر سیج پر پہنچ گیا۔

"سدرہ۔ میری روح' جان حیات۔ میں نے تمہارا بہت انتظار کیا ہے......" گھسے پٹے رسمی جملے ادا کرتے ہوئے میں نے سدرہ کا مرمریں ہاتھ تھام لیا اور اس کی انگلی میں ہیرے کی انگوٹھی پہنادی "حجاب و شرم کا دور اس سیج پر ختم ہو جاتا ہے سدرہ۔ گھونگھٹ کی اب کوئی ضرورت نہیں ہے......" کہتے ہوئے میں نے گھونگھٹ اٹھانے کے لئے ہاتھ بڑھائے ہی تھے کہ اچانک بیرون کمرہ میں عورتوں اور مردوں کی ملی جلی آوازوں کا شور سا

گونج اٹھا۔

کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ شور کیسا ہے' شور مچانے والے کیا کہہ رہے ہیں۔

''رک کیوں گئے سرتاج' گھونگھٹ اٹھائیے۔ میں بھی آپ ہی کی طرح وصل کی آگ میں جل رہی ہوں...

سدرہ کی رس گھولتی آواز نے مجھے مدہوش کر دیا۔ جونہی میں نے سدرہ کا گھونگھٹ تھاما' دروازہ پیٹنے کی آوازیں گونج اٹھیں اس کے ساتھ ہی میری بہنوں کی آوازیں بھی گونجنے لگیں۔

''لالا دروازہ کھولو وہ سدرہ نہیں' سدرہ بھابھی ہمارے......'' میں اتنا ہی سن پایا تھا کہ دلہن نے اپنا نقاب خود الٹ دیا۔

بے ساختہ میرے لبوں سے ایک دردناک کراہ نکل گئی' میرا دل اچھل کر میرے حلق میں آٹکا۔ میرے ذہن پر گویا ہتھوڑے سے برسنے لگے تھے۔ وہ بے انتہا حسین تھی' مگر سدرہ نہیں تھی۔ اس کی کٹورے نما آنکھوں سے دو برقیں سی نکل کر میرے دل و دماغ کو سرسرانے لگیں وہ اس طرح ہانپ رہی تھی جیسے سائیکل ٹیوب سے ہوا نکلتی ہے۔ اس کے یاقوتی لبوں پر انتہائی خونخوار مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ وہ یقیناً مجھے ہپناٹائز کر رہی تھی مگر میری کمر کے گرد لپٹے ہوئے پردہ غیب سے ملے ہوئے ہنٹر کی کرشمہ سازی کے باعث میرے دل و دماغ پر کنٹرول نہ پا سکی چٹاخ سے میں نے اس کے گال پر زوردار تھپڑ رسید کر دیا۔ ''ایہہ خاخاخا......'' وہ روح فنا کر دینے والی کریہہ آواز میں ہنسی۔ ''تو...... آج میرے ہاتھوں سے نہیں بچ سکے گا......'' کہتے ہوئے وہ سیج سے اس طرح اتری جیسے کوئی طیارہ زمین پر لینڈ کرتا ہے۔

اس دروازہ میں دوران تک پہنچ چکا تھا بلکہ کنڈی بھی کھول چکا تھا۔

کھٹاک سے دروازہ کھلا اور آن واحد میں بند ہو گیا۔ اندر آنے والی شخصیت گنزا کی تھی۔

وہ گنزا جو ہمیشہ مجسم نور بن کر میرے سامنے آ رہی تھی۔ اس وقت وہ سراپا شعلہ

جو لا بنی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں ‘ چہرے کے خدوخال اس قدر بھیانک تھے کہ میرے وجود میں خوف کی پھریریاں سی رینگ گئیں۔

"چلی جاؤ گنزا ......" ملکوتی حسن و جمال رکھنے والی دلہن ابلتے لہجے میں بولی۔

"میرا حصار توڑ کر تم اندر تو آچکی ہو مگر زندہ باہر نہیں جاسکو گی۔ سنو تم بھی آتشی ہو اور میں بھی آتشی ہوں۔ تمہارا میرا کوئی جھگڑا نہیں ہے اس نے ......" وہ میری طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ "میرے کنبے کے بہت سے جنات کو مارا ہے۔ میں اسے کسی حالت میں نہیں چھوڑوں گی ......"

"پرے ہٹ جاؤ گنزا ......" یک بیک ہنٹر پر گرفت مضبوط کر کے میں آگے بڑھا۔ "آج یہ مٹے گی یا میں مٹ جاؤں گا ......"

"نہیں صاحب جی۔ یہ آپ کی زندگی پر آخری حملہ ہے اسے میں ہی مٹا سکتی ہوں ......" کہنے کے ساتھ ہی گنزا آگ کا مجسمہ بن گئی اور کمان سے نکلے ہوئے تیر کی طرح آتشی دلہن سے ٹکرا گئی۔

آتشی دلہن پہلے ہی آگ کا مجسمہ بن چکی تھی۔ دونوں گڈمڈ ہو کر فرش پر گریں اور لوٹ پوٹ ہونے لگیں۔ حجلہ عروسی میں ایسی آوازیں گونجنے لگیں جیسے بجلیاں کڑک رہی ہوں۔

باہر سے اب کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ جو کچھ بھی طوفان بپا تھا وہ اندرون کمرہ تھا۔ چنگاریاں کوندتی رہیں۔ کڑاکے ہوتے رہے اور میں ہنٹر پر گرفت مضبوط کیے ادھر سے ادھر اچھلتا رہا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کس پر ضرب لگاؤں۔

پندرہ منٹ تک یہ کھیل جاری رہا۔ سولہویں منٹ کے شروع ہوتے ہی آگ کا ایک وجود کھولتے ہوئے لاوے میں بدلنے لگا جب کہ دوسرا وجود انسانوں کی طرح کھڑا ہو کر سنہرے غبار کا روپ دھارنے لگا۔

دیکھتے ہی دیکھتے گنزا کا سراپا مکمل ہو گیا۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ تھکے تھکے انداز میں۔

"صاحب جی۔ آپ پر یہ آتشی مخلوق کا آخری حملہ تھا۔ آتشی مخلوق میں سے اب آپ کا

کوئی دشمن باقی نہیں رہا..... "گنزا فاتحانہ لہجے میں بولی۔

"لیکن گنزا یہ سب کچھ کیسے ہوا؟..... "

"بڑی آسانی سے صاحب جی۔ اس بدبخت نے سدرہ کو ہپناٹائز کر کے ڈریسنگ روم میں بند کر دیا تھا اور خود دلہن کا روپ دھار کر بیٹھ گئی تھی..... "

"تو کیا تم کو اور ناگن بہن کو بھی پتہ نہ چل سکا تھا؟..... "

"ہمیں پتہ تھا صاحب جی۔ اگر ہم اسے وہیں گھیر لیتے تو حالات آپ کے حق میں نہ رہتے۔ گاؤں کی عورتیں اور مرد آپ کو جادوگر سمجھ کر آپ سے نفرت کرنے لگتے' پورے گاؤں میں بلکہ پورے علاقے میں وہی خوف وہراس پھیل جاتا جو چوہدری نظام اور اس کے بیٹوں نے قائم کیا ہوا تھا' جس کے مٹانے کے لئے آپ نے اپنی زندگی داؤ پر لگائی ہوئی تھی۔ "" لیکن گنزا' یہی خوف وہراس میرے ان تمام عزیزوں میں بھی تو پھیل چکا ہوگا جو اس وقت میرے گھر میں موجود ہیں؟..... "

"ہاں۔ جب میں تمہاری ناگن بہن اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ سدرہ کو لے کر یہاں پہنچی ہوں' اس وقت واقعی سب انگشت بدنداں اور خوفزدہ ہو گئے تھے مگر دیجور وغیرہ نے ہر ایک کے ذہن پر فوری طور پر مصنوعی نیند سوار کر دی اور ان کے برین واش کر دیئے ہیں۔ اب سوائے سدرہ اور تمہاری ناگن بہن کے کسی کو معلوم نہیں ہو سکے گا کہ یہاں کوئی گڑبڑ بھی ہوئی تھی..... "

"گنزا میں..... میں کس طرح تمہارا شکریہ ادا کروں؟..... "

"بہت ہی آسان سا طریقہ ہے صاحب جی۔ فرش پر پڑی ہوئی اپنی ہیرے کی انگوٹھی اٹھاؤ' برابر والے کمرے میں جاؤ' سدرہ کو گود میں اٹھاؤ اور یہاں حجلہ عروسی میں لاکر زندگی کا لطف اٹھاؤ..... اس طرح آپ میرا شکریہ ادا کر سکیں گے..... "



حقیقتاً صبح کو کسی کو کچھ پتہ نہ چل سکا کہ گزشتہ شب کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش آیا تھا۔ وہی قہقہے' وہی خوشیاں اور وہی مسرتیں میرے گھر کے کونے کھدرے سے اٹھ رہی تھیں

مار رہی تھیں جو پہلے دن سے شروع ہوئی تھیں۔ سدرہ غسل سے فارغ ہو چکی تھی۔ میری تینوں بہنیں اسے سنوارنے میں مصروف تھیں۔

میں جب بھی سدرہ کی طرف دیکھتا' وہ چھوئی موئی کی طرح سمٹ جاتی اس کے چہرے پر قوس قزح کے رنگ بکھر جاتے۔

چونکہ میں پہلے ہی تیار ہو چکا تھا اس لئے چوہدرائن کی طرف سے بھیجے ہوئے ناشتے پر ٹوٹ پڑا۔

"ویرا......" ناگن بہن شریری مسکراہٹ سے بولی۔

"بہت ہی ندیدے ہو۔ ارے بھئی دلہن کا تو انتظار کیا ہوتا......"

"نہیں آپا۔ میں نے جو ناشتہ اسے رات کروایا ہے' وہی اس کے لئے کافی ہے......"

میرا کہنا ہی تھا کہ سدرہ دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ کر ناگن بہن کے سینے سے لپٹ گئی۔

"چل ہٹ بے شرم۔ راز کی باتیں بھی کوئی ظاہر کی جاتی ہیں......" ناگن بہن کے الفاظ نے سونے پہ سہاگہ جما دیا۔

"آپا...... آپ بھی؟......" سدرہ فرط حیا سے ناگن بہن کے دوپٹے میں سمٹ گئی۔ اٹھکیلیاں ہوتی رہیں اور میں ناشتے سے فارغ ہو کر حجلہ عروسی سے نکل گیا۔

ڈیوڑھی پر دیگر لوگوں کے ساتھ چھ بندے اور بھی میرے منتظر تھے تین انگریز عورتیں اور ہڈسن سمیت تین انگریز مرد۔ انہیں دیکھتے ہی میں اداس ہو گیا۔

"ویل میجر۔ اب ہم رخصت ہوتے ہیں۔ اب ہم چووہ سیدن شاہ بھی نہیں جائیں گے بلکہ ہماری منزل آپ کی سوچ سے بھی دور ہے......" ہڈسن کے بہروپ میں دیجور بولا۔

بادل ناخواستہ میں ہر ایک سے گلے ملا۔ جیپ اسٹارٹ کرتے وقت ہڈسن نے صرف اتنا کہا۔

"میجر۔ اسٹور میں' جہاں آپ کو ملنے والے تحائف کا ڈھیر پڑا ہے' دو صندوق سرخ اور آتشی رنگ کے رکھے ہیں۔ سرخ صندوق ان خواتین نے آپ کی بیگم کو تحفے میں دیا ہے

اور آتشی صندوق آپ کے لیئے ہے......

جیپ چل دی' میں مبہوت سا ماما اس وقت تک جیپ کو گرد و غبار میں ڈوبتے ہوئے دیکھتا رہا' جب تک وہ نظروں سے بالکل اوجھل نہ ہو گئی۔

☆☆☆

میری آپ بیتی پڑھنے والے معزز دوستو۔ میری آزمائش کی گھڑیاں ختم ہو گئیں۔

میری شادی کے ایک ہفتے کے بعد چوہدرائن بھی انتقال کر گئیں۔ آتشی مخلوق کی طرف سے ملنے والے دونوں صندوق جب میں نے اور سدرہ نے کھولے تو ہماری آنکھیں چندھیا کر رہ گئیں۔ ایک صندوق میں دنیا کے قیمتی ترین جواہرات تھے تو دوسرے میں دس دس تولے سونے کے بسکٹ بھرے ہوئے تھے۔

ناگن بہن کا عطا کیا ہوا تحفہ ناگ منی کی صورت میں آج بھی میرے بڑے بیٹے وجیہہ الدین چغتائی کے گلے میں محفوظ ہے۔ پاکستان بن چکا تھا۔ بائیس نومبر سن اڑتالیس میں میرے گھر میں وجیہہ الدین چغتائی نے جنم لیا۔

پندرہ برس کے اندر مجھے اللہ تعالیٰ نے سدرہ کے بطن سے چار بیٹے اور دو بیٹیاں عطا کیں۔

چوہدری نظام کے پوتے بھی پڑھ لکھ کر گورنمنٹ کے اہم عہدوں پر فائز ہو گئے تھے۔ وہ میری بے انتہا عزت کرتے ہیں۔ میرا ہر حکم ماننے کو اپنا ایمان سمجھتے ہیں۔

میں نے گاؤں ہی میں اوپر تلے اٹھارہ کمروں پر مشتمل حویلی بنوالی ہے۔ کئی کنویں کھدوائے' خیراتی اسپتال بنوائے' مدرسے قائم کئے' مسجدیں' مندر اور گرجا بنوائے۔

قارئین۔ وصی الدین چغتائی تراسی برس کی عمر میں دار فانی سے کوچ کر گئے۔ ان کی رفیقہ حیات ستر برس کی عمر میں انتقال کر گئی تھیں۔

میری آپ بیتی پڑھنے والے دوستو، میری آزمائش کی گھڑیاں ختم ہو گئیں میری شادی کے ایک ہفتہ بعد چودھرائن بھی انتقال کر گئیں.... اس کے بعد کا میٹر درج ذیل ہے.....

میری رفیقہ حیات سدرہ بہت اداس ہو گئی۔ اس کی تمام شوخیاں اور قہقہے رخصت ہو گئے۔ میں نے اور ناگن بہن نے اسے قرآن و حدیث کی روشنی میں بہت کچھ سمجھایا اور تسلی و تشفی دیتے ہوئے اسے بڑی حویلی لے گئے۔ خود میرا یہ عالم تھا کہ میرے کوشش کے باوجود آنسو نہ رک سکے۔ مجھے یوں لگا کہ میری ماں کی موت اب واقع ہوئی ہے۔

حویلی کے سامنے بہت سے لمبے چوڑے شامیانے لگوائے گئے۔ چودھرائن کی موت کی اطلاع جنگل کی آگ کی طرح ہر طرف پھیل چکی تھی۔ چودہ سیدن شاہ سے چکوال تک کے چھوٹے بڑے زمیندار اپنی بیگمات سمیت جمع ہونے شروع ہو چکے تھے۔ میرے تمام عزیز و اقربا بھی جمع ہو گئے۔ شام سات بجے جب چودھرائن کو ان کے آبائی قبرستان میں دفن کیا گیا تو پورا قبرستان انسانوں سے بھرا ہوا تھا۔ نماز جنازہ میں ہزاروں افراد شریک ہوئے تھے۔

سوئم کے بعد لوگوں کی روانگی کا عمل شروع ہو گیا۔ لیکن میں اور سلطان بھائی دسویں تک نظام حویلی ہی میں ٹکے رہے تھے۔

دسواں ختم ہونے کے بعد گیارہویں دن کی صبح جب میں بھی سدرہ سمیت اپنی حویلی کی طرف جانے کے لئے تیار ہوا تو ناگن بہن سدرہ کے ساتھ کہیں بھی نظر نہ آئی۔

"سدرہ.... آپا کہاں ہے...." میں نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

"پتہ نہیں وصی، میں نے تو تین یوم سے انہیں نہیں دیکھا۔ میں تو یہی سمجھ رہی تھی کہ وہ آپ ہی کے ساتھ ہو گی...."

"اوہ سدرہ۔ تم نے.... تم نے مجھے پہلے ہی کیوں نہیں بتلایا، مجھ سے آپا کے متعلق پوچھا تک نہیں...."

"میں شرمندہ ہوں وصی۔ دراصل میں غم سے اس قدر نڈھال تھی کہ مجھے اپنا ہوش بھی نہیں رہا تھا۔ دیکھئے ناں، روز اول سے آج تک ایک ہی لباس میں ہوں۔ ہر وقت اماں

کی روح کو ثواب بخشنے کے لئے قرآن کریم ہی پڑھتی رہی ہوں۔"

"لوہ۔لوہ سدرہ...." میں بے چینی سے تلملا تارہ گیا۔

"آؤ.... جیپ میں بیٹھو۔آج میں تمہیں ایک ایسا راز بتلاؤں گا جسے سن کر تم پر سکتہ سوار ہو جائے گا....."

میں نے سدرہ کو جیپ میں سوار کر دیا اور سلطان بھائی کو ضروری ہدایات دینے کے بعد ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔

"وہ.... وہ عورت نہیں بلکہ ناگن ہے سدرہ...." جیپ کو کھیتوں کے درمیان پہنچانے کے بعد میں نے سدرہ سے کہا۔

"کیا...."سدرہ چلا پڑی۔

"آہستہ سدرہ آہستہ۔ کھیتوں میں بہت سے مرد عورتیں بھی موجود ہیں۔ ہاں وہ ناگن ہے...." کہتے ہوئے میں نے اسے وہ تمام واقعات بتلادیئے جن سے ناگن بہن میری ہمو الن گئی تھی۔

"میں تمہیں کیا کیا بتلاؤں سدرہ۔ انہوں نے بالکل سگی ماں کی طرح مجھے پیار دیا، مجھے سنبھالا اور میری مدد کرتی رہیں۔

خیر ہٹاؤ ان باتوں کو، پھر کسی وقت تمہیں تفصیل بتلادوں گا۔ پہلے میرے چند سوالوں کے جواب دو....."

"آپ پوچھئے....۔"

"آخری بار تم نے آپا کو کب اور کہاں دیکھا تھا....۔"

"آج سے تین روز پہلے۔ عزت خان کی بیوی کے ساتھ....۔"

"عزت خان۔ کون ہے یہ عزت خان...."

"ہمارے پنڈ اور چودہ سیدن شاہ کے درمیان ایک چھوٹے سے گاؤں کا زمیندار ہے...."

"اس کی بیوی کا نام کیا ہے...."

"ریشماں.... ایک خانہ بدوش عورت تھی۔ عزت خان نے اس سے عشقیہ

شادی کی تھی۔ خوبصورت تو زیادہ نہیں ہے مگر اس کے نقوش اور اس کا جسم اور اس کا رقص اس قدر پیارا ہے کہ دیکھتے ہی رہو....."

سدرہ کے انکشاف نے میرے رگ و ریشے میں بے چینیاں سی دوڑا کر رکھ دیں میرے ذہن پر بھک بھک کی آوازیں سی اٹھنے لگیں۔

حویلی تک پہنچتے پہنچتے میں نے سدرہ سے اور بھی بہت کچھ معلوم کر لیا۔ میری بہنیں اپنے اپنے شوہر کے ساتھ میری ہی حویلی میں ٹھہری ہوئی تھیں۔ سدرہ نے میری بے قراری کو شدت سے محسوس کر لیا تھا۔ اس نے جب مجھے کچھ رقم، ہنٹر وغیرہ اٹھاتے ہوئے دیکھا تو.....

"کیا بات ہے وصی الدین۔ کہاں جا رہے ہیں آپ...." غمزدہ لہجے میں پوچھا۔

"تم نہیں سمجھ سکو گی سدرہ۔ وہ، وہ میری بہن ہے، میری نظروں کے سامنے مر جاتی تو مجھے دکھ نہ ہوتا، وہ.... وہ یقیناً سپیروں کی قید میں ہے۔ اللہ کے حکم سے جب تک میں اسے رہائی نہیں دلوا دیتا، ہر قسم کا سکھ چین مجھ پر حرام ہے۔

میں جا رہا ہوں، اللہ کے حکم سے اپنی بہن ہی کے ساتھ واپس آؤں گا...."



ایک بجے تک میں عزت خان کے گاؤں پہنچ گیا۔ بہت سے لوگ مجھے جانتے تھے، میزبانی کے لئے بھی بے چین تھے، لیکن میرے دل و دماغ پر جو آندھیاں چل رہی تھیں وہ اس سے بے خبر تھے۔

کسی نہ کسی طرح عزت خان کو بھی میری آمد کی اطلاع ہو گئی۔ وہ فوراً اپنے چند بندوں سمیت مجھ سے آن ملا اور عاجزانہ منت و سماجت کے بعد مجھے اپنی حویلی میں لے گیا۔ میری خوب طرح خاطر مدارت کی اور جب ہم دونوں تنہا ہوئے تو.....

"عزت خان۔ تہاڈی فیملی دی ہر زنانی مجھ سے مل لی لیکن بھاہی ریشماں کہیں نظر نہیں آئی....."

"وہ.... وہ تو چوہدری نظام ہی کی حویلی میں ہو گی۔ آپ کی بہن سے اس کی پکی دوستی ہو گئی ہے ناں۔ کہہ رہی تھی چہلم کر کے ہی لوٹے گی....."

ایک بار پھر میرے ذہن پر بڑی زور کا چھناکہ ہوا۔ سدرہ نے مجھے بتلایا تھا کہ ریشماں چودھرائن کی وفات کے پانچوں روز نظام حویلی سے چلی گئی تھی۔

"برا نہ منانا عزت خان۔ کیاآپ بتلا سکتے ہیں کہ ریشماں کے عزیز و اقارب کہاں رہتے ہیں...."

"اس میں برا منانے والی کیابات ہے۔ دراصل ریشماں کے والدین کا کوئی مستقل ٹھکانہ تو ہوتا نہیں ہے، وہ سپیرے ہیں اور سانپوں کی تلاش میں گاؤں گاؤں، قریہ قریہ پھرتے رہتے ہیں۔ اس کے باوجود ڈھوک ٹالیاں کے جنوب مشرق میں ایک نیم پہاڑی علاقہ ہے۔ سپیراں دی بستی کے نام سے مشہور ہے۔ پچاس ساٹھ ہی کچے مکانوں پر مشتمل ہے۔ چونکہ تاحال بہار کا موسم چل رہا ہے، ہوسکتا ہے وہ بستی میں ہی ہوں۔ مئی کا مہینہ شروع ہوتے ہی وہ جنگلوں، پہاڑوں اور ریگستانوں کی طرف چل دیتے ہیں۔ خیریت تو ہے چغتائی صاحب...."

"آں.... ہاں، میرے گاؤں میں ایک جوان کو سانپ نے ڈس لیا ہے، اسی لئے مجھے سپیروں کی تلاش ہے...." میں نے بات بناتے ہوئے کہا۔

"تو اس میں پریشانی کی کیابات ہے۔ تیری بھرجائی ریشماں نظام حویلی ہی میں موجود ہے، اسے لے جاؤ۔

بہت ہی ماہر ہے میری ریشماں۔ اک واری میں نوں وی سپ نے ڈس لیتا سی۔ ریشماں نے پورا زہر چوس کر تھوک دیا۔ اس کے پاس آفاقی علم بھی ہے، وہ نہ جانے کیا پڑھ پڑھ کر پھونکتی ہے کہ سانپ اس کے حصار سے نکل ہی نہیں پاتا۔

جس دن چودھرائن کا سوئم تھا، اسی روز اس نے مجھے بتلایا تھا کہ ہم بہت جلد مالا مال ہونے والے ہیں۔ کیونکہ اس نے کسی شیش ناگ یا ناگن کو اپنے علم میں جکڑ لیا تھا...."

"اوہ.... تو پھر.... تو پھر.... خیر جی ہٹاؤ ان باتوں کو۔ یہ بتلاؤ کہ تم سے شادی سے قبل ریشماں کسی اور شخص سے منسوب تو نہیں تھی...."

"ہاں تھی تو۔ لیکن یہ سب....آپ کیوں پوچھ رہے ہیں...." عزت خان کے چہرے پر پہلی مرتبہ تشویش کے سائے لہرانے لگے تھے۔

"بتلادوں گا عزت خان بتلادوں گا۔ پہلے وہی کچھ بتلاؤ جو میں پوچھ رہا ہوں...."

"وہ۔ اس کا چچازاد تھا۔ شرفو کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ وہی اس کا منگیتر تھا۔ لیکن ریشماں کے باپ نے دس ہزار کے لالچ میں ریشماں کو میرے ساتھ بیاہ دیا تھا۔ لہٰذا شرفو اپنی برادری سے کٹ گیا۔ وہ کہاں گیا زندہ بھی ہے یا مر گیا کسی کو پتہ نہیں ہے۔ نہ ہی کسی نے پتا کرنے کی کوشش کی تھی...."

"ریشماں نظام حویلی میں نہیں ہے عزت خان...."

"کیا...." وہ چیخ پڑا۔ اس کے چہرے کی تمام سرخی غائب ہو گئی۔

"ہاں عزت خان۔ میری بیوی نے مجھے بتلایا تھا کہ ایک لمبا تڑنگا جوان ریشماں سے ملنے نظام حویلی پہنچا تھا۔ اسے دیکھ کر ریشماں بہت ہی غضبناک بھی ہو گئی تھی۔ دوسرے روز سے ریشماں بھی حویلی سے غائب ہو گئی...."

عزت خان بھوکے بھیڑیئے کی طرح غراتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے چہرے پر ایک سے ایک رنگ آ آکر گزرتا رہا۔ لیکن وہ منہ سے کچھ بھی نہ بول سکا۔

"عزت خان...." میں بھی اٹھ کھڑا ہوا اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

"مجھے لگتا ہے ریشماں کو کسی نہ کسی طرح شرفو نے اغواء کر لیا ہے۔ میں جا رہا ہوں، اس وعدے کے ساتھ اگر ریشماں زندہ ہوئی تو اسے تم تک ضرور پہنچاؤں گا۔ اللہ بیلی...." کہتے ہوئے میں عزت خان کی حویلی سے روانہ ہو گیا۔ اور جب میری جیپ گاؤں سے باہر مین روڈ پر پہنچی تو میں نے جیپ کا رخ چودہ سیدن شاہ کی طرف کر دیا۔

چودہ سیدن شاہ اصل میں سادات خاندان کی وجہ سے مشہور ہے۔ یہاں پر ایک چٹان پر سیدن شاہ بابا کی درگاہ بھی ہے۔ دور دور سے لوگ آتے رہتے ہیں۔ درگاہ پر میلے کا سماں بندھا رہتا ہے۔

نصف گھنٹے کی تیز رفتاری کے بعد جب میں سیدن شاہ بابا کی درگاہ پر پہنچا تو میرا دماغ چھنک رہا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں ناگن بہن کو کہاں تلاش کروں۔ اس بات کا تو مجھے یقین تھا کہ ناگن بہن کو ریشماں ہی نے پھانسا ہے۔ اگر اس نے عزت خان کے

پاس پہنچنا ہوتا تو کب کی پہنچ چکی ہوتی۔ اگر وہ واقعی شرفو کے ہتھے چڑھ گئی ہے تو..... شرفو کہاں ہے۔ میں اسے کہاں تلاش کروں....."

درگاہ پر پہنچ کر میں بڑی دیر تک قرآن حکیم کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سیدن شاہ بابا کی روح کو بخشتا رہا اور اللہ کے حضور سیدن شاہ بابا کے توسط دعائیں مانگتا رہا۔ میری آنکھوں سے سیل رواں جاری تھا کہ..... اچانک اپنے دائیں کندھے پر ہاتھ کا دباؤ محسوس کر کے میں چونک پڑا۔

☆☆☆

وہ نورانی چہرے والا سبز پوش انسان تھا۔ شرعی داڑھی اور کندھوں تک جھولتے ہوئے دودھ کی طرح سفید بال۔ وہ اپنی کٹیا میں میرے ساتھ ہی چٹائی پر بیٹھ گیا تھا۔ درگاہ کی پشتی طرف ہی ایک مختصر سی کٹیا اس کی کل جائداد تھی۔

"مل جاوے گی تمہیں، یہاں سے سیدھے مشرقی سمت چلے جاؤ۔ سورج غروب ہونے سے پہلے دریا کنارے پہنچ جاؤ گے۔ دریا کنارے تمہیں ایک جھگی نظر آئے گی۔ وہیں رات گزارو گے۔ اللہ سب بہتری کرے گا....."

بزرگ خاموش ہو گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ میں سمجھ گیا کہ مجھے اب مزید رکنا نہیں ہے۔ میں اٹھا اور کٹیا سے باہر نکل گیا اور رخصتی سلام کے لئے گھوم پڑا۔

پھر، نہ صرف بزرگ غائب تھا بلکہ کٹیا کا بھی نام و نشان تک نہیں تھا۔ مجھے کوئی تعجب نہیں ہوا۔ میں پہلے ہی سے جانتا تھا کہ چودہ سیدن شاہ میں جنات بھی بستے ہیں۔

جو کچھ بھی تھا، اللہ کا نام لے کر میں جیپ میں بیٹھ گیا اور منزل کی طرف بڑھ گیا۔

گو کہ بزرگ نے کہہ دیا تھا کہ "مل جاوے گی۔" اس کے باوجود میں اپنی بے چینی پر کسی طرح بھی قابو نہیں پا سکا تھا۔ کاش مجھے پہلے ہی ناگن بہن کی گمشدگی کا علم ہو جاتا۔

جو کچھ بھی تھا، مقدر کا لکھا کوئی مٹا ہی نہیں سکتا۔ خود ناگن بہن کوئی معمولی حیثیت نہیں رکھتی تھی، جب جناتوں سے ٹکرا جانے والی محض سپیرے، سپیرن یا جوگیوں کے سامنے بے بس ہو سکتی ہے تو اس کا مطلب یہی لیا جا سکتا ہے کہ سپیرے بھی بہت کچھ علم رکھتے ہیں۔ ان ہی خیالات میں غلطاں پیچاں میں مشرقی سمت میں بہت دور تک پہنچ گیا۔ میری

جیپ اب سنگلاخ چٹانوں کے درمیان اچھلتی کودتی بڑھ رہی تھی۔ مجھے پیٹرول کی فکر بھی نہیں تھی۔ ٹنکی فل تھی اس کے علاوہ ایکسٹرا گیلن بھرے ہوئے تھے۔

جیسا کہ میں چٹانوں کے درمیان سے گزر رہا تھا اس لئے سورج کی کرنیں کہیں تو میری جیپ تک پہنچ ہی نہیں پا رہی تھیں اور کہیں کہیں سرمئی سائے روشن ہوتے رہتے تھے۔

پھر، ایک جگہ موڑ مڑتے ہی مجھے وسیع و عریض دراڑ میں ایک بہت ہی پرانی جیپ الٹی پڑی نظر آئی۔ اس کے دو ٹائر بھی پھٹے ہوئے تھے۔

میں جیپ پر اچٹتی سی نظر ڈالتے ہوئے کشادہ دراڑ سے نکل کر جیسے ہی میدانی حصے میں پہنچا، میری نظریں ایک انسانی جوڑے پر پڑیں۔

وہ ایک گنجان درخت کے سائے تلے دری بچھائے بیٹھے تھے۔ دری پر ایک سوٹ کیس، ایک بستر بند اور صراحی بھی رکھے تھے۔ میری جیپ کے انجن کی آواز پر دونوں ہی چونک کر میری طرف متوجہ ہوگئے دونوں ہی حسن و جمال کے پیکر تھے۔ لباس سے وہ کوئی زمیندار ہی لگتے تھے۔

مرد کی عمر میری ہی عمر کے مطابق تھی جبکہ عورت بھی میری سدرہ کی ہم عمر لگتی تھی۔ دونوں ہی اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

"السلام علیکم....." ان کے قریب جیپ روکتے ہوئے میں نے سلام کیا۔

"واعلیکم السلام...." دونوں نے بیک زبان مجھے سلام کا جواب دیا جبکہ جوان شخص نے قریب پہنچ کر مصافحے کے لئے ہاتھ بھی بڑھا دیا تھا۔

میرے تمام خدشات مٹ چکے تھے۔ ویران و سنسان جگہ پر انہیں دیکھ کر میں محتاط ہو گیا تھا۔

"کی ناں ہے تہاڈا جواناں...." میں گرم جوشی سے مصافحہ کرتے ہوئے بولا۔

"امیر زمان شیرازی۔ اور یہ میری بیوی مدیحہ ہے...." اس نے بھی مسکراتے ہوئے تعارف کروا دیا۔

"میرا نام وصی الدین ہے، میں پنڈ دادن خان کا رہنے والا ہوں...."

"اوہ بسم اللہ جی آیاں نوں۔ وڈاناں سنا ہے تہاڈا۔ کدھر کو جا رہے ہیں۔ آپ...." وہ بہت ہی خوش ہوا۔ مدیحہ بھی جیپ سے قریب ہو گئی۔

"دریاء تک جا رہا ہوں۔ آپ سنایئے یہاں ویرانے میں....۔"

"مجبوری ہے بھرا۔ ساڈی جیپ ویسے ہی بڈھی سی، دو دئیں لتاں تڑوا کے الٹ گئی۔ اب ہم پیدل ہی جا رہے ہیں...."

"آیئے، بیٹھ جایئے، اللہ نے سواری کس لئے دی ہے...."

شیرازی کی باچھیں پھیل گئیں۔ مدیحہ بھی بہت ہی خوش نظر آنے لگی تھی۔

"دریاء سے کوئی ڈیڑھ دو فرلانگ پہلے ہی میرا ڈاک بنگلہ ہے۔ میں اصل میں زمیندار ہونے کے علاوہ فاریسٹ آفیسر بھی ہوں۔ میرے ساتھ بہت سے دوسرے ملازم بھی رہتے ہیں...." وہ اپنی حقیقت بتاتا رہا، میں خاموشی سے جیپ ڈرائیو کرتا رہا۔

"میں چکوال سے آ رہا ہوں.... میرا سسرال چکوال میں ہے اور مدیحہ اپنے میکے گئی ہوئی تھی۔

آپ کے لئے بہتر یہی ہو گا کہ جیپ میرے بنگلے پر چھوڑ دیجئے گا واپسی میں لے لیجئے گا...."

"تو کیا دریا کنارے جیپ کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے...." میں شیرازی کی باتوں سے لطف اندوز ہوتے ہوئے بولا۔ وہ کچھ زیادہ ہی باتونی لگتا تھا۔

"ناں جی ناں۔ پورا ساحلی علاقہ درختوں اور جھاڑیوں سے اٹا ہوا ہے کوئی آتشیں ہتھیار ہے آپ کے پاس...."

"جی ہاں۔ ریوالور ہے اور سیٹ کے نیچے دو نالی بندوق بھی رکھی ہے...."

"گڈ اصل میں ساحلی علاقہ اور گنجان جنگل ہونے کے باعث سانپوں اور اژدہوں کا ہر وقت خدشہ رہتا ہے۔ جنگل ہی میں چٹانیں بھی ہیں۔ ریچھ اور شیر بھی پائے جاتے ہیں۔ بائیں طرف موڑ لیجئے...."

میں نے اسٹیرنگ کو گھما کر جیپ کا رخ بائیں طرف موڑ دیا۔

"بائی دی وے آپ دریاء پر کیوں جانا چاہتے ہیں...."

”مجھے تلاش ہے ایک سپیرے کی.....“

”اوہ۔ کہیں آپ شرفو کی تلاش میں تو نہیں ہیں....“شیرازی سے شرفو کا نام سنتے ہی میں بری طرح چونک پڑا۔

”جی ہاں۔ کیا آپ جانتے ہیں اسے....“میں اپنی حالت پر قابو پاتے ہوئے بولا۔

”بہت اچھی طرح سے۔ وہ جنگل میں سانپ پکڑتا رہتا ہے۔ چند روز سے نظر نہیں آرہا تھا۔ شاید دو روز پہلے وہ پھر جنگل میں پہنچا ہے۔ میں مدیحہ کو لینے چکوال جا رہا تھا مجھے راستے میں ملا تھا بہت خوش تھا۔ اس نے اپنی جھولی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا۔ کہ وہ دنیا کا امیر ترین آدمی بننے والا ہے، اس نے کسی شیش ناگن کو پکڑ لیا ہے....“

”اوہ۔ کیا اس کے ساتھ کوئی عورت بھی تھی.....“میں اپنی مسرتوں پر قابو پاتے ہوئے بولا۔

”ناں جی ناں۔ اوتے اکیلا ہی سی۔ بس روک دیں جیپ....“

وہ نہ بھی کہتا تو میں نے جیپ روک دینی تھی۔ اس لئے کہ ڈاک بنگلہ میری نظروں کے سامنے ہی تھا۔ وہاں چند باوردی مسلح جوان بھی کرسیاں ڈالے بیٹھے تھے۔



شیرازی کے بے حد اصرار پر میں نے ڈنر ڈاک بنگلے ہی میں لیا تھا۔ شیرازی نے بہت کوشش کی کہ دو تین مسلح محافظوں کو ساتھ لے لوں لیکن میں نے بڑی خوبصورتی سے انکار کر دیا تھا۔

میری پیٹھ سے فوجی اسٹائل کٹ بیگ بندھی تھی۔ کندھے سے تھری ناٹ تھری کی بندوق اڑسی ہوئی تھی۔ میرے ایک ہاتھ میں ریوالور تھا اور دوسرے ہاتھ میں طاقتور روشنی والی ٹارچ بتی تھی۔ یہ تمام اشیاء میری ذاتی تھیں جو جیپ ہی کے ایمرجنسی بکس میں ہر وقت موجود رہتی تھیں۔

تاحال مجھے ٹارچ روشن کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔ ایک تو اس لئے کہ میں جنگ عظیم دوم کا سپاہی تھا۔ دوم اس لئے کہ راستہ ناہموار نہ تھا۔ بڑھتے بڑھتے میں عین ساحل پر بنے ہوئے جھونپڑے کی پشت پر پہنچ گیا تھا۔

دریا بہت ہی وسیع و عریض تھا۔ ستاروں بھرے آسمان تلے بہنے والے دریاء کی وسعتیں بہت ہی ڈراوٗنی لگ رہی تھیں۔ یہ حقیقت تھی کہ ساحل گنجان درختوں اور خودرو جھاڑیوں سے اٹا ہوا تھا۔ سینکڑوں ارضی اور ہوائی جانوروں کی آوازیں ایک ہول ساطاری کیئے ہوئے تھیں۔ اندھیرے کا یہ عالم تھا کہ جھگی بھی محض ایک ہیولے کی مانند نظر آرہی تھی۔

چند لمحے سن گن لیتے رہنے کے بعد میں گھوم کر جھگی کے مرکزی حصے کی طرف پہنچ گیا۔ یہاں سے دریا کا پانی صرف چند قدموں کے فاصلے پر تھا۔

دروازہ کھلا ہوا تھا، یا پھر یوں کہنا مناسب ہے کہ دروازہ تھا ہی نہیں صرف خلا تھی۔

جھگی میں داخل ہونے کے بعد مجھے یوں لگا جیسے میں قبر میں داخل ہو گیا ہوں۔

میں نے فوراً ہی ٹارچ بتی روشن کرلی۔ یوں لگا جیسے جھگی میں دن نکل آیا ہو۔ زمین پر خشک کھجوری چٹائی بچھی ہوئی تھی۔ ایک کونے میں اوپر تلے کئی چھبیاں یا پٹاریاں رکھی ہوئی تھیں۔ یقیناً ان میں سانپ بند ہوں گے۔ دوسرے کونے میں بانس کی بنی ہوئی گھڑونجی رکھی تھی جس پر پانی سے بھرا ہوا مٹکار کھا تھا اور ڈھکن پر سلور کا گلاس الٹا پڑا تھا۔

یہ سب کچھ تو تھا ہی اس کے ساتھ ہی میرے جسم میں ایک عجیب سی اینٹھن محسوس ہو رہی تھی۔ مجھے یاد ہے، ناگن بہن نے مجھے ایک منتر سکھایا ہوا تھا، جس کے پڑھنے سے کسی قسم کا سانپ میرے نزدیک نہیں پھٹک سکتا تھا، نیز یہ کہ اس منتر کو اپنے جسم پر پھونک دینے سے میں ہر قسم کے سامرانہ حصار میں داخل ہو سکتا ہوں اور اگر میرے جسم میں اینٹھن اٹھنے لگے تو پھر مجھے یقین کر لینا چاہئے کہ میں جادوئی حصار میں ہوں۔

میں نے ٹارچ بجھا دی اور چووہ سیدن شاہ والے بزرگ کی ہدایت پر میں لاپرواہی سے چٹائی پر لیٹ گیا۔ تاہم میں نے ریوالور سے گرفت نہ ہٹائی۔

وقت گزرتا رہا اور میں معمولی سی معمولی آہٹ پر کان لگائے لیٹا رہا۔ میں صرف اور صرف شرفو کے متعلق ہی سوچ رہا تھا۔ رہ رہ کر ریشماں کا خیال بھی مجھے بے چین کیئے ہوئے تھا۔ نہ جانے کیوں مجھے یقین سا ہو چلا تھا کہ شرفو نے ریشماں کو قتل کر دیا ہے۔ ایسے ہی خیالات میں ڈوبا ہوا میں نہ جانے کتنی دیر تک گم صم پڑا رہا کہ اچانک جھاڑیوں کی سرسراہٹ کے ساتھ مجھے کسی مرد کی بھنبھناتی آواز سنائی دی۔

بھنبھناہٹ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ قریب ہوتی گئی۔ قریب....اور قریب اور پھر بالکل ہی واضح ہو گئی۔

"نہیں منگل رام۔ میں وہ خزانہ حاصل کر کے ہی رہوں گا...."

"لیکن استاد۔ اگر خزانہ برآمد نہ ہوا تو....۔" یہ دوسری آواز تھی جو یقیناً منگل رام کی تھی۔

"تو میں اس سے ناگ منی کا تقاضہ کروں گا۔ پھر بھی نہ مانی تو ریشماں کی طرح اس کا بھی سر کچل دوں گا...." شرفو کا جواب سن کر میرے ذہن پر کشت و خون کا جنون سا سوار ہو گیا۔ میں ہوا کے بگولے کی طرح سمٹ کر تیسرے کونے میں پڑے ہوئے صندوق کی آڑ میں ہو گیا۔ اس صندوق پر بستر بھی پڑا ہوا تھا۔

دونوں جھگی میں داخل ہو گئے۔ داخل ہوتے ہی شرفو بری طرح چونک پڑا اس کے حلق سے تحیر خیز آواز بھی نکل گئی۔

"کک، کیا ہوا استاد....۔" منگل رام نے پوچھا۔

"مم، میرا حصار ٹٹ، ٹوٹا ہوا ہے....۔" شرفو چھپوں پر نظریں جمائے ہوئے بولا۔

"ٹوٹا ہوا ہے...."

"ہاں....یقیناً یہاں کوئی آیا تھا...."

"میں آیا ہوا ہوں شرفو...." میں نے ٹارچ روشن کرتے ہوئے کہا۔ میرے ریوالور کی نال کا رخ بھی شرفو کی طرف تھا۔

اچانک دن کی سی روشنی ہوتے ہی شرفو اور منگل رام دونوں ہی بہت بری طرح اچھل کر پلٹے تھے۔

"کک، کون ہو تم...." حیرت انگیز طور پر شرفو اپنی حالت پر قابو پاتے ہوئے بولا۔

وہ دراز قد تھا اور مضبوط تن و توش رکھتا تھا۔ اس کی ناک بالکل طوطے کی چونچ کی طرح تھی مگر آنکھیں سانپ ہی کی سی چمک رکھتی تھیں۔

بغیر دھڑام سے چٹائی پر گر گیا۔ میرے ریوالور کی گولی اس کی پیشانی میں سوراخ کرتی ہوئی کھوپڑی کے پشتی حصے سے گزر گئی تھی۔

اس صورت حال نے شرفو کو ادھ مواسا کر کے رکھ دیا۔ وہ متوحش نظروں سے منگل رام کو جھٹکے لیتے دیکھ کر میری طرف متوجہ ہو گیا۔

"بب، بتلاتا ہوں، بتلاتا ہوں۔ خدارا گولی نہ چلانا...." وہ تھرتھراتی آواز میں بولا۔

"ہم سپیروں کے اپنے اصول ہوتے ہیں۔ ریشماں میری منگیتر تھی۔ میرے چچا نے اسے بہت سے منتر سکھلائے تھے۔ وہ اپنے منتروں سے دنیا کے خطرناک ترین سانپوں کو حصار میں لے سکتی تھی، انہیں بے ہوش کر کے پکڑ لیتی تھی۔ لیکن میرے چاچا نے محض روپے کے لالچ میں پھنس کر ریشماں کو عزت خان کے سپرد کر دیا۔ میں اس قدر دل برداشتہ ہوا کہ بستی چھوڑ دی مگر ریشماں کے منتروں کا توڑ پا لیا۔ اس کے لئے مجھے بہت محنت کرنی پڑی۔ مذہب تک کو ترک کر دیا اور عزت خان کے گاؤں پہنچ گیا۔

مجھے پتہ چلا کہ ریشماں چوہدری نظام کے پرسے کو گئی ہوئی ہے اور جب میں رات کے اندھیروں میں نظام حویلی کی طرف جا ہی رہا تھا کہ مجھے کھیتوں کے درمیان سیاہ لبادے میں لپٹی ہوئی ریشماں مل گئی۔ وہ بہت گھبرائی ہوئی اور پریشان سی لگ رہی تھی یہ میری ریشماں سے دوسری ملاقات تھی۔

میں نے اسے روکا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چرمی تھیلا تھا۔ ہم دونوں کے درمیان بہت تکرار ہوئی۔ تکرار کے دوران ہی میں نے اپنے علم سے جان لیا کہ وہ شیش ناگن کو تھیلے میں ڈالے ہوئے ہے۔

میں نے اس سے تھیلا چھیننے کی کوشش کی تو وہ گر پڑی بہر حال میں ایک مرد ہوں۔ میں نے ریشماں کو بے قابو کر دیا۔ اپنی پیاس بجھائی اور ایک بھاری پتھر سے اس کا سر کچل کر اسے مار ڈالا۔ اس کے بعد چرمی تھیلا لئے میں یہاں پہنچ گیا۔

یہ جھگی اصل میں ایک بہت ہی شکتی مان پنڈت کی ہے۔ وہ برسہا برس سے اس جھگی میں دھیان گیان میں مصروف رہا ہے۔ مجھے اس نے اپنا بیٹا بنا لیا ہے۔ وہ بھی جان چکا تھا کہ میرے پاس شیش ناگن ہے۔

وہ بہت خوش ہوا، مجھ سے وعدہ کر گیا ہے کہ تیر تھ سے واپسی پر وہ مجھے ناگ منی پانے کے بعد دنیا کا طاقتور ترین انسان بنا دے گا۔ وہ چلا گیا، اسی کے ایماء پر میں نے شیش ناگن کو بھوری چٹان کے ایک غار میں قید کر رکھا ہے۔ اس سے مجھے ایک فائدہ یہ بھی ہو رہا ہے کہ شیش ناگن کے درشن کو کئی سانپ غار میں داخل تو ہو جاتے ہیں مگر غار سے نکلنے نہیں پاتے اور میں بڑی آسانی سے انہیں پکڑ لیا کرتا ہوں....“

”بھوری چٹان کس طرف ہے....“ میں نے بات مختصر کرنے کو پوچھا۔

”زیادہ دور نہیں ہے۔ یہاں سے چند سو قدم جنوب کی طرف چڑھائی پر وہ اکلوتی بھوری چٹان واقع ہے۔ اس پر کوئی ہریالی نہیں ہے۔ گرو جی کہتے تھے کہ اس بھوری چٹان تلے سونے اور جواہرات کا بہت بڑا ذخیرہ ہے۔ شیش ناگن نے بھی مجھے یہی بتلایا تھا....“

”تو پھر تم چھٹی ہی کرو....“

جیسا کہ شرفو کی گفتگو ختم ہونے تک میں اپنی کمر سے لپٹا ہوا کوڑا کھینچ چکا تھا، لہٰذا جیسے ہی شرفو نے بات پوری کی، میں نے ہنٹر کو بڑی مہارت سے اوپر تلے رکھی ہوئی چھبیوں پر دے مارا۔

نتیجتاً کئی چھبیاں گر پڑیں، ان کے ڈھکن کھل گئے اور کئی رنگوں کے چھوٹے بڑے سانپ آزاد ہو گئے۔

میں نے ٹارچ بجھا دی اور شرفو کی آہ وبکا کی پرواہ کئے بغیر جھگی سے نکل گیا۔

شرفو کے خوف اور بوکھلاہٹ کا یہ عالم تھا کہ وہ تمام جنتر منتر بھی بھول گیا اور سانپوں کی لپیٹ میں آ گیا۔

مخصوص سمت میں بڑھتے وقت مجھے دکھ بھی ہو رہا تھا اور خوشی بھی۔ دکھ اس لئے کہ ریشماں کو شرفو نے مار ڈالا تھا۔ یقیناً اس کی لاش کو کھیتوں میں کام کرنے والوں نے دریافت کر لیا ہوگا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ نظام حویلی کی عورتیں ریشماں کی لاش کو شناخت کر لیں عزت خان کی امانت اسے مل جائے۔

خوشی اس لئے ہو رہی تھی کہ ناگن بہن کی اصلیت سے واقف ہونے والے ریشماں اور شرفو مر چکے تھے۔ اس طرح ناگن بہن حسب سابق میرے ساتھ بے کھٹکے رہ

سکے گی۔

☆☆☆

اب میں تھا، جنگل تھا اور جنگل کی وحشتیں تھیں۔ صرف ایک خلش مجھے بے چین کیئے ہوئے تھی کہ بھوری چٹان کے غار میں ناگن بہن کس حال میں ہو گی۔

اس خیال کے آتے ہی کہ غار میں ناگن بہن کے درشن کو کئی سانپ داخل ہوتے ہیں۔ میں نے وہ منتر پڑھنے شروع کر دیئے جو ناگن بہن ہی نے مجھے سکھائے تھے۔

گھور اندھیرے میں میرا وجود کسی بدروح ہی کی طرح لگ رہا تھا۔ یوں تو بہت سی آوازیں مجھے سنائی دے رہی تھیں لیکن درندوں میں ریچھوں کے علاوہ کوئی آواز سنائی دی تو وہ بھیڑیوں کی آواز تھی میں برابر ایک ہی سمت میں بڑھتا رہا۔ جنگلی جھاڑیاں میری راہ میں رکاوٹ نہ بن سکی تھیں۔ شاید اس لئے کہ پگڈنڈی نما راستہ پہلے ہی انسانی ہاتھوں سے ہموار کیا ہوا تھا۔

میں جوں جوں بلندی کی طرف بڑھتا رہا، ہریالی میں کمی ہوتی گئی میں نے صرف ایک بار ٹارچ روشن کی تھی۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ میرے قدم صحیح سمت میں اٹھ رہے ہیں یا میں راستہ بھٹک گیا ہوں۔

سیاہ شب میں گویا دن نکل آیا تھا۔ ایک تو میں یہ دیکھ کر مطمئن ہو گیا کہ میں صحیح سمت میں جا رہا ہوں ہریالی نہ ہونے کے برابر رہ گئی ہے زمین بھوری لگ رہی تھی۔

دوسرے یہ کہ میں نے تھوڑی سی بلندی پر ایک عجیب الخلقت ریچھ کو دیکھ لیا تھا جو بالکل انسانوں کی طرح چلتا ہوا دوسری سمت میں اترتا چلا جا رہا تھا۔ عجیب الخلقت جملہ میں نے اس لئے استعمال کیا ہے کہ اس کے جسم پر ہلکے یا گہرے بال نہ تھے البتہ اس کے سر کے بال کافی لمبے اور بھورے تھے۔ وہ چونکہ میری طرف پیٹھ کئے ہوئے تھا اس لئے میں اس کا چہرہ وغیرہ نہ دیکھ سکا تھا ویسے وہ کافی لمبا اور پھیلی ہوئی جسامت رکھنے والا ریچھ ہی تھا۔

میں نے اس پر فائر اس لئے نہیں کیا کہ وہ مخالف سمت میں اتر رہا تھا۔ ٹارچ میں نے فی الفور بجھا دی تھی اور بلندی کی طرف بڑھتے بڑھتے میں غار کے دہانے پر پہنچ ہی گیا۔

ایک بار پھر میں نے ٹارچ روشن کی۔ روشنی میں مجھے صرف آٹھ دس ہی سانپ نظر آئے تھے جو زمین پر رکھی ہوئی ایک بڑی سی چھبی کے گرد جمع تھے۔ اور روشنی ہوتے ہی بڑی

تیزی سے ادھر ادھر منتشر ہو گئے یا پھر ہو سکتا ہے اس منتر کی وجہ سے منتشر ہوئے ہوں۔

جو کچھ بھی تھا، چھبی کو دیکھ کر میرا دل از خود مسرت سے بلیوں اچھلنے لگا۔ چھبی چرمی ڈور سے بندھی ہوئی تھی۔ میں نے دھڑکتے دل سے آواز لگائی۔

"آپا۔ میں آگیا ہوں۔ اگر آپ چھبی میں ہیں تو خدارا جواب دیں۔ . . ."

"وو . . . . ویرا . . . ." اچانک چھبی ہی سے میری ناگن آپا کی روہانسی آواز گونجی۔ آواز سنتے ہی میرا سینہ تھرک اٹھا، میری آنکھیں فرطِ مسرت سے بھر آگئیں اور میں جھر جھرا کر رہ گیا۔

"مم . . . . میں چھبی ہی میں ہوں میرے لال . . . ."

دیوانہ وار آگے بڑھ کر میں نے چھبی کی چرمی ڈور کھول دی اور ڈھکن ہٹا کر پرے پھینک دیا۔ ڈھکن ہٹایا ہی تھا کہ فوہ کی بھیانک ترین پھنکار کے ساتھ ناگن بہن نے پھن اٹھایا اور پھر اس کا پورا جسم بانس کی طرح اکڑتا چلا گیا۔

پھر دودھیائی رنگت کا تیز جھماکہ ہوا اور میری بہن، میری ماں میری سب کچھ انسانی وجود میں آگئی۔ بیان نہیں کر سکتا کہ اس وقت ہم دونوں بہن بھائی پر کیا بیتی۔ چمٹ گئی تھی۔ مجھ سے ہچکیاں سی بندھ گئیں میری آپا تھیں کہ مجھے بے تحاشہ چوم رہی تھیں میری پیٹھ سہلا رہی تھیں۔ بڑی دیر تک یہ رقت آمیز ملاقات ہوتی رہی۔ ہم دونوں وہیں غار کی کھردری زمین پر بیٹھ گئے۔ ہمارے دائیں بائیں آٹھ دس نہیں بلکہ بیسیوں سانپ اکٹھے ہو چکے تھے۔

"آخر آپ کیسے پھنس گئیں آپا . . . ." میں نے گفتگو کی ابتداء کی۔

"بے خبری میں بھرا بے خبری میں۔ پوری حویلی پر ماتمی ماحول چھایا ہوا تھا۔ میں چودھرائن مرحومہ کی بہوؤں اور پوتے پوتیوں کو دم دلاسہ دینے میں مصروف تھی کہ پانچویں دن میں بالکل نڈھال ہو گئی مجھے پتہ ہی نہ چل سکا کہ ایک لالچی چڑیل مجھے اپنے حصار میں جکڑ رہی ہے۔ آخر ایک روز میں بالائی منزل کے کمرے میں بے ہوش ہو کر گر پڑی۔ ظاہر ہے بے ہوش ہو جانے کے بعد میرا یہ موجودہ روپ بھی مٹ گیا ہو گا اس کے بعد مجھے ہوش اس وقت آیا جب میں اس ظالم عورت کے چرمی تھیلے میں قید ہو چکی تھی۔

کافی دیر بعد اس لالچی عورت سے کسی مرد کی مڈبھیڑ ہو گئی۔ وہ مرد اس چڑیل سے زیادہ طاقتور ثابت ہوا۔ وہ جو سیانوں نے کہا ہے ناں کہ آسمان سے گرے اور کھجور میں اٹکے۔

اس مردود کا نام شرفو ہے، اس کے ساتھ منگل رام نام کا شیطان اور بھی تھا۔ شرفو نے مجھے یہاں لا کر اس چھبی میں ڈال دیا اور پہلے تو مجھ سے خزانہ مانگنے لگا۔

ویرا۔ یہ جو چٹان ہے ناں، اس کی تقریباً پانچ سو فٹ کی گہرائی میں سونے کا بہت بڑا ذخیرہ ہے، جواہرات کا ایک ڈھیر سا لگا ہوا ہے۔ شرفو اور منگل رام نے اپنے جنتر منتر کی طاقت سے اس چٹان میں ڈھائی تین سو فٹ گہری کھدائی کر لی ہے۔ یہ چٹان چونکہ ریتلی ہے اس لئے کھدائی میں زیادہ قوت صرف نہیں کرنی پڑتی۔

شرفو دو تین روز میں خزانہ حاصل کر لیتا۔ اس کے باوجود مجھے آزاد نہ کرتا۔ اسے اصل میں ناگ منی چاہئے تھی۔ ناگ منی حاصل کرنے کے بعد وہ انسانیت کا دشمن بن جاتا۔ جن بھوت پریت وڈائنوں پر قابض ہو جاتا، پہلے مجھے مار دیتا، پھر عزت خان کو اور پھر اللہ نہ کرے تم کو ختم کرنے کے بعد سدرہ کو قابو میں کر لیتا۔

یا پھر ہو سکتا ہے وہ اپنے کسی مقصد میں کامیاب نہ ہو سکتا....'

"وہ کیسے آپا...." میں مسکراتے ہوئے بولا۔

"دہانے کی طرف دیکھو...." آپا کے متوجہ کرنے پر میں نے چونکے بغیر دہانے کی طرف دیکھا اور فوراً ہی اپنے بغلی ہولسٹر کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"ناں ویرا ناں...." آپا میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولیں۔

"اسے جانے دو۔ اس شیطان کا میں کیا حشر کرتی ہوں، اپنی آنکھوں سے دیکھ لینا...."

وہ وہی ریچھ تھا جو بے پناہ اندھیرے کے باوجود صاف دکھائی دیا دہانے کی طرف پیٹھ کئے گہرائی میں اترتا چلا جا رہا تھا۔ اس کے سر کے بھورے بال اس کی پیٹھ پر جھول رہے تھے۔

"آپا.... یہ ---- یہ ریچھ مجھے کافی دیر پہلے بھی نظر آیا تھا...."

"اوئے میرے بھولیا ویرا۔ یہ ریچھ نہیں ہے۔ یہ منگل رام کا باپ اور شرفو کا گرو

پنڈت مادھو چند بھمن ہے۔ تم نے مار ڈالا ہو گا منگل کو کسی طرح۔ اسے پتہ چل گیا ہے اور اب یہ سائے کی طرح تمہارے پیچھے لگا ہوا ہے اس غار تک اس کا یہ دسواں راؤنڈ ہے۔۔۔۔"

☆☆☆

"یہ۔۔۔۔ یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں آپا۔۔۔۔"

"ہاں ویرا یہ پنڈت مادھو چند بھمن ہے۔ اچھا بتلاؤ کیا شرفو زندہ ہے۔۔۔۔"

"نہیں آپا۔ اسے مختلف سانپوں نے ڈس لیا تھا۔۔۔۔"

"ہوں۔۔۔۔ یہ پنڈت بہت مکار انسان ہے۔ ویسے بھی تم نے ہندوؤں کے متعلق سنا ہو گا کہ بغل میں چھری لب پہ رام رام۔ شرفو بہت طاقتور عامل تھا۔ اس نے غار کے دہانے پر ایسا زبردست حصار قائم کیا ہوا تھا کہ کوئی انسان بھی اس کی مرضی کے بغیر اس غار میں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ اگر غلطی سے کسی نے داخل ہونے کی کوشش کی بھی تو اس کی گردن دھڑ سے الگ ہو جائے پنڈت کو میرے وجود کا علم تھا۔ بہت بڑا شکتی مان ہونے کے باوجود وہ شرفو کے حصار کو نہ توڑ سکا تو اس نے اپنے بیٹے منگل رام کو شرفو کے ساتھ لگا دیا اور خود شرفو سے کوئی بہانہ کر کے غائب ہو گیا۔۔۔۔"

"ہاں آپا۔ شرفو نے بتلایا تھا کہ وہ تیرتھ یاترا کو چلا گیا ہے۔۔۔۔" میں نے آپا کے خیال کی تصدیق کرتے ہوئے کہا۔

"وہ مکاری کر گیا تھا شرفو سے۔ شرفو کو موقع پا کر منگل رام قتل کر دیتا اس کے قتل ہوتے ہی دہانے پر قائم حصار خود بخود ٹوٹ جاتا اور وہ ناگ منی حاصل کرنے کے لئے مجھے حاصل کر لیتا۔

اب بھی وہ یہ دیکھنے آیا تھا کہ شرفو کا حصار قائم ہے یا ٹوٹ چکا ہے۔ اس نے تمہیں تو دیکھ لیا ہو گا مگر مجھے اس کا گرو گھنٹال رام بھی نہ دیکھ سکا ہو گا۔ چلو میں تمہیں وہ کھڈ دکھاؤں جو شرفو اور منگل نے کھودی ہے۔۔۔۔" کہتے ہوئے وہ اٹھ کھڑی ہوئی لیکن پھر بیٹھ گئی اور ان تمام سانپوں کے پھن پر ہاتھ پھیرنے لگی جو جمع ہو چکے تھے۔

دوبارہ جب وہ اٹھی تو اس کے لبوں سے فوہ کی ایک ہیبتناک آواز نکلی۔ نکلی ہی تھی کہ تمام سانپ رینگتے ہوئے ایک طرف ہٹ گئے اس طرح انہوں نے ہمارے لئے راستہ

چھوڑ دیا۔

لیکن چند سانپ ایسے بھی تھے جو میرے پیروں اور ٹانگوں سے اس طرح لپٹ گئے تھے کہ میں قدم نہیں اٹھا سکتا تھا۔

"ویرا.... یہ وہ ناگ ہیں جنہیں تم نے شرفو کی قید سے نجات دلوائی تھی۔ یہ سب تمہارا شکریہ ادا کر رہے ہیں...."

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ جھکا اور ایک ایک سانپ کو اٹھا اٹھا کر ان کے پھن پر بوسہ لیتے ہوئے انہیں آہستگی سے زمین پر ڈالتا رہا۔ ذرا سی دیر میں ہم غار سے باہر تھے۔

"مڑ کر مت دیکھنا ویرا۔ پنڈت مادھو بہن سینے کے بل زمین پر لیٹا ہوا تمہیں دیکھ رہا ہے۔ اب وہ سانپ کی طرح رینگتا ہوا تمہارا تعاقب کرے گا۔ اگر اس نے غار میں سے سانپوں کو نکلتے دیکھ لیا تو میری جستجو میں وہ غار میں داخل ہو جائے گا۔ اور جب مجھے نہیں پائے گا تو آتش غضب میں پھنکتے ہوئے تم پر حملہ آور ہو جائے گا اور پھر میرے اور اس کے درمیان ایک ماورائی جنگ چھڑ جائے گی...."

"وہ تو ٹھیک ہے آپا۔ لیکن مجھے خدشہ ہے کہ کہیں امیر زمان شیرازی اپنے آدمیوں کو لے کر میری تلاش میں نہ چل نکلا ہو...."

"اوئے جھلیا ویرا۔ تم واقعی بھولے بادشاہ ہو...." ناگن بہن مسکراتے ہوئے بولی۔

"کک، کیا مطلب...." میں چونکا۔

"اس خوفناک وادی میں بھلا کسی انسان کا کیا گزر۔ یہاں نہ تو کوئی ڈاک بنگلہ ہے اور نہ ہی فاریسٹ آفیسر ہے۔ نہ ہی اس کے کوئی باوردی ملازم ہیں۔

خدا نہ بھلائے تو اس بار بھی جنات نے تمہاری رہبری کی ہے۔ میں وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ دیجور اور گنزا ہی سے تمہاری ملاقات ہوئی تھی۔ دیکھ لینا۔ جب ہم لوٹیں گے تو تمہاری جیپ ایک چھوٹے سے میدانی حصے میں کھڑی ہو گی۔ نہ تو تمہیں ڈاک بنگلا نظر آئے گا اور نہ ہی کوئی آدمی...."

میں آپا کے انکشاف کی تردید نہ کر سکا۔ میں تو کیا جنات بھی آپا کی ماورائی قوتوں کے

قائل ہو چکے تھے۔ دکھ ہوا تو صرف اپنی لاعلمی پر کاش میں دیجور اور گنز اکو پہچان چکا ہوتا۔

بہت جلد ہم کھڈے کے قریب پہنچ گئے۔ گو کہ کھڈ عمودی نہ تھی، ڈھلوانی تھی۔ اس کے باوجود کھڈ کے کنارے ایک ہک کی طرح مڑی ہوئی فولادی موٹی سی کیل زمین میں گڑی ہوئی تھی اور اس سے ایک موٹا سا کتان کا رسا بھی بندھا تھا جس کا دوسرا کھڈ کے قبر کے سے اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔

"سورة مزمل پڑھتے ہوئے، رسا پکڑ کر کھڈ میں اترتے چلے جاؤ۔ ویرا کلام الہی پڑھنے کی ہدایت اس لئے کر رہی ہوں کہ تیس چالیس فٹ کی گہرائی ہی سے آکسیجن ختم ہو جائے گی اور زمینی آلودگی شروع ہو جائے گی۔ اس آلودگی میں میں تو زندہ رہ سکتی ہوں لیکن تمہارے لئے مشکلات شروع ہو جائیں گی۔ تاہم اللہ کا پاک کلام تمہاری حفاظت کرے گا...."

"لیکن آپا۔ شرفو اور منگل رام بھی تو گہرائی میں اترتے رہے ہیں...."

"میں تمہارا مقصد سمجھ رہی ہوں وصی الدین۔ وہ اترتے بھی تھے اور مزید کھدائی بھی کرتے تھے۔ محفوظ اس لئے تھے کہ وہ بھی ماورائی علوم پر کچھ نہ کچھ دسترس رکھتے تھے...."

"اس کے باوجود آپا اندھیرے کو کس خانے میں فٹ کریں گی آپ۔۔۔"

"ارے پگلے تمہارے پاس ٹارچ بھی تو ہے۔۔۔"

"آخر آپ۔ آپ کیوں نہیں چل رہیں میرے ساتھ...."

"پھر وہی پاگل پن والی بات۔ اگر میں بھی تمہارے ساتھ کھڈ میں اتر گئی تو اس مردود پنڈت کو بڑی آسانی ہو جائے گی...."

"رہنے دیں آپا۔ خواہ مخواہ کھڈ میں اترنے کی ضرورت ہی کیا ہے...."

میں بیزاری سے بولا۔

"ہاں.... یہ بھی صحیح ہے۔ چلو واپس چلتے ہیں...." آپا کا جواب سنتے ہی میرے ذہن میں ایک عجیب سی سرور اور گدگدی سی ہونے لگی جسے میں کوئی معنی نہ پہنا سکا۔ تاہم اچانک ہی کھڈ میں اترنے کی میری خواہش بڑھ گئی۔

"ٹھہرو آپا۔ جب ہم آ ہی چکے ہیں تو مجھے گہرائی ناپ ہی لینی چاہیے...."

آپا نے کوئی جواب نہ دیا بلکہ مسکراتے ہوئے ریت کے اس ڈھیر پر بیٹھ گئی جو کھڈ سے نکالی گئی تھی۔

حتمی فیصلے پر پہنچتے ہوئے میں نے رسہ پکڑ لیا اور سورۃ مزمل پڑھتے ہوئے کھڈ کی گہرائی میں اترتا چلا گیا۔

☆☆☆

میں ریت پر بیٹھ گئی اور چاروں طرف کا جائزہ لیتے ہوئے میری نظریں چار ریچھوں پر پڑیں۔ بے پناہ اندھیرے میں ان کی آنکھیں انتہائی چمک لئے ہوئے تھیں۔

چاروں ریچھ دو مختلف سمتوں سے اوپر کی طرف بڑھے چلے آرہے تھے۔ میں فوراً ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔ اٹھی ہی تھی کہ چاروں ریچھوں کی انتہائی چمک رکھنے والی آنکھیں مجھ پر جم گئیں۔ خونخوار جانور تھے اس لئے مجھے دیکھنے میں کامیاب ہوگئے تھے۔ ویسے بھی اکثر بے زبان جانور غیبات کو دیکھ لیتے ہیں۔

چاروں ریچھ ٹھٹک کر رک گئے۔ غالباً وہ یہ فیصلہ کرنا چاہتے تھے کہ مجھ پر حملہ کریں یا لوٹ جائیں۔ ان کی اسی عدم توجہی کی بناء پر میں فوراً ہی ناگن بن گئی، پھن کاڑھا اور ہر طرف اپنی پھنکاریں نشر کرنے لگی۔

میری ان پھنکاروں کا رزلٹ بھی فوراً ظاہر ہوگیا۔ چند کوبرا ناگ اور چتکبرے پہاڑی ناگ بڑی تیزی سے رینگتے ہوئے میرے گرد جمع ہوگئے اس دوران چاروں ریچھ ہولناک غراہٹوں سے سینہ کوبی کرتے ہوئے بڑی تیزی سے اچھلتے ہوئے میری طرف بڑھتے چلے آرہے تھے۔

میں نے پھنکارتے ہوئے تمام سانپوں کو ان ہی کی زبان میں ضروری ہدایات دیں۔ وہ بڑی تیزی سے ریت میں پاتال بناتے ہوئے روپوش ہوگئے۔ میں نے بھی ایک کنارہ پکڑ لیا۔

ذرا سی دیر میں چاروں ریچھ ریت کے ٹیلے کے قریب پہنچ گئے۔ سینہ کوبی کرتے اور دھاڑتے رہے۔ وہ مجھے تلاش کررہے تھے اور میں ایک بڑے پتھر کی اوٹ میں کنڈلی مارے

بیٹھی انہیں حقارت بھری نظروں سے دیکھتی رہی۔

مجھے معلوم تو تھا کہ وہ کیا کرنے پہنچے ہیں، تاہم میں دیکھنا چاہتی تھی۔ چند لمحے میری تلاش میں ناکامی اٹھانے کے بعد وہ کھڈ کی طرف پیٹھ کر کے چاروں ہاتھوں پیروں سے ریت پر جم گئے۔ بالیقین ان کے ہاتھ پیر کچھ نہ کچھ ریت میں دھنس گئے تھے۔ مجھے یہ جاننے میں دیر نہ لگی کہ پنڈت مادھو چند بہمن کا سحر ان کے سر پر چڑھا ہوا ہے اور چاروں ریچھ کھڈ کو ریت سے پاٹنا چاہتے ہیں۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ ریت میں بھونچال پیدا کرتے کہ اذیت ناک دھاڑوں کے ساتھ منہ کے بل ریت پر گر پڑے اور قلابازیاں کھاتے ہوئے ڈھلان پر لڑھکتے چلے گئے۔

ایسا ہوتے ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ پنڈت مادھو چند بہمن تھا۔ کمر سے اوپر اس کا جسم بالکل ننگا تھا۔ وہ سینے کے بل لیٹ کر ریچھوں کو اپنی ماورائی قوت سے کنٹرول کر رہا تھا کہ ریچھوں کا ہولناک انجام دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

اتفاق سے ایک ریچھ لڑھکنیاں کھاتے ہوئے اسی کی سمت جھک رہا تھا۔ میں نے دیکھا، اس کی آنکھوں سے زرد روشنی کی دو گیندیں نکلیں اور آن واحد میں ریچھ سے ٹکرا کر معدوم ہو گئیں۔

ایسا ہوتے ہی میں بھی بڑی تیزی سے رینگتی ہوئی اس کے قریب پہنچ گئی۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ وہ کیا کرنا چاہتا ہے۔

زرد روشنی کے معدوم ہوتے ہی ریچھ اس طرح ڈھلوان پر ٹک گیا جیسے وہ کسی بریکر سے جا لگا ہو۔ ایسا ہوتے ہی پنڈت گرتا پڑتا چڑھائی چڑھتا ریچھ کے قریب پہنچ گیا اور ریچھ کے منہ کے گوشوں سے جھاگ بہتی دیکھ کر وہ آتش غضب میں پھنکتا ہوا اچھل پڑا۔

کوئی لمحہ ضائع کئے بغیر میں نے جون بدل لیا اور عورت بن گئی۔ مجھے خدشہ تھا کہ وہ کوئی نہ کوئی حرکت ضرور کرے گا۔ وہی ہوا بھی۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ ریت کے ٹوبے کی طرف کر دیئے اور جے بھولے ناتھ کی آواز نکالتا رہ گیا۔

آن واحد میں اس کی دسوں انگلیوں سے مسلسل دھار والی بل کھاتی برقیں سی کوندیں اور ریت کے ٹوبے پر سنہرے سانپوں کی طرح مچلنے لگیں۔

یقین جانیئے میں گھبرا گئی۔ میرا دل اس خدشے کے تحت ڈوب سا گیا کہ کہیں وہ ریت پر طوفان تو برپا نہیں کر رہا۔ لیکن جلد ہی میرا خدشہ مٹ گیا۔ ہوا یہ کہ ریت میں پاتال بنا کر دبے ہوئے تمام سانپ برق رفتاری سے نکل نکل کر اندھیروں میں گم ہوتے چلے گئے۔ یقیناً پنڈت مردود نے ریت کو آگ کی طرح گرما دیا ہو گا۔

وہ ہانپ رہا تھا اس کے تنفس کی آواز و رفتار تھکے ماندے گھوڑے کی پھنکاریں بن چکی تھیں۔ اسی حالت میں وہ میری طرف مڑا۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ مجھے دیکھنے سے قاصر تھا۔

اس نے ایک بار پھر اپنے دونوں ہاتھ دریا کے کنارے پر یا پھر گھنے درختوں کی طرف تان لئے ایک بار پھر اس نے جے بھولے ناتھ کا نعرہ لگایا۔ اس بار اس کی دسوں انگلیوں سے گہرے سرخ رنگ کی چیختی ہوئی دھاریں نکلیں۔ جیسے گیلی لکڑی آگ میں چیخ چیخ کرتی ہے۔ فرق صرف یہ تھا کہ اس کی دسوں انگلیوں سے نکلنے والی شعاعیں اس قدر سماعت شکن آوازوں سے چیختی تھیں کہ پورا ویرانہ گونج اٹھا تھا۔

اس نے اپنے ہاتھ جھکا لئے لیکن اس کی انگلیوں سے نکلنے والی شعاعیں پلک جھپکنے کی دیر میں جھکتی ہوئی، گنجان درختوں سے ٹکراتی ہوئی معدوم ہو گئیں۔ جن جن درختوں سے شعاعیں ٹکرائی تھیں، ان پر بسے ہوئے پرندے خوابناک چیخوں سے پھڑپھڑاتے ہوئے اندھیروں میں تیرنے لگے تھے۔ وہ کیا کرنا چاہتا تھا، یہ تو میں نہ سمجھ سکی۔ سمجھ جاتی اگر میں نے وصی الدین کو ریت کے پچھواڑے سے ابھرتے نہ دیکھ لیا ہوتا۔



میں بہت جلد گہرائی میں پہنچ گیا۔ میرے لبوں پر سورۃ مزمل شریف کا ورد جاری تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ جہاں نرم و ٹھنڈی زمین سے میرے پیر ٹکے تھے، وہاں نہ تو اندھیرا تھا اور نہ آکسیجن کی کمی تھی۔ بلکہ ایسی فرحت اور تازگی چھائی ہوئی تھی کہ میرے رگ و پے میں لذت آمیز سرسراہٹ دوڑنے لگی۔

میں نے رسہ چھوڑ دیا اور جیسے ہی گھوما، ایک جوان العمر شخص کو کھڑے دیکھ کر میرا دل اچھل کر حلق میں آ ٹکا اس کے باوجود میرا ہاتھ از خود کوڑے کی طرف اٹھ گیا۔

"السلام علیکم وصی الدین صاحب...." اس نے مسکراتے ہوئے مجھے سلام کیا اور.... میرے لبوں سے اطمینان وسکون کی طویل سانس نکل گئی۔ وہ دور قدیم کے بادشاہوں یا سلطانوں کا سا لباس پہنے تھا۔ اس کے سر پر شاہی اسٹائل میں پگڑی بندھی تھی اور اس پگڑی میں پیشانی کی جانب یا دائیں بائیں اپنی نوعیت کے بیش بہا جواہرات پروئے ہوئے تھے اور کنویں نما کھڈ میں ان ہی جواہرات سے پھوٹنے والی روشنی سے اجالا پھیلا تھا۔ قد کاٹھ میں وہ مجھ سے مختلف نہ تھا۔ البتہ اس کے مردانہ نقوش اور حسن و جمال پر قصیدہ پڑھا جاسکتا تھا۔

"واعلیکم السلام۔ آپ کی تعریف...." میں آن واحد میں اپنے منتشر حواس پر قابو پاتے ہوئے بولا اور مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھادیا۔

میں نے احتیاط اس لئے چھوڑدی تھی کہ وہ جن تھا، ولی تھا یا کوئی بھی مخلوق میں سے تھا۔ تھا مسلمان ہی۔

"میری کوئی تعریف نہیں ہے وصی صاحب۔ آپ جو بھی نام مجھے دیں گے میں اسے دل وجان سے اپنالوں گا...." وہ مجھ سے بھرپور اپنائیت سے مصافحہ کرتے ہوئے بولا۔

"شکریہ اس قدر افزائی کا۔ لیکن آپ یہاں دوڈھائی سوفٹ گہرے کھڈ میں کیسے پہنچے...." میں تعجب بھرے لہجے میں بولا۔

"بیٹھ جایئے۔ پریشان نہ ہوں آپ کے کپڑے خراب نہیں ہوں گے میں نے اس وقت قالین بچھادیا تھا جب آپ نے کھڈ کا نیم فاصلہ عبور کرلیا تھا...." وہ انتہائی خوش اخلاقی سے بولا۔

"ایک بار پھر شکریہ۔ تاہم میرا سوال اپنی جگہ برقرار ہے...." میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور قالین پر بیٹھ گیا۔

"پہلے آپ مجھے کوئی نام دے دیں تاکہ آپ کو مخاطب کرنے میں آسانی ہو...."

"نورالدین.... کیسا رہے گا یہ نام...." میں نے فی الفور کہہ دیا۔

"بہت ہی مقدس نام دیا ہے آپ نے مجھے۔ نورالدین، سلطان نورالدین زنگی۔ جس نے پیغمبر آخری زمان کا دیدار مبارکہ کیا تھا۔ ہاں تو آپ کے سوال کا جواب یہ ہے کہ

میں کہیں باہر سے نہیں آیا بلکہ یہی کھڈ، یہی پاتال میرا مسکن ہے۔ میں محافظ ہوں اس خزانے کا جو آپ کے قدموں کے نیچے بڑی دور تک بکھرا ہوا ہے....."

"اوہ....." میرے لبوں سے تحیر خیز آواز نکل گئی۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ یہ جوان اصل میں ناگ ہے۔ خزانے کا محافظ شیش ناگ۔

"جی ہاں۔ آپ صحیح نتیجے پر پہنچے ہیں....." وہ میرے دل کی بات جان کر مسکراتی آواز میں بولا۔

"میں شیش ناگ ہوں۔ آپ کی بہنا کی طرح میری عمر بھی سوا سو برس کی ہو چکی ہے۔ مجھ سے پہلے میرا باپ اس مدفون خزانے کی حفاظت کرتا تھا۔ وہ بھی شیش ناگ ہی تھا مگر ستانوے برس کی عمر پا کر مر گیا اس لئے جون بدلنے سے قاصر تھا۔

میرے دادا البتہ جون بدل لیتے تھے۔ وہ بھی اسی زیر چٹان خزانے کی حفاظت کرتے ہوئے اپنی زندگی کے دن پورے کر گئے....."

"بہت خوب۔ تو گویا آپ نسل در نسل زیر زمین خزانے کے محافظ رہتے آئے ہیں....." میں متاثرہ لہجے میں بولا۔

"جی ہاں۔ آپ کا اندازہ درست ہے۔ میرے آباؤ اجداد دو ہزار برس سے اس خزانے کی حفاظت کرتے آئے ہیں....."

"اور اگر شرفو اور منگل رام خزانے تک پہنچ جاتے تو....." میں پراسرار لہجے میں بولا۔

"وہ نہیں پہنچ پاتے۔ آج رات گزرنے کے بعد صبح ہی میں ان دونوں کو یہیں ختم کر دیتا....."

"ماشاء اللہ۔ میرے متعلق آپ کا کیا خیال ہے....."

"بہت ہی نیک خیال ہے۔ آپ تو مجھ سے ملے بغیر ہی واپس جا رہے تھے۔ یاد کیجئے۔ میں نے آپ کے ذہن کو گدگدایا تھا۔ میں نے ہی آپ کو واپسی سے ارادے سے باز رکھا تھا....."

"اوہ۔ کیا آپ کو مجھ سے کوئی کام تھا....."

”تھا نہیں بلکہ ہے۔ پہلا کام تو یہ ہے کہ آپ کو یہ چار تھیلے یہاں سے لے جانے ہیں.... “وہ کونے میں رکھے ہوئے چرمی تھیلوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

”دو ہزار سال سے میرے بزرگ ایک دوسرے کو نصیحت کرتے چلے آئے تھے کہ ایک دن آپ ضرور آئیں گے اور آپ کے ساتھ آپ سے بے پناہ محبت رکھنے والی میری نسل سے ایک ناگن بھی ہوگی۔ زہے نصیب کہ یہ اعزاز میرے مقدر میں لکھا تھا۔

ایک تھیلے میں جواہرات بھرے ہوئے ہیں اور بقیہ تین تھیلوں میں سونے کی بڑی بڑی اینٹیں رکھی ہیں....“

”لل، لیکن نورالدین۔ میں اس خزانے کا کیا کروں گا۔ میرے پاس تو اللہ کا دیا ہوا پہلے ہی بہت کچھ موجود ہے....“

”ضرور ہوگا۔ اس کے باوجود آپ اس کے مستحق ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ آپ اس سونے سے بہت کام لیں گے۔ سینکڑوں غریب و یتیم لڑکیاں بیاہیں گے فلاحی کام کریں گے....“

”ہوں۔ اور دوسری بات....“

”دوسری بات یہ ہے کہ میں آپ کے گھر پر آؤں گا۔ آپ سے آپ کی ناگن بہن کا رشتہ مانگنے کے لئے.... “نورالدین نے بے باکی کہہ دیا۔

”بہن اور بیٹیاں دینے ہی کے لئے ہوتی ہیں نورالدین۔ لیکن میں ناگن بہن کے بغیر رہ نہ پاؤں گا....“

”آپ کو رہنا پڑے گا وصی الدین۔ اس لئے کہ یہ نظام قدرت ہے۔ پھر بھی آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم آپ سے ملتے رہیں گے۔ آپ کے گھر میں رہتے بھی رہیں گے....“

”بہت دیر ہو گئی بھائی صاحب.... “آخری لفظ میرے لبوں سے بے ساختگی میں نکل گیا اور اسی کو مشیت ایزدی سمجھ کر میں نے سر جھکا دیا۔



”تم خیریت سے تو ہو ناں وصی.... “وہ میرے قریب آتے ہوئے بولی۔

"آں...." میں چونکا اور حسرت بھری نظروں سے بہن کو تکتا رہ گیا۔

"کیا بات ہے وصی...." وہ مجھے اپنی بانہوں میں سمیٹتے ہوئے بولی۔

"کک، کچھ نہیں آپا۔ کچھ بھی تو نہیں۔ چلئے میری مدد کیجئے۔ رسی کھنچوائیے...."

"کیا ہے رسی میں...." وہ رسی کھینچتے ہوئے بولی۔

"چار تھیلے بندھے ہیں رسی سے۔ ایک میں ہیرے جواہرات ہیں اور بقیہ تین میں سونے کی....۔" میں جملہ مکمل نہ کر سکا۔

وجہ یہ تھی کہ میں نے ریت کے ٹوبے پر دو انسان دیکھ لئے تھے۔ ان میں ایک شر فو تھا اور دوسرا منگل رام۔

میرے اچانک خاموش ہو جانے سے ناگن بہن بھی چونک کر مڑی اور ان دونوں کو دیکھ کر اس کا چہرہ یک بیک ہی بھیانک تر ہو گیا۔

"اوہ.... تو یہ بات ہے۔ پنڈت مادھو چند بھن نے اپنا رنگ دکھا ہی دیا...."

"مم، میں سمجھا نہیں آپا...."

"تمہیں سمجھنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ اپنا کوڑا نکالو اور رسی سے باندھ کر کوڑے پر ہلکا سا دباؤ ڈالو گے تو چاروں تھیلے غباروں کی طرح کھنچے چلے آئیں گے...." کہتے ہوئے وہ ریت کے ٹوبے پر چڑھنا ہی چاہتی تھیں کہ میں نے ان کی کلائی پکڑتے ہوئے کہا۔

"کہاں جا رہی ہیں آپ آپا۔ ان دونوں بھوتوں سے مجھے نمٹنے دیں...."

"بکواس مت کرو۔ جو کہا ہے سو کرو...." اس بار ناگن بہن کے لہجے میں کچھ ایسی کرختگی تھی کہ میں حقیقتاً سہم کر رہ گیا۔

"رک جاؤ شیطانوں...." ناگن بہن ہوا کے بگولے کی طرح اڑتی ہوئی دونوں بھوتوں کے قریب پہنچ گئی۔

دونوں ہی رک گئے لیکن اف.... ان دونوں کی آنکھوں سے بے پناہ اندھیرے میں شعلے سے جھڑتے دکھائی دیئے۔ ان کی ناک کے نتھنوں اور منہ سے چمکدار بھاپ سی نکل رہی تھی۔

منگل رام کی پیشانی سے پھت پھت کرتے ہوئے خون بہہ رہا تھا لیکن زمین پر

گرنے سے پہلے ہی معدوم ہو جاتا تھا۔

"شرفو.... منگل رام۔ مجھے پہچانو۔ جانتے ہو میں کون ہوں...."

آپا کی آواز میں، لہجے میں آسمانی بجلی کے سے کڑاکے تھے۔

"تو ناگن ہے.... تیری وجہ سے ہماری موت واقع ہوئی ہے۔ بھلا ہو گروجی کا کہ اس نے ہمیں نئی زندگی عطا کی۔

"اوئے وصی پھینک دے چاروں تھیلے کھڈ میں۔ یہ سب کچھ میرا ہے تو کہاں لئے جاتا ہے...." شرفو اپنی انگارہ برساتی نظروں سے میری طرف تکتے ہوئے بولا۔ اس کا لہجہ ایسا ہی تھا کہ اگر خونخوار بھیڑیئے بھی سن لیتے تو دم دبا کر بھاگ کھڑے ہوتے۔

"مجھ سے بات کر خبیث...." ناگن بہن کڑکدار آواز میں بولی۔

"تجھے اگر سانپ نہ ڈس لیتے تو یہ منگل تجھے اس کھڈ میں قتل کر دیتا۔ غور سے سن۔ یہ منگل تیرا گروبند نہیں ہے بلکہ تیرے گرو کا اپنا سگا بیٹا ہے...."

"ہوا کرے۔ ٹھہر میں تجھے مزہ چکھاتا ہوں...." کہنے کے ساتھ ہی شرفو نے اپنا منہ کھول دیا۔ اس کا نچلا جبڑا نیچے اور اوپر والا اوپر کی طرف اٹھ گیا۔ بالکل مگرمچھ کے دہانے کی طرح۔

میں نے صرف اتنا دیکھا کہ ناگن بہن کڑکتی ہوئی بجلی بن کر اس کے دہانے میں داخل ہوئی اور باہر نکل کر پھر انسانی وجود میں آ گئی۔

جبکہ شرفو کے حلق سے ایک طویل اور دور تک گونجتی ہوئی چیخ نکلی وہ چیخ بھی درمیان ہی میں رک گئی اور شرفو دو حصوں میں تقسیم ہو کر ریت پر گر پڑا۔ اس کے دونوں حصوں کو شعلوں نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

وہ جلتا ہی رہا تھا کہ منگل رام کی آنکھوں سے دو کڑکتی ہوئی بجلیاں نکل کر ناگن بہن کی طرف لپکیں۔ دیکھتے ہی میرا دل دھک سے ہو کر رہ گیا لیکن پھر فوراً ہی میرے لبوں سے سکون کی طویل سانس نکل گئی۔

ہوا یوں کہ جیسے ہی دو برقیں ناگن بہن کی طرف لپکیں، ناگن بہن نے اپنا ہاتھ بلند کر کے دو انگلیوں سے انگریزی حرف وی کا نشان بنایا۔ اس کی دونوں انگلیوں سے بھی دو کڑاکے

دار کوندے چھوٹے اور منگل رام کے کوندوں سے ٹکرا گئے۔

ایک سماعت شکن گڑاکا ہوا۔ جیسے واقعی آسمانی بجلی کسی چٹان پر گری ہو۔ ناگن بہن کے کوندے منگل رام کے کوندوں کو دھکیلتے ہوئے منگل رام سے ٹکرا گئے۔ منگل رام بھی ایک سماعت شکن چیخ مارتے ہوئے غلیل سے نکلے ہوئے پتھر کی طرح ریورس میں اڑتا ہوا ریت کے ٹوبے کی پشتی جانب زمین پر گر پڑا اور اس کے جسم نے آگ پکڑ لی۔

وہ چیخ و پکار مچی کہ الامان الحفیظ اس وقت تک میں چاروں تھیلے کھینچ کر ریت کے ٹوبے سے اتر چکا تھا۔

"پنڈت مادھو چند...." یک بیک ناگن بہن کے حلق سے ایک چنگھاڑ سی نکلی۔

"اب بزدلوں کی طرح چھپ چھپ کر میرے بھائی پر حملہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں تیری نظروں کے سامنے آرہی ہوں۔ دیکھ لے مجھے۔ جس شیش ناگن کی تلاش میں تو میرے بھیا کے پیچھے لگا ہوا تھا وہ میں ہوں۔ سامنے آ اور مجھ پر قابض ہونے کا خواب پورا کر لے...."

ناگن بہن کے خاموش ہوتے ہی کوئی دس قدم دور ڈھلوان سے ایک شخص اٹھ کھڑا ہوا۔ یہ وہی تھا جسے دوبار میں پشتی طرف سے دیکھ کر ریچھ سمجھ بیٹھا تھا۔

اس کا فرنٹ اس کی بیک سے زیادہ بھیانک تھا۔ گو کہ درمیان میں اچھا خاصا فاصلہ تھا۔ بے پناہ تاریکی تھی۔ اس کے باوجود طلسماتی انداز میں وہ واضح نظر آیا۔

اس کی سفید داڑھی کے بال گوندھے ہوئے تھے، مونچھیں کافی گھنی، پھیلی اور جھکی ہوئی دودھ کی طرح سفید تھیں۔ اس کی بھویں بھی اس قدر گھنی تھیں کہ آنکھیں تقریباً ڈھک کر رہ گئی تھیں۔ یوں لگتا جیسے اس نے برسہا برس سے شیو نہیں بنایا اس کا سینہ بھی سفید بالوں سے بھرا ہوا تھا۔

گو کہ اس کی آنکھیں اس کی بھوؤں سے ڈھکی ہوئی تھیں تاہم ہوا کے دباؤ سے بال اڑ رہے تھے اس کی چنگاریوں کی مانند سلگتی آنکھیں دیکھی جا سکتی تھیں۔

"یہ دیکھ مادھو چند...." کہنے کے ساتھ ہی ناگن بہن کا کمر سے اوپری جسم یوں حرکت کرنے لگا جیسے اسے قے ہونے والی ہو۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر میں گھبرا کر اس کی

طرف بڑھا لیکن اس نے مجھے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔

تیسری اکائی کے ساتھ ہی اس کے منہ سے کوئی دو سو گرام وزنی ناگ منی نکل کر اس کے ہاتھ میں پہنچ گئی۔

سبحان اللہ۔ یوں لگا جیسے آسمان سے چودھویں کا چاند اتر کر میری بہن کی ہتھیلی میں سمٹ گیا ہو۔



"دیکھا تو نے مادھو چند۔ یہی وہ ناگ منی ہے جسے حاصل کرنے کے بعد تو امر ہو جانا چاہتا تھا۔ ہے ہمت تو مجھ سے ناگ منی چھین لے۔ . . ." ناگن بہن کڑکتی آواز میں بولی۔ اس کی آواز سے پورا ویرانہ گونج اٹھا تھا۔

ناگ منی کی روشنی یا چمک کا یہ عالم تھا کہ بیسیوں قدم اطراف کا ذرہ ذرہ روشن ہو چکا تھا۔ آنکھیں چندھیانے لگی تھیں اور ہر طرف سے چھوٹے بڑے ہر رنگ و نسل کے سانپ اور اژدہے بڑی تیزی سے ناگن بہن کی طرف لپکنے لگے تھے۔ ہر سمت سے ان کی پھنکاریں گونجنے لگی تھیں۔

معاً مادھو چند نے اپنے دونوں ہاتھ بلند کر لئے۔ پہلی بار میں نے دیکھا کہ اس کے ناخن چار انچ سے کچھ زیادہ ہی لمبے تھے۔ اس کی ہر انگلی سے لہریئے مارتی برقی شعاعیں کوندیں۔ اس کی آنکھوں سے بھی دو سلگتی ہوئی گیند سائز شعاعیں نکلیں جو ناگن بہن کے قریب ہوتے ہوتے آگ کے بہت بڑے بڑے الاؤ کا حجم پکڑ گئیں۔

میں گھبرا گیا، میں نے ایک لمحہ کی تاخیر کے بغیر اپنا ہنٹر کھینچ لیا۔ وہ تمام سانپ اور اژدہے اپنی اپنی جگہ رک چکے تھے۔ پھر اس سے پہلے کہ میں ہنٹر کو حرکت دیتا، آپا کی ہتھیلی میں پکڑی ہوئی ناگ منی سے لاتعداد مسلسل دھار والی انتہائی چمکدار لہریں نکلیں اور مادھو چند کی چھوڑی ہوئی آگ اور چنگاریوں سے لپٹ پڑیں۔

ایک ساعت شکن دھماکہ ہوا۔ یوں لگا جیسے آتش فشاں پھٹ پڑا ہو۔ ایک لمحہ کے نصف حصے میں سب کچھ حرف غلط کی طرح مٹ گیا۔ صرف ناگ منی کی فرحت بخش روشنی ہی باقی رہ گئی تھی۔

ایک بار پھر سانپوں اور ناگوں اژدہوں نے ناگن بہن کی طرف رینگنا شروع کر دیا۔

"ای.... ای.... ای خی خی خی...." ناگن بہن کے قہر و غضب سے بھرے قہقہے سن کر خوف کی تیز ترین پھریریاں سی میرے رگ و پے میں دوڑنے لگیں۔

"تیرا چھوڑا ہوا شعبدہ تجھ پر بھی الٹ سکتا تھا مادھو۔ میں تجھے موقع دے رہی ہوں مادھو چند۔ تیری زندگی اور موت کے بیچ اب صرف چند لمحے باقی رہ گئے ہیں۔ انت ہونے والا ہے تیرے جیون کا۔ ناگ منی حاصل کر لے یا اپنی زندگی بچا لے...." ناگن بہن کے الفاظ ختم ہونے تک وہ تمام سانپ واژدہے ہوا کی رفتار سے رینگتے ہوئے مادھو چند کی طرف بڑھنے لگے تھے۔

معاً مادھو چند نے جے بھولے ناتھ کا کفرانہ نعرہ لگایا اور فوراً اس سے پہلے کہ کوئی محیر العقل واقعہ رونما ہوتا، مادھو چند کا سر سے کمر تک کا جسم ایک بہت بڑے اژدہے کے منہ میں جا گھسا۔ گھسا ہی تھا کہ دوسرے اژدہے نے جھپٹا مار کر اس کا بقیہ جسم اپنے منہ میں لے لیا۔

اور پھر دونوں اژدہوں نے اپنی اپنی طرف زور لگا کر مادھو کے دو ٹکڑے کر دیئے۔

ناگن بہن نے ناگ منی نگل لی۔ تمام ٹھنڈی روشنی اندھیرے میں بدل گئی۔ وہی سناٹا، وہی رات کی سیاہی وہی ابدی سکوت ہر طرف چھا گیا۔

"ویرا...." ناگن بہن میری طرف متوجہ ہوئی۔ ناگ منی کی روشنی معدوم ہوتے ہی تمام زہریلے ارضی جانور اپنے اپنے راستے لگ چکے تھے۔

"یہ مادھو چند محض میری وجہ سے تمہارا دشمن بنا تھا۔ اس کی موت کا مجھے رنج بھی ہے۔ تاہم خوشی بھی ہے کہ مستقبل کے ایک بہت بڑے شیطان سے نسل انساں کو آزادی مل گئی۔ اب تم مجھے یہ بتلاؤ کہ یہ چاروں تھیلے تم نے کیسے حاصل کیے...."

"یہ سب اللہ کی دین ہے آپا...." میں نے ٹالنے والے انداز میں کہا۔

ناگن بہن نے کوئی جواب نہ دیا اور تھیلوں پر اچٹتی سی نظر ڈال کر اس راستے کی طرف بڑھ گئی جس طرف سے ہم کھڈ تک پہنچے تھے۔

چاروں تھیلے میں نے اپنے ہنٹر سے باندھ لئے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چاروں وزنی تھیلے پھولوں کی طرح ہلکے پھلکے محسوس ہوئے۔

"ویرا.... تم مجھے بجھے بجھے سے کیوں لگ رہے ہو....." ہم بہت جلد گھنی جھاڑیوں کے درمیان پہنچ گئے۔ ناگن بہن نے بالکل ہی متبادل راستہ اختیار کیا تھا۔

"آپ بلاوجہ پریشان ہو رہی ہیں آپا۔ کہہ دیاناں کہ کچھ بھی نہیں ہے۔ گڑھے میں اترتے اور گڑھے سے نکلتے ہوئے تھک گیا تھاناں۔ اس لئے آپ کو یوں محسوس ہو رہا ہے...."

"میرے بھائی، میرے لال۔ تم کب تک چھپاؤ گے۔ میں دیکھ رہی ہوں کہ تمہارے وجود پر ایک خول سا چڑھا ہوا ہے۔ تسلیم کرتی ہوں کہ اس خول کے پار میری نظریں نہیں پہنچ رہیں۔

تاہم میں جان کر رہوں گی کہ ایسی کون سی قوت ہے جس نے تمہیں سراب میں لپیٹ رکھا ہے...."

"آپا.... یہ سب کچھ آپ کی بڑھی ہوئی محبت بول رہی ہے۔ آپ اتنا نہیں سوچتیں کہ اللہ کے حکم سے جس شخص کی جنات تابعداری کرتے رہے ہوں، اس پر کوئی دوسری قوت کیسے اپنا خول چڑھا سکتی ہے...."



مجھے یہ دیکھ کر واقعی تعجب ہوا کہ وہاں نہ تو کوئی ڈاک بنگلا تھا، نہ ہی فاریسٹ آفیسر اور نہ ہی کوئی دوسرا تیسرا انسان تھا۔ بلکہ وہ ایک چھوٹا سا میدان تھا جہاں میری جیپ کھڑی ہوئی تھی۔

میں نے چاروں تھیلے جیپ میں رکھ دیے اور ڈرائیونگ سیٹ پر جم کر بیٹھ گیا۔ ناگن بہن میرے قریب ہی سیٹ پر بیٹھ چکی تھی۔ میں نے مین لائٹ آن کیں اور انجن اسٹارٹ کر دیا۔

"سدرہ کیسی ہے وصی...." جیپ جونہی ایک راہ پر لگی، ناگن بہن نے مجھ سے گھریلو ماحول پر پہلا سوال کیا۔

"وہ چودھرائن کی موت کے غم سے تو سنبھل چکی ہے آپا لیکن آپ کی گمشدگی کی خبر ملتے ہی وہ مرجھا کر رہ گئی تھی...."

"خوش نصیب ہو وصی۔ سدرہ واقعی لاکھوں میں ایک ہے مجھے اس وقت بے پناہ خوشی ہو گی جب اس کی گود بھرے گی...."

"آپا.... میں سوچ رہا ہوں کہ آپ کی شادی بھی کروادوں...."

"ہائے ہائے۔ تم کہیں سچ مچ پاگل تو نہیں ہو گئے...."

"اس میں پاگل پن کی کیا بات ہے آپا...." میرے لہجے میں جھلاہٹ سما گئی۔

"ایک نہ ایک دن تو بہنوں کو جدا ہونا ہی ہے...."

چونکہ میں نے پہلی بار آپا کے ساتھ سخت لہجے میں بات کی تھی اس لئے آپا بہت بری طرح چونک کر میری طرف تکنے لگیں۔ مجھے شدت سے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔

"آپا۔ مجھے معاف کر دینا...." آپا غریق حیرت ہو گئی اور مجھے دوسری بار اپنی غلطی کا احساس ہوا۔

"اللہ کی پاک ذات کے علاوہ کون مجھے تم سے جدا کر سکتا ہے۔ تم بخوبی جانتے ہو کہ میں ایک ناگن ہوں۔ میری رگ رگ میں زہر بھرا ہوا ہے۔ زہر بھی ایسا کہ بدروحیں بھی اس سے محفوظ نہیں رہ سکتیں۔

"ناں ویراناں۔ مجھے موت کے علاوہ کوئی بھی قوت تم سے جدا نہیں کر سکتی...."

"آپا.... آپ جانتی ہیں یہ چاروں تھیلے مجھے کس نے دیئے ہیں...." دوران گفتگو ہماری جیپ دراڑ عبور کر چکی تھی۔ مجھے وہ پرانی جیپ کہیں بھی نظر نہ آئی جو دراڑ ہی کے دامن میں الٹی پڑی میں نے دیکھی تھی۔

"نہیں.... تم جب تک مجھے بتلاؤ گے نہیں تو مجھے کیسے پتہ چل سکتا ہے...."

"یہ خزانہ مجھے نورالدین نے دیا ہے...."

"کون نورالدین...." آپا ایک بار پھر چونک پڑیں۔

"وہ.... وہ آپ ہی کی نسل سے ہے۔ شیش ناگ ہے اور کھڈ کی گہرائی میں میرا ہی منتظر تھا۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ ہفتے میں دو تین بار مجھے آپ سے ملواتا رہے گا۔ راتیں

اور دن بھی میرے گھر پر گزارے گا۔۔۔۔" میں جذبات کی رو میں بہتا چلا گیا اور آپا کو وہ سب کچھ بتلا دیا جو نورالدین نے مجھ سے کہا تھا۔ اب میری جیپ ویرانوں کو عبور کر کے مین روڈ پر پہنچ چکی تھی اور جیپ کا رخ پنڈ دادن خان ہی کی طرف ہو گیا تھا۔

"ہوں۔۔۔۔ تو یہ بات ہے۔۔۔۔" ناگن بہن ہنکارہ بھرتے ہوئے بولی۔

"اسی وجہ سے تمہارا دماغ الٹا ہوا تھا۔ سن میرے بھائی۔ آج تو تم نے اس ٹاپک پر بات کی ہے۔ آئندہ کبھی بھی مجھ سے ایسی بات نہ کرنا۔۔۔۔"

"آپا۔۔۔ میں، میں نورالدین کو زبان دے چکا ہوں۔۔۔۔"

"خاموش۔ تمہیں یاد ہو گا۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ میں تمہارے بچوں کو کھلاؤں گی۔۔۔۔"

"کھلانا آپا ضرور کھلانا۔ کیا آپ کے بغیر میں زندہ رہ سکتا ہوں۔ ایک شفیق ماں کے بغیر اس کا بیٹا رہ سکتا ہے۔۔۔۔"

"میں بھی تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔ اب میری آخری بات بھی سن لو۔ تمہارا پہلا بچہ ہونے تک اس موضوع پر کوئی بات نہیں ہو گی۔ سمجھے۔۔۔۔"

"مان لیں وصی الدین آپ اپنی بہن کی بات مان لیں۔۔۔۔"

غیر متوقع طور پر پشتی سیٹ سے نورالدین کی آواز سن کر میں اس بری طرح چونکا کہ اگر مہارت سے اسٹیئرنگ کنٹرول نہ کر لیا ہوتا تو کوئی نہ کوئی حادثہ ضرور پیش آجاتا۔ حیرت صرف آپا کے انداز پر ہوئی۔ وہ نہ تو چونکی اور نہ ہی اس نے گردن موڑ کر پشتی سیٹ کی طرف دیکھنے کی زحمت گوارا کی۔

"حرج ہی کیا ہے۔ آپ کے گھر میں جب تک نیا مہمان نہیں آجاتا میں پیغام لے کر نہیں آؤں گا۔ اگر آپ کی بہن اصرار کرے گی تو میں مستقل طور پر آپ کے ساتھ رہ لوں گا۔ خدا حافظ۔۔۔۔"

آخری لفظ کے ساتھ ہی نورالدین بھک سے غائب ہو گیا۔ مین نے کن انکھیوں سے ناگن بہن کی طرف دیکھا۔ وہ بالکل سنجیدہ تھیں۔

"آپا۔۔۔ کیا آپ نورالدین کے وجود سے واقف تھیں۔۔۔۔"

”ہاں.... وہ شروع ہی سے ہمارے ساتھ ساتھ رہا ہے۔ میں نے اپنی نسل کی بو پالی تھی ۔میں انجان اس لئے بنی رہی کہ اسے میری خواہش کا پوری طرح علم ہو جائے....“



صبح کی اذانیں ہو رہی تھیں جب میری جیپ میری حویلی کے مین گیٹ پر پہنچی، پہلے ہی ہارن پر دروازہ کھل گیا اور دروازہ کھولنے میں پیش پیش سدرہ تھی، میری بہنیں تھیں اور میرے بہوئی تھے۔

عید کا سماں ہو گیا۔ میرے بہوئیوں کے علاوہ حویلی کی سبھی خواتین ناگن بہن سے اس طرح لپٹ پڑیں جیسے برسوں بعد ملاقات ہوئی ہو۔ سوائے سدرہ کے کوئی بھی نہ جان سکا کہ ناگن بہن کے ساتھ کیا معاملات پیش آئے تھے۔ صبح کی نماز کے بعد ہم سب نے ایک ہی دستر خوان پر بیٹھ کر ناشتہ کیا تھا۔

صبح نو بجے میں اپنی حویلی سے بڑی حویلی پہنچ گیا اور شام ہونے تک وہیں رکا رہا تھا بڑی حویلی کے بچے تو مجھ سے اس قدر مانوس ہو چکے تھے کہ شام تک مجھ سے الگ نہیں ہوئے تھے۔

مغرب کی نماز میں نے اپنے ہی محلے کی مسجد میں پڑھی تھی۔ رات میں جب میں اپنے کمرے میں پہنچا تو سدرہ کے چہرے پر بے پناہ مسرتوں کے ساتھ ایک بے چینی بھی کروٹیں لے رہی تھی۔

”میں نے ۔آپ کی آمد کی خوشی اور شکرانے کے نوافل بھی پڑھے تھے اور غربا و مساکین کو بہت سا روپیہ اور کپڑا لتا بھی دیا ہے۔ آپا کا صدقہ بھی اتارا تھا۔ لیکن ان کی کسی ادا سے ظاہر نہیں ہو رہا تھا کہ وہ اصل میں ایک ناگن ہیں۔ وہ جب اپنے کمرے میں تھیں تب بھی جاگ رہی تھیں۔ لگتا تھا کہ وہ کھلی آنکھوں سے کوئی مدہوش کن سپنا دیکھ رہی ہیں....“

سدرہ مجھ سے بولی۔ اس کی باتیں سن کر میں اس کے بھولپن پہ مسکرا دیا۔

”جانِ من۔ وہ کھلی آنکھوں سے کوئی سپنا نہیں دیکھ رہی تھیں بلکہ وہ سکون کی نیند سو رہی تھیں۔ ہاں سدرہ میرا یقین کرو....“ سدرہ کے چہرے پر غیر یقینی کی پرچھائیاں دیکھ

کر میں اپنے الفاظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔

"ناگن یا ناگ کی آنکھوں کے پپوٹے نہیں ہوتے۔ وہ جب سو جاتے ہیں تب بھی ان کی آنکھیں کھلی ہی رہتی ہیں یہ الگ بات ہے کہ ان کی کھلی آنکھوں پر اللہ تعالیٰ نے خوابناک پردے حائل کر دیئے ہوتے ہیں۔

اچھا بتلاؤ۔ جب سے آپا تمہارے ساتھ ہے، تم نے اسے کبھی بھی کھانا وغیرہ کھاتے دیکھا ہے...."

"اں.... نن نہیں تو۔ کبھی کبھار انہیں صرف دودھ پیتے دیکھا ہے...." وہ چونکی اور تحیر خیز لہجے میں بولی۔

"یہی آپا کے غیر انسانی ہونے کی دوسری علامت ہے۔ لیکن سدرہ بہت جلد ہمیں آپا سے جدا ہونا پڑے گا...."

"وہ کیوں...." سدرہ بجھ سی گئی۔

"دو وجوہات ہیں...." میں بھی غمزدہ ہو گیا۔

"پہلی اور اہم وجہ یہ ہے کہ میں ہر وقت گھر میں نہیں ہوتا۔ اکثر پنڈ سے باہر بھی چلا جایا کرتا ہوں۔ ہمارے پنڈوں میں اکثر اوقات سپیرے گھوما کرتے ہیں۔ بعض عمر رسیدہ سپیرے اس قدر ماہر ہوتے ہیں کہ وہ فضاء میں ہی شیش ناگن کی بو محسوس کر لیتے ہیں۔

اگر انہیں پتہ لگ جائے کہ ہمارے گھر میں شیش ناگن موجود ہے تو وہ ہر قیمت پر اسے حاصل کرنے کی سعی کریں گے۔ مانتا ہوں کہ ہر شیش ناگن نسل کے کسی بھی سانپ کا ڈسا ہوا انسان پانی بھی نہیں مانگ پاتا تاہم سپیرے اکثر زہر پروف ہوتے ہیں۔ نہ بھی ہوں جب بھی وہ زہر سے بچاؤ کے بہت سے طریقے جانتے ہیں۔

وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ شیش ناگ نسل کے سانپ جوگیوں اور سپیروں کے جانی دشمن ہوتے ہیں کسی وقت بھی موقع پاتے ہی سانپ انہیں ڈس لے گا۔ اس لئے وہ پہلے سے ایسی کسی افتاد کے لئے تیار ہوتے ہیں۔

دوسری اور اہم وجہ یہ ہے کہ نورالدین نام کا ایک شیش ناگ جو اپنی عمر کے سو برس پورے کرنے کے بعد جون بدلنے پر قادر ہو چکا ہے، وہ ناگن آپا سے شادی کرنا چاہتا

ہے....“

”کیسی عجیب و غریب باتیں بتلا رہے ہیں۔ میرا تو دماغ ہی چکرانے لگا ہے۔ کہاں ملا تھا آپ کو شیش ناگ....“

سدرہ کے سوال پر میں نے اسے شرفو اور منگل رام سے مڈبھیڑ کا پورا واقعہ سنانے کے بعد پاتال نما کھنڈر میں داخل ہونے سے نکلنے تک کے پورے واقعات بتلا دیئے۔ اسے یہ بھی بتلا دیا کہ ناگن بہن نے شادی کے لئے کیا شرائط عائد کر دی ہیں۔

”یہ....یہ تو بہت ہی خوش آئندہ بات ہے۔ ہم ڈبل اسٹوری بنا لیتے ہیں۔ اوپر کا حصہ ان کو دے دیں گے...“

”مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن پھر تو میرا خیال دو طرف بٹ جائے گا۔ ناگن بہن کے ساتھ ناگ بھائی کی سپیروں سے حفاظت کی ذمہ داری بھی مجھ پر فرض ہو جائے گی....“

”اونہہ چھوڑیئے اس قصے کو جب وقت آئے گا تو اللہ کوئی نہ کوئی حل بھی نکال دے گا۔ اب لگے ہاتھوں یہ بھی بتلا دیجئے کہ ان چار تھیلوں میں کیا ہے....“

”خزانہ۔ یہ سدرہ خزانہ۔ دیکھو ناں تحریک آزادی کس قدر زور پکڑ چکی ہے۔ اللہ نے چاہا تو علامہ اقبال کے خواب کی روشن تعبیر ضرور ظاہر ہو جائے گی۔ قائداعظم محمد علی جناح کی ولولہ انگیز قیادت میں پاکستان بن کر رہے گا اور ہمارے وہ مسلمان قافلے جو پاکستان کے عشق میں ڈوبے ہوئے آئیں گے، میں اس خزانہ سے ان کی ہر امکانی مدد کروں گا۔ آآ آ ع....“ مجھے ایک طویل جمائی ہوئی اور سدرہ جان گئی کہ نیند نے مجھے سمیٹ لیا ہے۔



”چغتائی باؤ۔ گل تے سنڑوں....“ ایک مردانہ آواز سن کر میں نے جیپ روک دی۔

صبح کا سہانا وقت تھا۔ ہر طرف بہار ہی بہار چھائی ہوئی تھی بہت ہی خوشگوار ہوائیں چل رہی تھیں۔ تقریباً پورا گاؤں جاگ چکا تھا۔ انسانوں کی اچھی خاصی چہل پہل لگی ہوئی تھی اور میں اپنے باغ کی طرف جا رہا تھا۔

یہ ایک ہفتہ بعد کا واقعہ ہے۔ میری بہنیں اپنے شوہروں کے ساتھ جا چکی تھیں، نہ

تو میری حویلی میں اور نہ ہی بڑی حویلی میں میرے رشتہ داروں میں سے کوئی باقی رہ گیا تھا۔

"السلام علیکم باؤ جی....." جھٹ سے میرے قریب پہنچتے ہوئے تخاطب نے سلام کیا۔ وہ ادھیڑ عمر ہونے کے ساتھ ساتھ کافی مضبوط تن و توش رکھتا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں گنڈاسہ بھی تھا۔

"واعلیکم السلام مندری....." میں نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ میں اسے جانتا تھا۔ میرے علاقے کا چوکیدار تھا۔ نام اس کا مسعود تھا لیکن مندری کے سرنیم سے پورے گاؤں میں نیک شہرت رکھتا تھا۔

"کی گل ہے یارا۔ سویرے سویرے کالے بلے ورگوں میرا راستہ کیوں کٹڑوں لگا ایں....."

"گل ہی نہ نے پچھو باؤ جی....." مندری منہ چڑھاتے ہوئے بولا۔

"تین شبانہ روز سے میں ایک خونخوار آنکھوں والے جوگی کو تہاڈی حویلی دے چکر کٹدے دیکھتا رہا ہوں....."

انکشاف ہی ایسا تھا کہ میرا دل دھک سے ہو کر رہ گیا۔ میرے ذہن پر گویا پٹاخے سے پھوٹنے لگے۔

"راتی میں انوں روکیا سی۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ میرے سرکار کے گھر کے چکر کیوں کاٹ رہا ہے....." مندری میری اندرونی کیفیت سے بے خبر مجھے بتلاتا رہا۔

اس نے بتلایا کہ آپ کی حویلی کے کسی حصے میں دنیا کا خطرناک ترین سانپ موجود ہے۔ میں ہر قیمت پر اسے حویلی سے نکلنے پر مجبور کر دوں گا اور پورے گاؤں والوں کے سامنے اس کی گردن دبوچ کر اسے لے جاؤں گا.....باؤ جی میں ڈر گیا۔ میں جانتا ہوں کہ ماضی میں کتنے لوگ ہلاک ہو چکے ہیں اسی لئے آپ کو ہوشیار کرنا ضروری سمجھ کر آواز دی ہے....."

"آہم.....وہ جوگی اس وقت کہاں مل سکتا ہے....." میں فیصلہ کن ہنکارہ بھرتے ہوئے بولا۔

"پتہ نہیں باؤ جی۔ میں نے تو اسے بیر کوں والے کھنڈرات کی طرف جاتے ہوئے دیکھا تھا....." وہ سلام کر کے چلا گیا مگر میں اسٹیئرنگ تھامے بڑی دیر گم صم بیٹھا رہا۔

پھر سر جھٹک کر میں ایک فیصلے پر پہنچ گیا اور جیپ کو ریورس گیئر میں ڈال کر اپنی حویلی کے پھاٹک تک پہنچ گیا اور جب میں سنجیدہ چہرہ لئے بوکھلایا ہوا گھر میں داخل ہوا تو ملازماؤں سمیت سدرہ اور آپا بھی میرا چہرہ دیکھ کر بوکھلا گئیں۔

"کیا ہوا ویرا۔ تم اتنے پریشان کیوں ہو....." ناگن بہن نے مجھ سے پوچھا۔ سدرہ نے مجھ سے پوچھنے کی ہمت نہ پکڑی وہ صرف بے چینی سے ہاتھ ملتی رہ گئی۔

"کچھ نہیں آپا، بس یونہی...." میں نے ٹالنے والے لہجے میں کہا۔

"اگر کچھ نہیں ہے تو پھر یہ کوڑا، خنجر اور ریوالور کیوں نکال رہے ہو...."

"احتیاطاً احتیاطاً...." میں کوڑے کو لپیٹ کر اپنے دائیں بازو سے گزار کر کندھے سے ٹکاتے ہوئے بولا۔

"ہوں.... کیا تم ایک جوگی کی وجہ سے پریشان نہیں ہوئے....؟"

"آپا.... کیا آپ جانتی ہیں...."

"ہاں ویرا۔ وہ تین شبانہ روز سے میری تلاش میں ہے۔ وہ چند مرتبہ ہمارے دروازے کے سامنے مجمع بھی لگا چکا ہے۔ ایک ایک گھنٹے تک بین بجا بجا کر لوگوں کو سانپوں کا تماشہ بھی دکھاتا رہا ہے۔ اگر اگر میرے کمرے میں قرآن حکیم کی مختلف آیات ٹانگی ہوئی نہ ہوتیں تو.... تو...... کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ بین کی مدھ بھری لے پر میرا جسم تھرکنے لگتا ہے۔ میرے ہر بن موء سے پسینے کے سوتے سے پھوٹنے لگے تھے۔ میں بار بار دروازے تک جاتی اور پھر اللہ کی رحمتیں مجھے روک دیتیں...."

"بہت ظلم کیا ہے آپ نے اپنی جان پر۔ آپ مجھے پہلے ہی دن بتلا دیتیں تو آج بات آگے نہ بڑھتی...." دکھ و غضب کی ملی جلی کیفیات سے میں کمرے سے نکلا چلا گیا۔

اور جیپ کو بستی کے پچھواڑے کافی فاصلے پر بیرکوں کے کھنڈرات کی طرف موڑا تو کرب و اذیت نے مجھے جکڑ کر رکھ دیا۔ یہ سوچ سوچ کر میں ہلکان ہوتا رہا کہ سپیروں اور جوگیوں کو کس طرح روکا جا سکتا ہے۔ ناگن بہن کو کس طرح اس کے ازلی دشمنوں سے محفوظ رکھا جا سکتا ہے۔

اس کا بہتر حل یہی ہے کہ.... ناگن بہن کو نور الدین سے بیاہ ہی دوں۔ لیکن،

پریشانی یہ تھی کہ ناگن بہن میری اولاد کو دیکھے بغیر ہرگز ہرگز رضامند نہیں ہوگی۔

”آپ کا خیال درست ہے وصی الدین....“ ایک پھنکارتی آواز سن کر میں اس طرح اچھل پڑا جیسے میرے کولہوں میں سوئیاں چبھ گئی ہوں۔

پھر، پشتی سیٹ سے رینگتے ہوئے سیاہ ناگ کو دیکھ کر اور آواز کے ترنم کو پہچان کر میرے لبوں سے سکون کی طویل سانس نکل گئی۔

وہ شیش ناگ ہی تھا جو رینگتے ہوئے میرے برابر والی سیٹ پر کنڈلی مارنے لگا تھا۔ اس کی پھنکاروں نے ایک گونج سی مچار کھی تھی۔

”السلام علیکم بھائی صاحب....“ جیسے ہی وہ پھن پھیلا کر بیٹھا میں نے سلام داغ دیا۔

”واعلیکم السلام۔آپ کے لئے ایک خوشخبری ہے وصی الدین۔ میری بھابی سدرہ کو حمل ٹھہر چکا ہے اور آپ کی بہن کی ضد اسی سال ختم ہو جائے گی....“

کوئی اور لمحہ ہوتا تو شاید میں خوشی سے پاگل ہو جاتا۔ ناچنے لگتا لیکن، میں جو مقصد لے کر جارہا تھا۔ اس کے لئے نورالدین کی موجودگی میرے لئے مزید مسئلہ طلب بن گئی تھی۔

”آپ کب آئے بھائی صاحب....“ میں نے الجھن بھرے انداز میں پوچھا۔

”ابھی ابھی پہنچا ہوں۔ اللہ نے مجھے وہ قوت عطا کی ہوئی ہے کہ میں ایک لمحہ میں اپنی پاتال سے یہاں پہنچ سکتا ہوں۔آپ کے ذہن میں جب بھی میرا تصور جاگے گا میں انشاء اللہ پہنچ جایا کروں گا....“

”پھر تو آپ یہ بھی جان چکے ہوں گے کہ میں کھنڈرات کی طرف کیوں جانے لگا ہوں....“

”جی ہاں۔ اسی لئے میں نے خود کو ظاہر بھی کیا ہے۔ جون اس لئے نہیں بدلی کہ جوگی، جس کی تلاش میں آپ جارہے ہیں، وہ ایک غیر معمولی انسان ہے۔ میری بو پا کر ہی وہ سامنے آئے گا۔وہ جان چکا ہے کہ آپ کیوں اس کی طرف جارہے ہیں۔ میری موجودگی کے بغیر آپ اسے اس کے اصل روپ میں تلاش نہیں کر سکتے تھے۔

وہ ہے تو گوجر، اس کا نام بھی ضیاء الدین ہے لیکن وہ مردار گوشت کھاتا رہا ہے، زہریلے سانپوں کا زہر پی پی کر، سفلی علم کے ذریعے خود کو ناقابلِ تسخیر سمجھ چکا ہے۔ میری پاتال کی بلندیوں پر بھی اس نے کئی کئی راتیں گزاری ہیں۔ وہ ہوا کی طرح رہتا ہے۔ اکثر گدھ بن کر گاؤں گاؤں قریہ قریہ گھومتا رہتا ہے۔

میری بو پا کر وہ انسانی روپ میں ظاہر ہوگا۔ آپ اس عجائبات سے لبریز کوڑے کو کھول دیں اور اپنے سر سے اپنے جسم کے گرد گھما دیں اس طرح آپ حصار زدہ ہو جائیں گے۔ آپ کی ناگن بہن بھی پہنچ رہی ہے۔ ہم دونوں مل کر اسے شکست دینے کی کوشش ضرور کریں گے....."



میں نے جیپ روک دی۔ تیز ہوائیں شروع ہی سے چل رہی تھیں۔ ہر سمت دھوپ چٹخی ہوئی تھی۔ ہوا کے دباؤ پر گرد و غبار کے بادل بھی اٹھ رہے تھے لیکن میری نظریں اس لمبے تڑنگے جوگی پر مرکوز تھیں جو بیرک کھنڈرات کے دامن میں چھوٹے بڑے پتھروں کے ٹیلے کے اوپر کھڑا ہوا مجھ ہی کو گھور رہا تھا۔

شاید سورج کی تمازت کے باعث اس کی رنگت بالکل سلگتے تانبے کی سی تھی یا پھر ہو سکتا ہے کہ وہ زعفرانی لباس میں ملبوس ہونے کی وجہ سے ایسا لگتا ہو۔ اس کے اوپر اور میرے درمیان صرف چند قدموں کا فاصلہ تھا۔

"تو خود نہیں آیا نوجوان بلکہ تجھے تیری موت کھینچ لائی ہے۔ شاید تو نہیں جانتا کہ تیری جیپ میں ایک خطرناک ترین ناگ بھی چھپا ہوا ہے۔ مجھے تجھ سے کچھ نہیں لینا۔ بلکہ کسی انسان سے میری کوئی دشمنی نہیں ہے۔ بہتر ہے کہ تو چلا جا اور مجھے اپنا کام کرنے دے....."

اس کی بات ختم ہونے تک میں نہ صرف جیپ سے اتر چکا تھا بلکہ اپنا کوڑا لہراتے ہوئے اس سے قریب بھی ہو چکا تھا۔

"ضیاء الدین گوجر۔ تیرے الفاظ سے سڑے ہوئے گوشت کی بو آ رہی ہے۔ جانتا ہے تو جان لے، نہیں جانتا تو پہچان لے کہ میرا نام وصی الدین چغتائی ہے اور اللہ کے حکم

سے میں اس کا محافظ ہوں جس کی تلاش ہے تجھے....“

کہنے کے ساتھ ہی میں نے برقی سرعت سے ریوالور نکال کر بیک وقت دو فائر اس کی آنکھوں میں جھونک دیئے۔

وہ غالباً اس کے لئے تیار نہیں تھا یا پھر ہو سکتا ہے مشیت خداوندی یہی تھی کہ میرا نشانہ کارگر ثابت ہوا۔ ضیاء الدین کے لبوں سے ویرانے کو لرزا دینے والی ایک چیخ نکلی، اس نے بید مجنوں کی طرح جھرجھراتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ آنکھوں پر رکھ لئے اور پشتی طرف الٹ گیا۔

پھر پتھروں کے ٹیلے سے لڑھک کر زمین پر پہنچنے سے پہلے ہی میں موت کے فرشتے کی طرح اس کے سر پر پہنچ گیا۔ وہ زمین پر پڑا پھڑپھڑا رہا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھوں سے اس کے خون کی دھاریں نکل رہی تھیں۔

میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ وہ اس حالت میں بھی اٹھ کھڑا ہوگا۔

لہٰذا کوئی لمحہ ضائع کئے بغیر میں نے خنجر کھینچ لیا اور ایک ہی ضرب میں اس کی گردن اور نرخرہ کاٹ دیا۔

”صد آفرین وصی الدین صد آفرین....“ پشت پر نور الدین کی آواز سن کر میں اپنی ہی آستین سے اپنے ماتھے کا پسینہ پونچھتے ہوئے مڑا۔ وہ شیش ناگ ہی تھا مگر انسانی وجود میں تھا۔

”شاید اسی لئے میرے رب نے آدمی کو اشرف المخلوق کا خطاب عطا کیا ہے۔ میں جان ہی نہ سکا کہ آپ یوں کرنے والے ہیں اگر آپ ایسا نہ کرتے تو.... یہ زہریلا انسان صرف آپ ہی کے لئے نہیں بلکہ ہمارے لئے بھی بے پناہ مشکلات کھڑی کر دیتا....“

”ہمارے لئے آپ کی مراد کیا ہے....“ میں جوگی کے ساکت ہوتے جسم پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالتے ہوئے بولا۔

”ٹیلے کی دوسری طرف جیپ میں آپ کی ناگن بہن بھی بیٹھی ہوئی ہے....“ میرے لبوں سے ایک درد بھری آہ نکل گئی۔ میرا پورا وجود جھرجھرا کر رہ گیا یہ سوچ کر کہ ناگن بہن جانتی تھی کہ جوگی کس قدر خطرناک تھا اس کے باوجود وہ مجھ پر قربان ہونے کو پہنچ گئی۔

"میں جا رہا ہوں وصی...." کہتے ہوئے وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گیا اور میں وہیں رک کر جوگی کی لاش کے متعلق سوچنے لگا۔

"کیا سوچ رہے ہو ویرا...." میں ناگن بہن کی آواز سن کر اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس کے چہرے پر آسودگی تھی۔

"میں نے آپ کو منع کیا تھا ناں آپا...."

"کیا وہ چلا گیا...." ناگن آپا میرا سوال نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔

"پھاوڑا لائیے جیپ سے آپا...." میں لبوں سے تھکا دینے والی سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔

"کیا اپنے سر پر مارو گے یا میرے...." جواب ہی ایسا تھا کہ میں مسکرائے بنا نہ رہا۔

"گڑھا کھود کر جوگی کی لاش دفن کروں گا...."

"شکر ہے تم مسکرائے تو سہی...." کہتے ہوئے ناگن بہن مڑ گئی۔ چالیس منٹ کی جدوجہد کے بعد میں نے جوگی کی لاش دفنا دی۔ ناگن بہن نے بھی گڑھا کھودنے میں بہت مدد کی تھی۔

"آپا.... میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اب آپ کو رخصت کر ہی دوں...." میں جیپ کو گاؤں کی طرف موڑتے ہوئے بولا۔

"میری بات بھی ذہن نشین کر لو۔ بے شک جان چلی جائے، مگر تمہاری اولاد کا دیدار کیے بغیر نہیں جاؤں گی...."

"آپا.... آپا سمجھنے کی کوشش کریں۔ جب آپ ایک لمحہ میں ادھر سے ادھر پہنچ جاتی ہیں تو پھر بلاوجہ ضد کیوں کر رہی ہیں...."

"میں نے جو کہہ دیا۔ سو کہہ دیا اگر مجھ سے اکتا گئے ہو تو صاف صاف کہہ دو۔ میں ابھی اور اسی وقت تمہیں چھوڑ کر چلی جاؤں گی...."

"واہ.... واہ آپا واہ۔ الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے...." میں فوراً ہی ہنس دیا اور بات آئی گئی ہو گئی۔

☆☆☆

دن ہفتوں میں اور ہفتے مہینوں میں گزرتے چلے گئے۔ اللہ کے فضل و کرم سے پاکستان معرض وجود میں آگیا۔ میں نے مہاجرین کے لئے کیمپ لگوادیئے ان کی ہر قسم کی ضروریات کا خیال رکھا اور جو کچھ میرے امکان میں تھا میں کرتا رہا۔ اس جدو جہد میں ناگن بہن اور میرے خاندان کے نوجوان میرے شانہ بشانہ رہے تھے۔

سدرہ اس وجہ سے میرا ساتھ نہ دے سکی کہ اس کی کوکھ میں میرا بچہ پروان چڑھ رہا تھا۔ بالآخر بائیس نومبر سن اڑتالیس میں میرے گھر میں وجیہہ الدین نے جنم لیا۔

خوب شادیانے بجائے گئے۔ خیراتیں کی گئیں صدقات دیئے گئے۔ چھے روز تک میرے باغ میں لنگر عام جاری رہا۔ ناگن بہن بہت خوش تھیں۔ شب و روز وجیہ الدین کی دیکھ بھال میں مصروف رہیں۔ اکیسویں روز وجیہہ کی ختنہ ہوئی اور اسی روز ناگن بہن نے ناگ منی اگلی۔

ناگ منی کی چکاچوند کو محفوظ رکھنے کے لئے میں نے اسے چمڑے میں محفوظ کروا کر اپنے بیٹے کے گلے میں ڈال دیا اور پھر چالیسویں دن شیش ناگ نورالدین کا روپ دھار کر رشتہ مانگنے پہنچ گیا۔ انکار کے تمام راستے مسدود پا کر ناگن بہن نے سر تسلیم خم کرتے ہوئے کہا۔

"میں رضامند اس لئے نہیں ہوئی کہ مجھے شادی کا شوق ہے، یا تم سے اور بھابھی سے الگ ہونا چاہتی ہوں۔

بلکہ میرے اقرار کی وجہ محض یہ ہے کہ میں تمہیں پریشان نہیں دیکھ سکتی۔ نہ جانے کیسے کیسے شکتی مان سپیرے یا جوگی پاکستان میں پہنچ چکے ہوں۔ آخر تم کب تک ان سے لڑتے رہو گے۔ میں پاتال کی تھی، پاتال ہی میں رہنا میرے اور تمہارے لئے بہتر ہے۔

میں آتی رہوں گی ویرا اب تو تمہارے بیٹے میں میری جان اٹکی رہے گی پتہ نہیں میں.... میں کب تک زندہ رہوں...."

دس جنوری سن اڑتالیس کی ایک مبارک گھڑی میں ناگن بہن کا نکاح انسانی رسم و رواج کے مطابق ہو گیا۔ لوگوں نے مجھ سے کہا کہ میں نے اپنی بڑی بہن کو جہیز کیوں نہیں دیا۔ میری یہ مشکل میرے بہنوئی نورالدین نے حل کر دی۔

"معزز لوگو۔ وصی الدین نے جہیز میں مجھے وہ کچھ دے دیا ہے جس کی سرزمین پنجاب میں مثال نہیں مل سکے گی۔ اگر آپ لوگ میری محل نما حویلی دیکھیں گے تو آپ کی آنکھیں چکاچوند ہو جائیں گی....."

آہوں، آنسوؤں اور سسکیوں کے ساتھ ناگن بہن کو میں نے رخصت کر دیا۔ مجھے یہ قطعی علم نہیں ہے کہ شیش ناگ یا ناگن کی عمر کتنی ہوتی ہے۔ صرف اتنا ہی میرے ایمان کا ایک جز ہے کہ کل نفس ذائقۃ الموت۔

پندرہ برس کے عرصے میں مجھے اللہ تعالیٰ نے سدرہ کے بطن سے چار بیٹے اور دو بیٹیاں عطا کیں اور میرے ان بچوں کو ہوش پکڑنے تک ناگن بہن ہی گود کھلاتی رہی تھیں۔ وہ نورالدین کے ساتھ کئی روز میرے ہی گھر میں رکی رہتی تھیں۔

نوٹ:

چند ناگزیر حالات کے باعث مندرجہ بالا واقعات جو ساتویں قسط پر مشتمل تھے، ماہنامہ ڈر ڈائجسٹ کے صفحات کی زینت نہ بن سکے۔ اس کا بہترین حل یہی تھا کہ ملک کے ابھرتے ہوئے ماہنامہ ڈر ڈائجسٹ کے اس مقبول سلسلے کو کتابی صورت میں آپ تک پہنچانے کا مقصد صرف اتنا ہے کہ ماہنامہ ڈار ڈائجسٹ کے مستقل خریداروں کی تشنگی دور کر دی جائے، نئے قارئین کو حرف اول سے حرف آخر تک آتشی مخلوق سے لطف اندوز ہونے کا موقع فراہم کیا جائے اور ماہنامہ ڈر ڈائجسٹ کے پڑھنے والوں میں اضافہ ہو سکے۔

آپ نے آتشی مخلوق پڑھی۔ اچھی لگی؟ بری لگی؟ دونوں صورتوں میں اپنی گراں قدر رائے سے ادارے کو ضرور مطلع کیجئے گا۔

بارہ تجسّس انگیز و پُراسرار ناول

پراسرار راج محل | آسیبی مخلوق

شمریکا | روح کی سرگزشت

بھیڑیا | ڈریکولا

موسیٰ و فرعون | پری خانہ

ہمزاد | اصغر علی بروجردی

دشت دل | نیل کی ساحرہ



ناول ملکیت و بشکریہ

محمد سعید چوھدری

ناول

سکین

بائے

محمد سجاد بھٹی

0
3
0
4
5
5
0
3
0
8
6

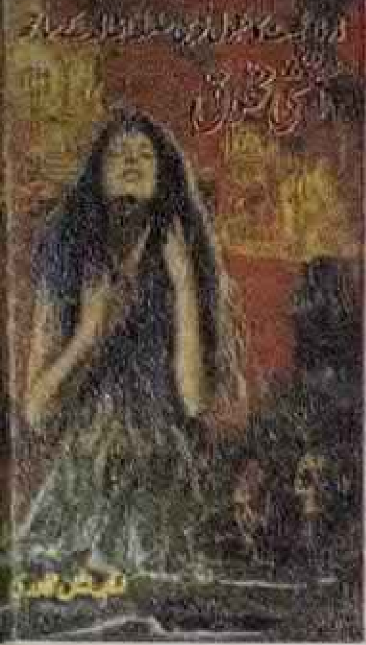
خصوصی تعاون: جاسوسی نشست ایڈمن



ڈاکٹر حامد حسن، ممتاز علی کیانی، عقیل قریشی

محمد سجاد بھٹی، سیف الملوک عباسی، یاسر حسنین

ساگر زمان، ناصر محمود بلوچ

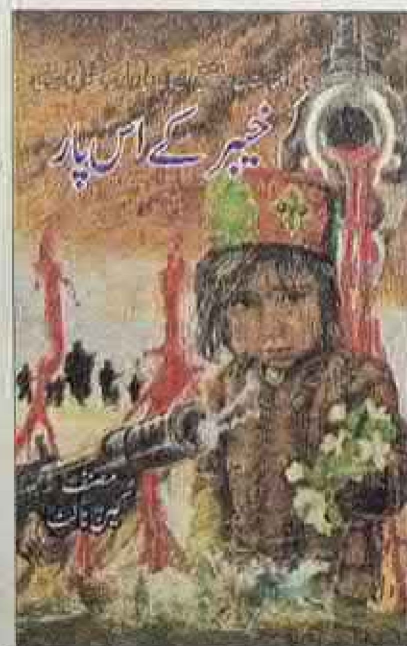


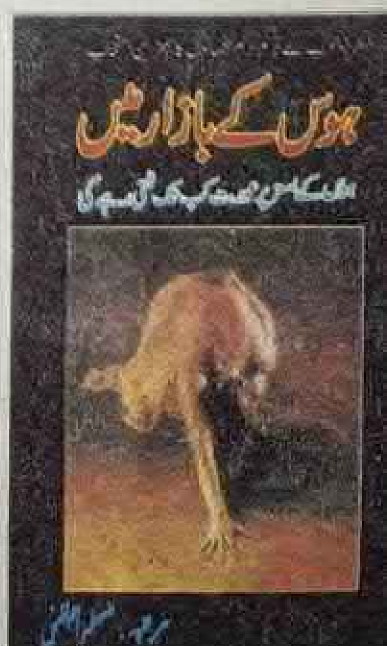






پری خانہ



خیبر کے اس پار


ہوس کے بازار میں